سلسلۂ

مسیحی کُتبِ دینیات

۹



# مسیحی طریقِ حیات

ولیم لِلی

سلسلہ مسیحی کتبِ دینیات نمبر ۹

# مسیحی طریقِ حیات

یعنی

# مسیحی اخلاقیات

مصنف

پادری ولیم پلی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ڈی۔ ڈی۔ ڈی

مترجم

سموئیل ڈی۔ چند۔ بی اے۔ بی۔ ڈی

اُردو ٹیکسٹ بک کمیٹی گوجرانوالہ تھیولاجیکل سمینری

بار اوّل　　مئی ۱۹۷۰ء　　تعداد ۱۰۰۰

# تعارف

"مسیحی طریقِ حیات" ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جسے ڈاکٹر ولیم لِلی نے خاص کر سلسلۂ مسیحی کتب دینیات کے لئے لکھا۔ ڈاکٹر ولیم لِلی ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۷ء تک پاکستان میں مشنری کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے اور وہ مرے کالج سیالکوٹ کے ہر دلعزیز استاد اور پرنسپل تھے۔

ڈاکٹر ولیم لِلی ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے اور پہلی جنگ عظیم کے دوران رائل گریسن آرٹلری میں کام کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایبرڈین یونیورسٹی سے ذہنی فلسفہ کا کورس درجہ اول (آنرز) میں پاس کیا۔ اور ایک سال بعد لندن یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے ڈپلوما آف ایجوکیشن حاصل کیا۔ اُسی سال وہ پنجاب آئے اور تدریسِ فلسفہ میں اپنا نام پیدا کیا۔ ۱۹۳۱ء میں خادم الدین ہونے کے لئے اُن کی مخصوصیت ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں گلاسگو یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے بی۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی دونوں آنکھوں کے آپریشن کے باعث ۱۹۴۷ء میں انہیں پنجاب میں اپنی خدمت سے ریٹائر ہونا پڑا۔ لیکن سکاٹ لینڈ میں انہوں نے پہلے تو ایک دیہاتی علاقہ میں پاسبان اور بعد ازاں ایبرڈین یونیورسٹی میں مطالعۂ بائبل کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے اپنی خدمت کو جاری رکھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایبرڈین یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ گذشتہ سال ۷۰ سال کی عمر میں انہیں کلیسیائے سکاٹ لینڈ کی ایبرڈین پریسبٹری کا ماڈریٹر مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر لِلی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ خاص کر اخلاقیات اور مسیحی اخلاقیات پر ان کی تصنیفات قابلِ تحسین ہیں۔ ان کی کتابوں کے انگریزی موضوعات ایک دوسرے صفحہ پر مندرج ہیں۔ مزید برآں انہوں نے اردو میں دو کتابچے لکھے ایک تو "عشائے ربانی کی حقیقت" جو کہ اب بھی سیالکوٹ چرچ کونسل میں عشائے ربانی

میں شریک ہونے والوں کی تیاری کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اور دوسری انہوں نے عبرانیوں کے خط پر تفسیر لکھی ہے۔ انہوں نے رسوم نامہ میں ایک جنتری بھی تیار کی ہے۔ تاہم یہ کتاب اردو میں اُن کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اور اردو ٹیکسٹ بک کمیٹی کے لئے اس کتاب کی اشاعت باعث فخر ہے۔

بعض قارئین یہ محسوس کریں گے کہ اس کتاب میں چند ایک زیرِ بحث مسائل کا پاکستان کے حالات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ یاد رکھا جائے کہ جو کچھ اب بے تعلق سمجھا جاتا ہے۔ وہ آئندہ دس پندرہ سال میں ملکی صنعت و حرفت کی نمایاں ترقی اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے متعدد خیالات کی نشر و اشاعت سے با تعلق اور موزوں معلوم ہوگا۔ اور ہم مسیحیوں کو تو اس لئے تیار رہنا چاہیئے۔

کافی حد تک یہ کتاب مسٹر سیموئیل ڈی۔ چند کی بھی مرہونِ منت ہے جنہوں نے نہ صرف اس کا ترجمہ کیا بلکہ کتابت کو پڑھنے کا کام بھی سرانجام دیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے مشکل الفاظ اور خاص اصطلاحات کی تشریح و توضیح بھی کی اور میرے لکھے ہوئے امدادی سوالات کا ترجمہ بھی کیا۔

میری یہ دلی دُعا ہے کہ یہ کتاب مسیحیوں کے ایمان اور مسیحی زندگی کے آپس میں تعلقات کے لئے ممد و معاون ثابت ہو۔ اور یوں نہایت احسن طریقہ سے حقیقی طور پر مسیح کی مانند زندگی بسر کریں۔

گوجرانوالہ - اپریل ۷۰ء

ایڈیٹر
ولیم۔ جی ینگ

ولیم للی

# THE CHRISTIAN WAY OF LIFE

An Introduction to Christian Ethics

by

REV. WILLIAM LILLIE, D. D.

**AUTHOR OF**

| | | |
|---|---|---|
| An Introduction to Ethics | ... | 1948 |
| The Law of Christ | ... | 1956 |
| Studies in New Testament Ethics | ... | 1961 |
| Jesus - Then and Now | ... | 1964 |

Published by :
The Urdu Text-book Committee of Gujranwala Theological Seminary
(Rev. William G. Young, Secretary) and Printed by Islah Electric Press
Circular Road, - Gujranwala.

The Publication of this book has been aided by a grant from the Theological Education Fund of the World Council of Churches.



# فہرست مضامین

# حصّہ اوّل

## اخلاقی راہنمائی کے مواخذ

پہلا باب

# قانونِ قدرت

## ۱۔ نیکی اور بدی سے متعلق مشترک خیالات

ابتدائے تاریخ سے ہی بنی نوعِ اِنسان نے نیکی اور بدی میں کسی حد تک تمیز کرنا سیکھا ہے۔ وہ مجموعی طور پر اِس پر متفق ہیں کہ کونسے کام اچھے ہیں اور کونسے بُرے۔ مثلاً ہندو، مسلمان اہلِ بُدھ مت اور مسیحی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قتل، چوری، زناکاری ناراستی کے کام ہیں اور والدین کی تابعداری اور حاجتمندوں کی مدد کرنا راست ہے۔ گو یقینی طور پر ان کی تشریحات میں اختلاف رائے تو ضرور ہوگا۔ کہ آیا قتل میں سب قسم کی جان کشی شامل ہے یا شادی میں وفاداری یکساں طور پر مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔ سی۔ ایس لوئیس نے اسکو اس طرح بیان کیا ہے "ایک ایسے ملک کے بارے میں خیال کریں۔ جہاں جنگ سے بھاگنا قابلِ تحسین سمجھا گیا ہو۔ یا جہاں کوئی شخص اُن لوگوں کو فریب دینے میں فخر محسوس کرے جنہوں نے اُس کے ساتھ رحمدلی کا ثبوت دیا ہو۔ بعینہٖ آپ بھی کسی ایسے ملک کو تصوّر میں لا سکتے ہیں۔ جہاں دو اور دو پانچ بنتے ہوں۔ لوگوں کا اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کونسے لوگوں سے آپ کو خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے، خواہ وُہ آپ کا خاندان ہو۔ خواہ آپ



کا ہم ملک خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ اپنے آپ کو پہلا درجہ نہ دیں۔ چنانچہ خودغرضی ایک ایسا فعل ہے۔ جس کی کبھی بھی تعریف نہیں کی گئی۔ لوگوں کے اس سے متعلق بھی مختلف نظریات ہیں۔ آیا کہ آپ کو ایک یا چار بیویاں رکھنی چاہئیں۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ اِس پر اتفاق کیا ہے کہ اپنی بیوی کے عِلاوہ کوئی عورت خواہ آپ کو کتنی ہی پسند کیوں نہ ہو، نہیں رکھنی چاہیئے۔ مقدّس پولس جانتا تھا کہ عہدِ عتیق میں مُوسوی شریعت کے دیئے جانے سے بیشتر لوگوں کو اپنے کردار میں راہنمائی کے لئے یہ ماخذ حاصل تھا۔ "اِس لئے کہ جب وُہ قومیں جو شریعت نہیں رکھتیں۔ اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں تو باوجود شریعت نہ رکھنے کے وُہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وُہ شریعت کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں۔ انکا دل بھی اِن باتوں کی گواہی دیتا ہے" (رومیوں ۲: ۱۴-۱۵)۔ راہنمائی کے اِس ماخذ کو قدرتی قانون یا قانونِ قدرت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور ہم اس کی یوں تعریف کرسکتے ہیں کہ "کردار کا وُہ عالمگیر معیار جو اخلاقی لحاظ سے سب پر عائد ہوتا ہے اور براہِ راست قابلِ شناخت ہے قانونِ قدرت کہلاتا ہے۔"

سی۔ ایس لوئیس اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ شائستہ کردار کا وُہ تصوّر جو سب پر عیاں ہے قانونِ قدرت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہمارے روزمرّہ کے انسانی تجربہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اُن کے مشاہدہ میں عموماً وُہ کام جن سے دُکھ اور مصیبت پیدا ہوتی ہے بُرے کام کہلاتے ہیں۔ اور وُہ کام جن سے خوشی اور تسکین ملتی ہے اُن کو دُرست کام کہا جاتا ہے۔ بعض اِس قانون کو تخلیقِ اِدراک کے

نام سے پکارتے ہیں۔ خواہ یونانی ستوئکیوں کی طرح ادراک کو کائنات میں ہر جگہ حاضر و ناظر تصور کریں یا اُن کے خیال کے مطابق یہ انسانی ذہن کی ملکیّتِ خاص ہے۔ دوسروں کا اندازِ فکر یہ ہے کہ بہرکیف انسان نے اپنے مختلف ممالک اور تہذیبوں کے لئے مختلف قوانین بنائے ہیں۔ لیکن خدا نے اِس قانون کو ہر ذی عقل اِنسان کے ذہن میں نقش کیا ہے اور یہ خدا کی محبت کے تخلیقی کام کا ایک حصّہ ہے۔ غالباً عام طور پر مسیحیوں کا قانونِ قدرت کے متعلق یہی نظریہ ہے۔

## ۲۔ قانونِ قدرت کی خصوصیات

رومی عالم اور مقرر سِسَیرو جس نے یونانی ستوئکیوں سے بہت کچھ سیکھا قانونِ قدرت کے متعلق چند باتیں لکھیں جنہیں عہدِ جدید کے دَور کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں نے قبول کیا۔ اِس کے نزدیک "قانون ایک ایسی شے نہیں جو رُوم میں تو کچھ ہے۔ اور ایتھنے میں کچھ اور ہے بلکہ یہ ابدی اور لاتبدیل ہے یہ خدا کی مطلق العنان صفت اور حکم کا ظہور ہے۔ لوگ اور قانون ساز مجلس بھی اِس کی پابندیوں سے ہمیں آزاد کرنے میں قاصر ہیں اور کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی تشریح و توضیح کے لئے ہم اپنے باہر جھانکیں کیونکہ حقیقی قانون قدرت کے ساتھ درست ادراک کی مطابقت میں ہے جس کا اطلاق عالمگیر سطح پر ہے اور ابدی اور لاتبدیل ہے۔ یہ اپنے مطالبات سے فرض کو پورا کرنے کے لئے بلاتا اور اپنے اصول ممانعت سے غلط کام کرنے سے روکتا ہے۔"

سِسَیرو نے قانونِ قدرت سے متعلق چند باتیں بیان کی ہیں۔ جن سے ہم پُورے طور پر تو نہیں لیکن کسی حد تک متفق ہیں۔

(ا) یہ عالمگیر ہے اور تمام آدمیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جب ہم یہ تسلیم کریں کہ کوئی ایسا قانون ہے تو یہ بعید از قیاس ہے کہ



لوگوں کو اس کا کبھی موزوں علم ہوا ہو۔ اور جب کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اخلاقی معاملات پر عموماً متفق ہوتے ہیں۔ لیکن خصوصی مسائل پر بہت زیادہ اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ جن کے لئے ان کو راہنمائی کی حقیقی ضرورت ہے۔ بعض لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک آدمی کئی بیویوں کو رکھنے میں حق بجانب ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے لئے عہدِ عتیق کے بزرگوں نے عملی طور پر نمایاں حصّہ ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ایک آدمی چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ لیکن دوسری طرف مسیحیوں کا یہ ایمان ہے کہ شادی ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تاحیات قائم رہنے والا رشتہ ہے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ قانون کی نسبت ہمیں اور زیادہ راہنمائی کی ضرورت ہے۔

(ب) یہ ایک ایسا انسانی قانون ہے۔ جس کا انسانی ادراک کو علم ہے۔

یہ کسی حد تک سچ ہے کہ ہم یقیناً اپنی قوت ادراک سے نیکی اور بدی میں تمیز کرتے ہیں۔ ہم مسیحی تاہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان ایک گری ہوئی مخلوق ہے اور انسانی گناہ کے اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی قوتِ ادراک بھی ناقص ہو چکی ہے۔ اِسی لئے تو کتاب مقدس میں انسان کے دِل کے فریب کا ذکر آیا ہے۔ (یرمیاہ ۷: ۹)۔ عبرانیوں کے خیال کے مطابق دل ادراک کا مقام ہے۔ رومن کا تھولیک ماہرین علم الٰہیات یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اِنسان کی باقیماندہ فطرت تو گناہ سے بگڑ چکی ہے لیکن اس کی عقلی صلاحیتیں بالکل محفوظ رہی ہیں۔ دورِ حاضرہ کے ماہرین نفسیات نے یہ ثابت کیا ہے کہ قطعی طور پر ایسا نہیں بلکہ گناہ کی یہ خاصیت ہے کہ انسان اپنے غلط کاموں کے لئے عقلی تشریحات ڈھونڈتا اور اسے مل بھی جاتی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان میں سے کچھ نہ کچھ غلط بھی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی ذہن کا ایک قدیم فریب ہے۔ یہاں تک کہ راستبازابراہام نے بھی

اپنی بیوی کے رشتہ کو ظاہر کرنے کے لئے مدلّل بہانے ڈھونڈے تاکہ وہ خطرے سے بچ جائے (پیدائش ۲۰: ۱۱-۱۲)۔

(ج) یہ ایک ایسا قانون ہے جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے اور یہ اسکے حکم کا اظہار اور اس کی مطلق العنان شخصیت کا حامل ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مسیحی بھی متفق ہوں گے اور داقعی خدا کے حکم کی تعریف کے لئے تشریح بھی پیش کریں گے۔ خدا نے اپنی الہٰی محبت کے اظہار کے لئے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ اور اس محبت کو نہ صرف مادی کائنات کی ترتیب میں دیکھا جاتا ہے۔ جہاں "خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے" (پیدائش ۱: ۳۱)۔ بلکہ اخلاقی ضابطہ میں اس کی محبت کا ظہور نمایاں ہے۔ کار تخلیق میں خدا کی پرمحبت کارکردگی کا ایک حصّہ ہے کہ انسان نے یا تو ابتدا سے ہی معلوم کر لیا یا جلد ہی اُس نے تجربہ سے سیکھ لیا کہ کچھ ایسے کام ہیں جو بُرے ہیں۔ چنانچہ ایسے کاموں سے گریز کرنا چاہیئے اور ہمیں اچھے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(د) یہ قانونِ قدرت سے ہم آہنگ ہے۔

گو قانونِ قدرت کی یہ بنیادی خوبی ہے کہ وہ قدرت سے ہم آہنگ ہے۔ تاہم اِس کے متعلق بہت سا اختلاف ہے۔

## ۳- قانونِ قدرت قدرتی کیوں ہے؟

جب سینیر دیہ پیش کرتا ہے کہ قانونِ قدرت سے ہم آہنگ ہے تو غالباً اُس وقت اُسکے ذہن میں ستوئیکیوں کا نظریہ تھا کہ تمام کائنات (یعنی تمام قدرت) کی تشکیل ادراک سے ہے۔ چنانچہ اخلاقی قانون کو محض معقول اور مدلّل کہنے کے قدرتی کہنا کہیں بہتر ہے۔ آج کل مغربی ممالک میں اس سے متعلق کافی اختلاف ہے۔ جب کہ لوگ کئی طرح کے غلط قسم کے اخلاقی کردار کو درست ثابت



کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً مخلوط جنسی تعلقات یا شخصی انتقام کو محض فطری کہہ کر درست ٹھہراتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک فطری کردار مدلّل نہیں بلکہ جبلّی ہے۔ تاہم سمجھدار لوگ فطری کردار میں امتیاز کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ قابلِ درگذر ہے۔ اور وہ کردار جو خلاف فطرت ہے اُسے غلط ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح فلاسفر کانٹ نے فطری جرائم کا جو انسان کے طبعی رجحانات کے باعث معاشرہ کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور غیر فطری جرائم کا کیونکہ وہ فطری جبلّت اور حیوانی فطرت کے متضاد ہے ایک اختلاف پیش کیا ہے پولس رسول بھی غیر قوموں کی اخلاقی تنزلی کا ذکر کرتے ہوئے فرق بتاتا ہے "اِن کی عورتوں نے اپنے طبعی کام کو خلاف طبع کام سے بدل ڈالا۔ اسی طرح مرد بھی عورتوں سے طبعی کام چھوڑ کر آپس کی شہوت سے مست ہو گئے یعنی مردوں نے مردوں کے ساتھ روسیاہی کے کام کئے ..." (رومیوں ۱: ۲۶، ۲۷)۔ بہت سے مسیحی متفق ہیں کہ لونڈے باز خواہ جرم کے لحاظ سے بُرا یا ذہنی مریض ہو وہ اُن کاموں میں مشغول ہے جو کہ فی نفسہ حد سے زیادہ غلط ہیں، بہ نسبت ایک زناکار کے جنسی عمل سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ وہ فطرت کے خلاف ہے۔

ہمارا خداوند خود مرد اور عورت کے درمیان شادی کے تاحیات رشتہ سے متعلق تعلیم کے ثبوت میں قانون قدرت اور موسوی شریعت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے۔ ہمیں مشکل معلوم ہوتا ہے کہ تاحیات ایک بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنا لازمی طور پر اس حقیقت کا مدلّل نتیجہ ہے "خلقت کے شروع سے اُنہیں مرد اور عورت بنایا" (مرقس ۱۰: ۶)۔ ہمارے خداوند کے اس بیان میں لازمی حقیقت عیاں ہے کہ خدا نے آدمی اور عورت کو اس شکل میں پیدا کیا تاکہ ایک مرد اور عورت کے درمیان تاحیات عقد ہی شادی کا قدرتی رشتہ ہو۔ یہ یقیناً وسیع ادراک کا ایک حصّہ ہے کہ مسیحی اس خیال کی حمایت کرتے ہیں کہ جنسی استعمال خاص کر شادی کے رشتہ میں

CS CamScanner

اگر اس کے حقیقی مقصد سے فرق ہو تو یہ بُرا ہو گا کیونکہ یہ غیر طبعی ہے۔
ہمارے خداوند نے اپنی کامل فہم و ادراک سے طلاق کو غیر فطری قرار دیا
ہے اور چند ایک لوگوں نے واضح طور پر اس حقیقت کو بعینہٖ اُس کی
مانند سمجھا ہے "ابتدا سے ایسا نہ تھا" (متی ۱۹: ۸)۔ اُن بہت سی اخلاقی
صورتوں کی پیچیدگیوں اور غیر واضح حقائق کو خاص کر جو جنسیات اور شادی
سے متعلق ہیں فراموش کرنا درست نہ ہو گا۔ کیونکہ عہدِ جدید کی تعلیم بھی یہی
ہے کہ وہ کام جو قدرت کے خلاف ہیں، غلط قرار دیئے جاتے ہیں۔

تاہم یہاں پر ایک حقیقی خطرہ بھی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے
محدود تجربہ میں اکثر مشاہدہ کیا ہے کہ ہمارے ماحول میں جو کچھ ہم کرتے
دیکھتے ہیں، اگر تو وہ قدرتی ہے تو لازمی امر ہے کہ وہ درست ہے۔ چونکہ
دنیا کے مختلف حصّوں میں عرصۂ دراز سے یہ رسم جاری ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے
کی خاطر مالی سمجھوتہ کے لئے کمیشن لیتا ہے اس لئے بہت سے مسیحی بھی ایسے
خفیہ کمیشن کی بددیانتی کو پہچاننے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے عہدِ جدید
میں بھی رسمی اور قدرتی حقائق کے درمیان ایک اُلجھن کی نمایاں مثال
ہے "کیا تم کو طبعی طور پر بھی معلوم نہیں کہ اگر مرد لمبے بال رکھے تو اس
کی بے حرمتی ہے؟ اور اگر عورت کے لمبے بال ہوں تو اس کی زینت
ہے۔" (۱کرنتھیوں ۱۱: ۱۴-۱۵) مقدس پُولس یہاں پر نہ صرف دوسرے
زمانوں کی وضع اور تہذیب کو فراموش کئے ہوئے ہے، بلکہ عہدِ عتیق کے
کے نذیریوں اور پنجاب کے سکھوں کی مانند جنہوں نے اصولاً اُسترے
کے استعمال سے انکار کر دیا ہے، رسول بھی مذہبی احساس قصور میں مبتلا
نظر آتا ہے۔ مقدس لوکس خود اپنی دلیل کی کمزوری سے باخبر تھا۔ کیونکہ اس
نے کسی طرح کے اعتراض کو سننے سے انکار کر دیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ دلیل
عقلی اصول کا ماحصل ہے نہ کہ کسی سبب اور وجہ کا (۱کرنتھیوں ۱۱: ۱۶)۔



دورِ حاضرہ کا انسان عام کردار کو اکثر درست کردار سمجھتا ہے۔ دنیاوی لوگ اس بات
کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شروع ہی سے انسان نے کسی نہ کسی چیز سے جوئے
بازی کی ہے۔ چنانچہ جوئے بازی میں کوئی برائی نہیں یا کلیسیائی حلقوں میں پولس
کے ہم خیال ہو کر کہتے ہیں کہ عورتوں کو گرجا گھر میں ٹوپی پہنے یا دوپٹہ اوڑھے
بغیر نہیں آنا چاہیئے۔ پولس نے مسیحیوں کیلئے ایک باقاعدہ اصول تجویز کیا ہے
کہ وہ اعلےٰ حکومتوں کے تابعدار رہیں" (رومیوں ۱۳: ۱) اس اصول کا حکومت
اور کلیسیا دونوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس کی فرمانبرداری اس
زمانے بلکہ ہر ایک زمانے کے مسیحیوں پر واجب ہے اور اس روح میں رہیں کہ
ابتدائی قانونِ قدرت کی تعمیل کر سکیں یہاں تک کہ اگر لوگ ان کو کافر لور یا قتل بھی
کہیں تو اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹیں۔

## ۴۔ ثانوی قانونِ قدرت

قانونِ قدرت کے روایتی تصور سے ایک اور وقت پیش آتی ہے کہ جیسا
کہ اعتقاد ہے کہ اگر انسان گناہ میں نہ گرتا تو قانونِ قدرت اپنی موجودہ صورت
سے بالکل مختلف ہوتا۔ انسان کے گرنے سے پیشتر جو تصویر ہم بائبل میں دیکھتے
ہیں۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ "آدم اور حوا اُس کی بیوی دونوں ننگے تھے
اور شرماتے نہ تھے (پیدائش ۲: ۲۵)۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ حالات
میں ہمارے لئے لباس کا استعمال خلافِ قدرت اور بُرا ہے۔ ہم عموماً نجی جائیداد
کی حفاظت کرنے اور جائز جنگ" کی شرائط ٹھہرانے سے متعلق عالمگیر قانون کو
جو تمام لوگوں میں مشترک ہے، تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم بنی نوع انسان کے لئے ایک
مثالی اور معیاری ملک میں غالباً نہ کوئی نجی جائیداد اور نہ ہی جنگ ہو گی۔ ایسے
اصول ثانوی قانونِ قدرت سے تعلق رکھتے ہیں جنکی یوں تشریح کی جا سکتی
ہے کہ خدا نے اپنے رحم سے اخلاقی اصول اختیار کئے جن پہ اس نے تمام

کائنات کو کلی طور پر اور انسانی معاشرہ کو جزوی طور پر تخلیق کیا تاکہ ان حالات کی ضرورت کو پورا کر سکے جس میں انسان اپنے آپ کو اپنی بگڑی ہوئی صورت میں پاتا ہے۔ تاہم ایسی تشریح سے مزید شکوک اور سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ خدا کے ابتدائی اخلاقی قوانین کو کہاں تک اختیار کیا جاتا ہے؟ مثال کے طور پر طلاق کے معاملہ میں موسیٰ نے کلیتہً قانونِ قدرت کی مخالفت نہ کی۔ بلکہ لوگوں کی سخت دلی کے باعث اس میں ترمیم ضرور کر دی (استثنا ۲۴: ۱-۴ مرقس ۱۰: ۵) اور ہمارے خداوند نے بھی حرامکاری کی بنا پر طلاق کی اجازت دے دی" (متی ۵: ۳۲، ۱۹: ۹)، لیکن یہ رعایت بھی انسانی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دی گئی ہے پولس رسول نے اس صورت میں شادی کی اجازت دی جب کہ ایک بے ایمان خاوند اپنی مسیحی بیوی کو طلاق دیتا ہے (۱-کرنتھیوں ۷: ۱۵) اور آج کل بھی مغربی ممالک کے بہت سے قوانین بنیادی طور پر مسیحی مکاشفہ پر مبنی ہونے کے باوجود اکثر حالات کے تحت طلاق کی اجازت دے دیتے ہیں جن کا کتاب مقدس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا یہاں پہ قانونِ قدرت سے کسی چیز کو نظر انداز کیا گیا ہے جو کہ موجودہ زمانے میں۔ اس معاملہ میں براہ راست عملی راہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے؟

بہ طرف دیگر عہدِ جدید میں شروع سے آخر تک قانون قدرت کو کاملیت تک پہنچانے کے لئے کوششیں ہیں۔ گو ہم یہ تسلیم کرتے ہیں پس و پیش کرتے ہیں کہ ابتدائی مسیحیوں نے ان کے متعلق اس انداز سے سوچا ہو۔ لیکن ایسی آرزو ہمیں اس کوشش میں ملتی ہے۔ جب کہ یروشلیم کی ابتدائی کلیسیا نے اپنے مال کو ایک جگہ رکھا۔ مسیح کے ان اقوال سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ مسیحی سو فیصدی امن پسندی کے حق میں تھے (متی ۵: ۲۹، ۲۶: ۵۲، یوحنا ۱۸: ۳۶) اور خاص کر اس امر میں کہ مسیح خداوند نے طلاق کو ممنوع قرار دیا۔ تاہم یہ عیاں ہے کہ ہمارے خداوند اور اس کے شاگردوں نے اپنی عام زندگی میں غلامی اور بدیشی حکومت کے قوانین کو جو آزادی پر پابندی لگاتے تھے، منظور نہ کیا۔ حالانکہ یہ ایسے امور تھے



تھے جن پر اگر وہ غور و خوض کرتے تو کبھی بھی ان کو پسند نہ کرتے۔ اسی طرح بیسویں صدی میں بھی مسیحیوں کو اشتراکی نظام کے تحت رہنا ہے گو وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کا ضابطۂ حیات بالکل غیر اخلاقی اور غیر مسیحی ہے۔ بعینہٖ امریکہ میں مسیحیوں کو سرمایہ داری کے نظام کے تحت رہنا ہوگا۔ جو کہ اشتراکی نعرۂ "ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دو" کی نسبت کم مسیحی اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر ایک ملک میں مسیحیوں کو ایسے ٹیکس دینے کے لیئے مجبور کیا جاتا ہے (اور بعض حالات میں فوجی خدمات سرانجام دینے کیلئے)، جن کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کو فروغ دیا جائے۔ گو مسیحی لوگ اسے پسند تو نہیں کرتے تاہم ملکی احکام کی تابعداری کرنا پڑتی ہے۔ ایک عام اصول کے طور پر مقدس پولس رسول کے نظریہ کے مطابق ہر ایک مسیحی کو اعلٰے حکومت کا تابعدار رہنا ہے (رومیوں)۔ چنانچہ ہر دور میں کلیسیا کا یہ فرض ہے کہ وہ ابتدائی قانون قدرت کی تعمیل کریں۔ خواہ لوگ اسے بدمتی ہی کیوں نہ کہیں۔ وہ دن دنیا اور کلیسیا کے لیئے کتنا بُرا ہوگا جب کوئی بھی امن پسند اشتمالی تجربات کے لئے کوشش کیلئے کوئی اصول پسند اور کسی صورت میں بھی طلاق کو مسترد کرنے کیلئے کوئی بھی کلیسیائی مدبرین نہ ہوں گے۔

## ۵۔ قانونِ قدرت اخلاقی راہنمائی کے ماخذ کی حیثیت سے

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ قانونِ قدرت کہاں تک ہمارا راہنما ہے؟ جواب ہے بہت کم جرمن ماہر علم الٰہی برونر اور دوسروں کا خیال ہے کہ "ہر آدمی کو اس کا حق ادا کرنے میں قانونِ قدرت کا اصلی مطلب پوشیدہ ہے دوسرے اس میں منفی اصول "کسی کو دکھ نہ دو" کا اضافہ کرتے ہیں یہ دونوں اصول فلسفہ دانوں کے مشترکہ عناصر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ہم نے دیکھا ہے۔ کہ نیکی اور بدی کے اکثر بدلتے ہوئے خیالات تمام مدلّل! انسانوں میں مشترک ہیں سکاٹ لینڈ کے ایک جج نے قانون قدرت میں اس کا اضافہ کر دیا وہ کہ یہ عام عملی اصول ہیں کہ خدا کی فرمانبرداری کی جائے۔

والدین کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ تشدد کو رد کیا جائے۔ بچوں کو پیار کرنا۔ ان کو تعلیم دلانا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے" ایک فرانسیسی قانون دان بیان کرتا ہے کہ ہر معاشرہ میں شادی، والدین کے اختیار، غلامی جائیداد، قتل، چوری اور معاہدوں کے قوانین اصولی طور پر یکساں نہیں ہیں۔ اب جب کہ مسیحی عموماً قانونِ قدرت کے عام قوانین کو تسلیم کرتا ہے۔ تو معاشرہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ قانون قدرت ایک اصول پیش کرتا ہے۔ کہ ہم اپنی حفاظت کریں، اور تشدد کو رد کریں۔ لیکن کم از کم یہ چند حالات میں ہمارے خداوند کے حکم کے مطابق نہیں۔ مثلاً "بدی کا مقابلہ نہ کرو" ہمارے مسیح خداوند کی تعلیم میں والدین کے اختیار کے لئے بھی ایک حد مقرر کی گئی ہے "جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں" (متی ۱۰: ۳۷) کچھ ایسے حالات بھی ہیں جہاں کہ ایک مسیحی کا فرض ہے۔ کہ وہ والدین کے اختیار کو بھی رد کر دے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہدِ جدید شاہد ہے کہ قانون قدرت غیر قوموں کی دنیا میں بھی موجود ہے اور قانونِ قدرت سے دلائل استعمال کر کے مخصوص نکات پر زور دینے کے لئے تیار ہے۔ مثلاً ہمارے خداوند کی تعلیم طلاق سے متعلق یا پولس کی بحث طلب تعلیم جو کہ آدمیوں کے بال کاٹنے سے متعلق ہے۔ لیکن یاد رہے۔ کہ قانونِ قدرت کو بائیبل کے اخلاقی تصور میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ مسیح خداوند کے ایام میں یہودیوں میں موسوی شریعت رائج تھی جو براہِ راست خدا کی طرف سے دی گئی تھی لیکن۔ مسیحیوں کے لئے شریعت یرمیاہ نبی کی پیشینگوئی میں مندرج ہے اور جس کا خدا نے حکم دیا حتیٰ کہ یہاں تک کہ وہ انسانوں کے دلوں پر بھی لکھی جائے گی۔ چنانچہ یہ شریعت ہمیشہ روح کو ترجیح دیتی ہے نہ کہ الفاظ کو مسیح خداوند نے مکمل طور پر خود اس کی وضاحت کر دی اور دعویٰ کیا کہ اس اختیار موسوی شریعت سے اعلیٰ ہے" (متی ۵: ۲۱-۴۸) کیونکہ اس کا مکاشفہ براہِ راست خدا کی طرف سے تھا در حقیقت یہ محض اسلئے



ہے کہ انسان نے اپنی گری ہوئی حالت میں اس کی یوں غلط تفسیر کی ہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ قانونِ قدرت کارِ تخلیق میں خدا کی طرف سے دیا گیا ہے تبھی ہم مسیحیوں کے اخلاقی تصور میں اس کو کوئی مقام حاصل ہے۔

---

دوسرا باب

# اِنسانی اَور الٰہی قانُون

## ۱- قانُون کیا ہے ؟

جیسے کہ انسان نے قانُونِ قُدرت کے متعلق سوچا ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی تخلیق ہے۔ بعینہٖ اس کا خیال ہے کہ اس کے مذہبی اور ملکی قوانین بھی خداداد ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال مندرج ہے کہ ہیموربی جو تقریباً ۱۷۰۰ ق۔م میں بابل پر حکمران تھا۔ اس کی طرف سے ایک ستون کی چوٹی پر قدیم ترین مجموعۂ قوانین کندہ کیا ہوا تھا جس میں یہ تصویر پیش کی گئی ہے کہ سورج دیوتا بابل کے بادشاہ کو یہ مجموعۂ قوانین دے رہا ہے کسی یہودی کو اس میں شک نہیں کہ اس کی شریعت کوہ سینا پر خدا کی طرف سے موسےٰ کو دی گئی اور ہر ایک مسلمان کا اعتقاد ہے کہ فقہ جس میں قرآنی شریعت کے فرائض مندرج ہیں وہ تمام تر حصّہ بہ حصّہ الہام کے ذریعہ سے دیئے گئے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قانون محض ایک حکم ہے جو اپنی تعمیل کیلئے دھمکی استعمال کرتا ہے۔ ایک بندوقچی اس شخص کو جو اس کے قبضہ میں آگیا ہو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنا بٹوہ نکال کر اس کے سپرد کردے اور دھمکی دیتا ہے کہ اگر اُس نے انکار کیا تو اُسے گولی سے مار دیا جائے گا۔ اسی طرح ہر ایک ملک میں اہلِ حکومت قانون کی وساطت سے اپنے ہم ملک شہریوں کو اگر وہ اسے (قانُون) ماننے سے انکار کردیں تو سزا کی دھمکی دیتے ہیں۔ بہت سے اہلِ فکر حضرات قانون کی اس بے ڈھب صورت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن یہ آسٹن کے نظریۂ قانون کے جو کہ کافی حد تک مسلّمہ ہے' ابتدائی مدارج ہیں۔ یہاں پر ہمارا تعلق اس بات سے ہے کہ بہت سے مسیحیوں اور بے دین لوگوں کا بھی خدا کی شریعت کے بارے میں یہی نظریہ ہے۔ بہُت سے مذہبی لوگوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خدا



کے احکام خُود مختارہ حیثیّت کے مالک ہیں۔ پہلی صدی عیسوی کے ایک بہُت بڑے یہُودی ربی نے کہا کہ ناپاکی سے مُتعلق مُوسوی شریعت کے قوانین پر محض اس لئے عمل کیا جاتا ہے کہ وہ خُدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول ہیں۔ ورنہ چیزیں بذاتہٖ ناپاک نہیں میں نے ایک اینگلو کاتولیک کو کہتے سُنا کہ جُمعہ کے دن گوشت کھانا صرف اس لئے منع ہے کیونکہ یہ کلیسیا کا حکم ہے۔

اگر ہم خدا کے احکام کی نافرمانی کریں تو وہ مختصر سوال وجواب کی کتاب کے ان الفاظ میں ایک آسمانی بندوقچی کی طرح دھمکی دیتا ہے "زندگی کی تمام لعنتیں' موت اور دوزخ کی ابدی تکلیفیں" ہمیں دی جائیں گی۔ چنانچہ ہم اس ناگوار بیان میں پوشیدہ حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ دس احکام اور ہمارے خداوند کا نیا حکم درحقیقت خدا کے احکام ہیں اور ان کی نافرمانی کرنا ہمارے لئے واجب نہیں۔

تاہم ایک اچھا شہری اپنے ملک کے قوانین کی فرمانبرداری کیلئے سزا کے متعلق اتنا نہیں سوچتا جو کہ قانون شکنی کے باعث دی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہم میں سے اکثر مُجرم کے اس ڈر سے جو اس کو سپاہی سے لاحق رہتا ہے' اس میں شریک نہیں ہوتے اور ہر چند کوئی تدبیر سوچتے ہیں کہ وہ عدالت میں قانون کی زد اور قید کی سزا سے بچ جائے اکثر ہم قوانین اور ذیلی قوانین کی اتنی سرگرمی سے تعمیل نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جبکہ قانون کی خلاف ورزی کے علم کا امکان بھی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم عموماً ایسے قوانین کو غیر ضروری اور بُرا خیال کرتے ہوئے ان کی پابندی نہیں کرتے۔ ہم میں سے اکثر ریل کی پٹڑی کو اس لئے عبُور کریں گے تاکہ اگلے پل تک اور زیادہ نہ چلنا پڑے' حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یوں ہم قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ملک کے اہم قوانین کی ارادتاً تعمیل نہیں کرتے۔ چنانچہ ان لوگوں کو قانون کی خلاف ورزی سے روکنے اور ان کے ہمسایوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے سزا ہی ایک ذریعہ ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کوئی مُؤثر طریقہ نہیں ہے لیکن ایک خاص قانون بھی بالکل غیر مُؤثر ہو کر رہ جائے گا۔ جب تک سزائیں نافذ نہ کی جائیں۔ اسی وجہ سے سکاٹ لینڈ میں سبت

کو ماننے سے متعلق قوانین بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گئے اور یہی حال پاکستان میں دکانداروں پر ان عائد کردہ ذیلی قوانین کا ہے جو اس غرض سے نافذ کئے جاتے ہیں کہ ان کو منع کیا جائے کہ وہ اپنی مصنوعات بازاروں میں نہ رکھیں تاکہ آمد و رفت میں دوسروں کے لئے رکاوٹ کا باعث نہ ہوں۔ دورِ حاضرہ کا انسان اکثر یہ سوچتا ہے کہ اس لحاظ سے تو خدا کی شریعت بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ مقدسین اور گنہگار ہر دو زندگی کی تکلیفوں سے دوچار ہوتے ہیں اور آخر کار دونوں کا انجام موت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دوزخ کی ابدی سزا کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ ہم اس سے یہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ انسان کیلئے خدا کے احکام کی تعمیل کیلئے سزا کی دھمکیاں بھی بہت کم مؤثر ہیں۔ بہ نسبت اس کے جب اس کو قوانین پر عمل کرنے کیلئے مجبور کیا جاتا ہے۔

کتابِ مقدس میں سزا کی دھمکی کا ایک معیّن مقام ایسی حقیقت ہے جس سے دورِ حاضرہ میں کسی قسم کی سزا کیلئے ہماری ناپسندیدگی کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عہدِ عتیق میں خدا کی شریعت کو ماننے کیلئے سزا کا خوف ایک حقیقی محرک نہیں ہے۔ خروج کی کتاب میں دس احکام ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ "خداوند تیرا خدا جو تجھے ملکِ مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔ میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تُو اپنے لئے تراشی ہوئی مُورت نہ بنانا۔" (خروج ۲۰ : ۲، ۳، ۴ ف) یہی سلسلہ باقی دس احکام میں بھی جاری رہتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان احکام کے تمہیدی جملے سزا کی دھمکی نہیں بلکہ ایک اعلان ہے کہ کس طرح خدا نے اپنے لوگوں کو مصر کی غلامی سے رہائی دلائی۔ بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عظیم مخلصی کیلئے شکر گزاری کے طور پر بنی اسرائیل کو ان احکام کی تعمیل کرنا تھی۔ استثناء کی کتاب میں بھی یہی بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ جہاں بزرگ موسیٰ کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے۔ کہ پہلے تو وہ خدا کے ان عجیب کاموں کا بیان کر رہا ہے جو اس نے اپنی برگزیدہ قوم کے لئے کئے اور پھر اپنے اسی بیان کو جاری رکھتے ہوئے بنی اسرائیل سے یوں مخاطب ہے۔ "سو تو خداوند اپنے خدا سے محبت رکھنا اور اس کی شرع اور آئین اور احکام اور فرمانوں



پر سدا عمل کرنا۔" (استثنا ۱۱ : ۱) یقیناً مُوسےٰ نے یہ بھی کہا کہ اگر انہوں نے خدا کی شریعت کی نافرمانی کی تو ان کو سزا دی جائے گی لیکن سزا کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ بنی اسرائیل کا اوّلین کام تھا کہ وہ خدا کی مہربانی کے لئے اس کی شکر گذاری کرتے اور اگر یہ بات عہدِ عتیق کے لئے درست ہے تو اس سے کہیں بڑھ کر عہدِ جدید کے لئے درست ہے۔ خدا کی شریعت کو ماننے کیلئے مسیحیت کا بنیادی مقصد خدا کی اُس محبّت کی شکر گذاری کرنا ہے جو اس نے مسیح یسوع میں ہمارے ساتھ کی۔ مسیحی زندگی میں بھی تربیت کیلئے سزا کی ضرورت ہے لیکن ایسی سزائیں بالکل ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

وہ لوگ جو قانون کو ایک دھمکی اور بندوقچی کی صورت میں پیش کرتے ہیں، ان کیلئے یہ مشکل ہے کہ انسداد چوری اور قتل کے قوانین کو تو اس صیغہ میں درج کر دیتے ہیں لیکن بعض ایسے قوانین ہیں جن کے لئے یہاں پر کوئی جگہ نہیں۔ وہ قوانین جو قانونی طور پر چیزوں کو خریدنے اور بیچنے یا اپنی جائیداد کو دوسروں کیلئے چھوڑنے یا شادی کرنے کی تشریح کرتے ہیں، قطعاً لوگوں پر سزا کی دھمکی سے حکم صادر نہیں کرتے کہ وہ لازمی طور پر کسی معاہدہ پر دستخط کریں یا اپنی جائیداد کسی کو ورثہ میں دیں یا کسی عورت سے شادی کریں لیکن یہ قوانین لوگوں کو وہ وسائل مہیا کرتے ہیں جن سے وہ اپنی خواہشات کو احسن طریقے سے اور بغیر کسی کی مداخلت کے سرانجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ قانون ایک بندوقچی کا حکم نہیں کہ وہ زبردستی کسی کام کیلئے جسے ہم نہیں چاہتے، مجبور کرے بلکہ ایک مہربان دھرم ماں کا تحفہ ہے جو ہمیں اپنے کاموں کو کامیابی سے نبھانے کیلئے قوّت دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل موسوی شریعت کی موجودگی میں بھی اپنی پڑوسی اقوام سے زیادہ آزاد طبع تھے۔ بیچارے نبودلے اس حقیقت کو محسوس کیا اور اسے اس سے دُکھ برداشت کرنا پڑا جبکہ اسرائیلی قانونی نظام کی بجائے فینکے کی مطلق العنان جابر حکومت رائج ہوگئی۔ قانون کا یہ مفید پہلو کسی حد تک پُولس کے اس امر کی تشریح کر سکتا ہے، کہ رُومی حکومت کے اختیار کی عزّت کی جائے

CS CamScanner

قانون کے اختیار کے باعث ہی مقدس پولس کو تمام رومی حکومت میں اپنے مشنری کام کیلئے آزادی تھی۔ آج کل بھی دنیا کے بہت سے حصوں میں ایسے قوانین نافذ ہیں جن سے مسیحی مبشروں کو بشارت کے کام کیلئے بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ لیکن بعض حصوں میں ایسے قوانین نہ ہونے سے مسیحی کام کیلئے بہت سی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ انسانی قانون کی یہ طاقت جو آزادی کی قدر و قیمت کو بڑھاتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ مسیح کی غلامی جو پوری آزادی ہے۔ قانون کی "کلیتہً" عدم موجودگی کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔

ہر ایک ملک میں انسدادِ چوری یا قتل کے بنیادی قوانین کے ساتھ ساتھ ثانوی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کچھ ایسے اصول بھی ہونے چاہئیں جو اس امر کی وضاحت کرتے ہوں کہ کس قسم کی جان کشی' اس قتل میں شمار ہوتی ہے جس کو چھٹے حکم اور بہت سے عدالتی قوانین میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کیا سزائے موت یا جنگ میں یا کسی بیمار کو اس کی جسمانی تکلیف کو کم کرنے کیلئے مار دینا قتل میں شامل ہے؟ یاد رہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت ثانوی قوانین کے ایک دوسرے مجموعہ کی ضرورت ہے مثلاً موٹر گاڑیوں کی ایجاد سے سڑک پر دوسروں کی جان کو خطرے سے بچانے کے لئے بہت سے اصولوں کی ضرورت پڑی ہے۔ کچھ ایسے قوانین بھی ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قتل کے مقدمہ کی سماعت کونسی عدالت میں ہونی چاہیئے' جہاں قتل کی تفتیش کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔

یہ تمام ثانوی اصول' قوانین کے ہر ایک مجموعہ کا لازمی حصہ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ایک قانونی ضابطہ بنیادی اور ثانوی قوانین کا مجموعہ ہے۔

یہاں پر یہ بیان کرنا بھی لازمی ہے کہ الٰہی اور ملکی قوانین ایک دوسرے سے متفرق ہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے خدا کے تمام قوانین بنیادی ہیں اور انہیں قانونی ضابطہ میں لانے کیلئے ثانوی قوانین کی چنداں ضرورت نہیں اور اگر کبھی ایسا قدم اٹھایا بھی جائے تو ایک حقیقی مذہب کیلئے اس کے تباہ کن نتائج ہوں گے۔ فریسیوں اور



ربیوں نے عہدِ عتیق میں خدا کی الہامی شریعت کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ متی ۲۳ باب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند کے اِن ثانوی قوانین کے متعلق اچھے تاثرات نہ تھے۔ بعد ازاں پولس نے بھی یہودیت کے تمام مجموعۂ قوانین کے خلاف قدم اٹھایا' اور بعض اوقات تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ روح کو تباہ کرنے والی غلامی ہے۔ یسوعی فرقہ کے زیرِ اثر رومن کاتھولک کلیسیا کی دلیل بازی اور خاص کر اُن کے علمِ غالبیّت کے ثانوی قوانین کا یہی حشر ہوا کیونکہ اِس کے تحت کلیسیا کے مستند علماء کی رائے کو قبول کرنا قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ایسے دستور جنم لینے لگے جو اِس امر کے شاہد تھے کہ علماء نے اپنے قانونی مجموعہ میں کسی بُرائی کو بھی حتی المقدور درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تمام مسیحی موسوی شریعت کے دس احکام اور پہاڑی وعظ کے الہامی اور بنیادی قوانین کی تعمیل کرنے کے لئے مسیح میں خدا کے مقروض ہیں اور ہم پولس کے ہم زبان ہو کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسیح کی شریعت ہے لیکن مسیحی خوشخبری میں شریعت پرستی اور علمِ غالبیّت کیلئے کوئی جگہ نہیں اور نہ ہی کلیسیائی عدالتوں کو جو سِول عدالتوں کے متوازی کام کرتی ہیں کوئی حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم اُٹھائیں۔

مسیحی قانونی ضابطہ میں اِس کی تردید کے لئے تین شرائط دی گئی ہیں:-

(ا) اگرچہ ہم مذہب میں ثانوی اصولوں کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں لیکن ہم اِس سے انکار نہیں کرتے کہ ملکی قوانین کے لئے یہ ثانوی اصول مفید اور ضروری نہیں کیونکہ ایسے ثانوی اصولوں کے بغیر ہر ایک مجموعۂ قوانین ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔

(ب) کلیسیا کو جماعتی طور پر اور کلیسیا کے افراد کو انفرادی طور پر اپنے ملک کے قانونی ضابطہ کے تحت زندگی بسر کرنا ہے بلکہ نہایت صاف دِلی سے اِن قوانین کو ماننا لازمی ہے۔ (یاد رہے کہ یہ پولس کے حکم کے متضاد نہیں کہ اُن کو اپنے جھگڑے سِول عدالتوں میں لے جانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ ۱۔ اکرنتھیوں ۶ : ۱-۸)

(ج) مسیحی کلیسیا کو بھی ایک انسانی ادارے کی حیثیت سے اپنے لئے کئی طرح کے ثانوی اصولوں کی ضرورت ہے مثلاً کلیسیائی مجلس کے کسی اجلاس کو چلانے کے لئے چند ایسے

اصولی ہوتے ہیں جو اِس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دورانِ اجلاس کسی شخص کا کیسا رویہ ہونا چاہیئے۔ اِس لحاظ سے یہ فٹ بال کی کسی کلب اور کسی تجارتی جماعت سے متفرق نہیں لیکن ہمیں تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ کلیسیاء کی اپنی سہولت کے لئے بنائے ہوئے قوانین کسی صورت میں بھی خدا کی شریعت نہیں بن جاتے ہیں۔

## ۲۔ خُدا کی شریعت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم خدا کی شریعت کو کہاں ڈھونڈ سکتے ہیں؟

اِس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے تو قانونِ قدرت میں جو گذشتہ باب کا مضمون تھا لیکن اِس سے ہم محدود ہیں کہ مفصل طور پر اخلاقی راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

دوسرے، بائبل میں جسے ہم خدا کا کلام کہہ کر پکارتے ہیں، خدا کی شریعت دی گئی ہے۔ اس کی پہلی پانچ کتابوں میں موسوی شریعت ہے جس کے متعلق ہمارے خداوند نے کہا کہ وہ اُسے منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہے۔ حال ہی میں ایک کتاب کے ضمنی عنوان میں سوال کیا گیا ہے "کیا ایک مسیحی کے لئے لازم ہے کہ وہ موسےٰ کی شریعت پر عمل کرے؟" اگر شریعت پر عمل کرنے سے یہ مراد ہے کہ اس کے ہر ایک تفصیلی اصول پر عمل کیا جائے، مثلاً خرگوش کا گوشت کھانے سے انکار کرنا یا اپنی بیوی کے مشتبہ چال چلن کے باعث اُس کو ہلاک کرنے والی شئے پلا دینا تاکہ وہ مرجائے، تو یقیناً اِس کا جواب نفی میں ہوگا۔ ہمارے خداوند کے ایام میں ایسی تابعداری کا مطالبہ تھا یعنی "ایسے بھاری بوجھ باندھنا جن کو اُٹھانا مشکل ہے اور لوگوں کے کندھوں پر رکھنا" کہتے ہوئے غالباً مسیح خداوند کے ذہن میں زبانی اور روایتی قوانین اور اُن کے ساتھ عہدِ عتیق میں مذکورہ اصول بھی شامل تھے لیکن اگر ہم موسوی شریعت سے یہ مراد لیں کہ یہ عہدِ عتیق کے وہ اہم اور بنیادی تقاضے ہیں جو مسیح میں پورے ہوگئے تو مذکورہ بالا سوال کا جواب 'مثبت' میں ہوگا۔ عبرانی انبیاء کے نظریہ کے مطابق اِن شرعی تقاضوں



کا جوہر، رحم، محبت اور خاکساری سے خدا کی تابعداری میں پوشیدہ ہے۔ یقیناً ایسے کام بھی ہیں جن کی پابندی ہر مسیحی کے لئے لازمی ہے اور بائبل کا ایک سنجیدہ طالب علم عہدِ عتیق کے غیر مستعمل قوانین میں سے خدا کی آواز کو سنتے ہوئے اُس کے انصاف اور رحم سے متعلقہ احکام پر عمل کرے گا جو اُس کی دینداراں زندگی میں اس کے راہنما ہوں گے۔ جیسے کہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ پولس رسول رومیوں اور گلیتیوں کے خطوط میں شریعت کو جھٹلاتا نہیں بلکہ اُس کو پاک، راست اور اچھی کہہ کر پکارتا ہے لیکن وہ قانونی ضابطہ کی غلامی اور موسوی شریعت کی پابندی کے نتائج یعنی ریاکاری اور غرور کو رد کرتا ہے۔

خدا کی شریعت کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ عہدِ جدید میں کلام کا وہ حصہ ہے جہاں پولس رسول مسیح کی شریعت کو پورے طور سے ظاہر کرتا ہے لیکن اِس کے متعلق نہ تو پہاڑی وعظ میں، نہ مسیح کے اور اقوال میں اور نہ ہی عہدِ جدید کے بہت سے خطوط میں اِس تعلیم کا ترتیب وار بیان ہے۔ ہماری کتاب کے اِس حصہ کا آخری اور اہم باب 'مسیح کی شریعت' کا ہوگا۔

اگرچہ سطحی نظر میں تو یہ کہنا نامناسب اور قدامت پسندانہ سا معلوم ہوگا کہ ہم اپنے ملک کے قوانین میں خدا کی شریعت کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن مقدس پولس رومیوں کے خط کے تیرھویں باب میں یوں وضاحت کرتا ہے کہ موجودہ حکومتیں خدا کی طرف سے قائم ہیں اور ملکی حاکم ہماری بھلائی کے لئے ہیں۔ اِس باب میں درحقیقت یہ تعلیم نہیں کہ ایک مسیحی کو کبھی بھی سیاسی بغاوت میں حصہ نہیں لینا چاہیئے یا اپنی ضمیر کے خلاف ملکی قوانین کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیئے، تاہم بہت سے مفسروں نے اسی طرح سے اس کی غلط تشریح کی ہے۔ دراصل اِس کا یہ مطلب ہے کہ ایک بدکار اور ظالم حکمران نیرو کے عہدِ حکومت میں بھی ملکی قوانین نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جن میں مسیحیوں کو خدا کی تابعداری کیلئے خاطر خواہ آزادی حاصل تھی۔ عملی طور پر رومی حکومت اور موجودہ دور میں ملکی قوانین سے ہمارے بہت سے اخلاقی مسائل کا حل مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں گلی میں کوڑا کرکٹ پھینک دوں تو یہ شہر کی بلدیہ کے ذیلی قوانین کے تحت ممنوع ہے۔

لیکن اگر اِسے اِخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو میں اپنے پڑوسی کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہُوئے یہ قدم اٹھاتا ہُوں یا پھر تجارتی کام میں اگر میں اعلےٰ قسم کے غلّہ میں گھٹیا قسم کا غلّہ مِلا کر فروخت کروں تو یہ بھی میری اِخلاقی گراوٹ کا ثبوُت ہے۔ ایسے اقدام سے نہ صرف مُلکی قانوُن کی زَد میں سَزا ہوگی بلکہ یہ خُداوند کے آٹھویں حُکم کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ گو مُلکی قوانین ہمارے مکمّل فرائض کو تو پیش نہیں کرتے لیکن اکثر وہ فرض کے اہم اور عملی حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایسی صُورت میں ہمیں احساس ہونا چاہیئے کہ خُدا ہم سے ہم کلام ہے۔

بعض اوقات ایسے امکانات بھی ہیں کہ خُدا ہم میں سے کسی کو براہِ راست حُکم دے، جس کی نہ تو کتاب مُقدّس، نہ قانونِ قدُرت اور نہ ہی مُلکی قانون کی روایات اور نہ ہی ہماری ضمیر تصدیق کر سکے بلکہ یہ ہم تک زِندہ خُدا کے کامل اختیار سے پہنچے۔ ممُکن ہے کہ ہمارے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش نہ آئے لیکن اگر کبھی ایسا ہو بھی تو ہر قیمت پر اس کی تابعداری کرنا ہمارا فرض ہے جیسے کہ پُولس کو دمشق کی راہ پر خُداوند کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی حالانکہ اس کے فریسی ساتھیوں کے لئے تو یہ حُکم بالکل بے معنی اور کُفر تھا۔

## ۳۔ خُدا کی شریعت شخصی حُکم کی حیثیت سے

اگر ان میں سے کسی ایک طریقہ سے ہمیں خُدا کی شریعت کا عِلم ہو تو ہمیں کبھی بھی یہ کوشش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اِس میں سے ایک قانوُنی نظام قائم کریں۔ ہم خُدا کی مرضی کو بائبل مقدّس سے منطقی نتائج اخذ کرنے یا لفظی تشریح سے نہیں بلکہ دِل کے منوّر ہونے سے معلُوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب ہم خُدا کا یہ حُکم پڑھتے ہیں "شریر کا مُقابلہ نہ کرو" تو ممُکن ہے کہ ہم مذہب اَمن پسندی کے اِخلاقاً دُرست ہونے اور سزائے موت کے مُتعلق دلائل پیش کرنے لگیں لیکن خُدا کا ہمارے ساتھ ہمکلام ہونے کا یہ طریقہ نہیں، مگر یہ اُس وقت ہوگا جب میرے ایک پڑوسی نے مجھے ایک کاروباری مُعاہدہ میں فریب دیا ہو اَور پھر مجھے معلُوم بھی ہو کہ میں کس طرح اُس سے اپنا نقصان پُورا کر سکتا ہُوں، تو اُس وقت یہ الفاظ "شریر کا مُقابلہ نہ کرو" حقیقتاً خُدا کے کلام کی صُورت میں مجھے غلط کام سے روکیں گے یا پھر خُدا کا یہ حکم کہ اگر کوئی ایک کوس بیگار میں پکڑے تو دو کوس چلے جانا چاہیئے، سطحی نظر میں تو بالکل غیر موزُوں سا معلُوم ہوگا کیونکہ دورِ حاضرہ میں کوئی شخص کسی کو بیگار کے لئے مجبُور نہیں کر سکتا لیکن دو کوس چلے جانا کا خیال ایسے حالات میں ہمارے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے مثلاً جب ہم سخاوت کے کسی کام کے لئے جو کچھ ہمیں دینا چاہیئے اُس سے ہچکچا رہے ہوں یا جب ہم اِس کشمکش میں ہوں کہ کسی کام کو نامکمل چھوڑ دیں کیونکہ جتنے کام کی ہمیں اُجرت دی گئی تھی وُہ پُورا ہو چکا ہے۔ چاہیئے کہ ہم خُدا کی شریعت کو شاعرانہ تصوّر سے نہ کہ ایک قانُون دان کے منطقیانہ دلائل سے جاننے کی کوشش کریں۔



خُدا کی شریعت کا بہ نسبت دوسرے قوانین کے انسان سے شخصی تعلق ہے۔ استثناء کی کتاب میں شریعت کے بیان کیلئے مُسلسل ایک جملہ اِستعمال کیا گیا ہے "خُداوند تمُہارا خُدا"۔ یہ الفاظ یاددہانی کے طور پر ہیں کہ خُدا کا ہمارے ساتھ ایک ذاتی رشتہ ہے جس سے ہم اُس کی شریعت کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ مُحبّت کے بغیر فرمانبرداری ایک ایسی قسم کی فرمانبرداری ہے جو اکثر لوگ مُلکی قوانین کیلئے دکھاتے ہیں حالانکہ حُب الوطنی کے بغیر تابعداری بالکل گھٹیا قسم کی تابعداری ہوگی۔ مقدّس اوگسطین نے اِس کو انتہا پسندی کی صُورت میں پیش کیا، جب اُس نے یہ کہا کہ "محبت رکھو اور جو چاہو کرو"۔ لیکن ایک خُود غرض شخص کیلئے یہ ایک خطرناک اصُول ہے کیونکہ اُس کی محبت ہمیشہ محدُود اور اُس کی خواہشیں ہمیشہ بگڑی ہوتی ہیں۔ بہتر تھا کہ مُقدّس اوگسطین اس کو یُوں پیش کرتا "وہ کام کرو جس کا خُدا حُکم دیتا ہے اَور اپنی محبّت سے ایسا کام کرنا پسند کرو"۔ ہم اَپنے اِنسانی تجربہ میں بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بچّے جو محض ڈر کی وجہ سے اپنے والدین کا حُکم مانتے ہیں، اُن کی تربیّت بُری طرح سے ہوتی ہے۔ اِسی طرح خُدا کے خاندان میں بھی کامل محبّت خوف کو دُور کر دیتی ہے۔ ایک شخصی تعلق کے تحت جب ایک باپ اپنے بیٹے سے بولتا ہے تو لفظ "قانُون" معرضِ وجُود میں آتا ہے لیکن جب خُدا ہمکلام ہوتے ہوئے کچھ کرنے کے لئے کہتا ہے تو وہاں اس کا اطلاق کچھ غیر موزُوں سا معلُوم ہوتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مُلکی قوانین کا مقصد، اِنسانی آزادی، حفاظت اور انسانی قابلیتوں کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو خُدا کی تمام شریعت میں ایک ایسا ہی اصُول نظر آتا ہے کہ اُس کی غُلامی پُوری آزادی ہے۔ مُوسوی شریعت میں سب سے زیادہ بوجھل قوانین سبّت سے مُتعلق ہیں، کیونکہ اس کو قانُونی نظام کی پیچیدگیوں میں اُلجھا دیا گیا تھا۔ بعض اوقات ہم خیال کرتے ہیں کہ جیسے مسیح خُداوند نے سبّت کے قانُون کو توڑا ہو لیکن اُس نے یہُودیوں کی خاطر کبھی بھی ایسا نہ کیا۔ بلکہ اُس نے سبّت کے قانُون کی حقیقت کو یُوں بیان کیا کہ یہ اِنسانی فلاح و بہبُود، اُس کی خُوشی اور آزادی کے لیے ہے " اور اُس نے اُن سے کہا سبّت آدمی کیلئے بنا ہے نہ آدمی سبت کیلئے، پس ابنِ آدم سبت کا بھی مالِک ہے۔" (مرقس ۲ : ۲۷ - ۲۸)۔ اگر ربیّوں کو بھی کبھی اِس بات کا احساس ہوتا تو وہ سبت کی پابندی کو شرعی قوانین کی غلامی نہ ٹھہراتے۔ تاہم مسیح خُداوند سے پیشتر کچھ یہُودی تھے جو عہدِ عتیق کو زبور ۱۱۹ کی روشنی میں خدا کی وہ شریعت تصوّر کرتے تھے جِس میں اُن کے لئے خُوشنُودی تھی۔ زبُور نویس کی یہ شادمانی ہم مسیحیوں کو شرمسار کرتی ہے کہ ہم مسیح کی شریعت یعنی اُس کے پہاڑی وعظ میں بہت کم خُوشنُودی حاصل کرتے ہیں۔ پہاڑی وعظ کے اخلاقی اصُولوں پر بحث و تمحیص کرتے ہوُئے اکثر ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کسی عورت کو بُری نِگاہ سے دیکھنا یا بین الاقوامی سطح پر کسی کا مُقابلہ نہ کرنا، ناممکن ہے۔ لیکن رُوح القُدّس کی عظیم آزادی میں ہمارے لئے یہ تمام ناممکنات، ممکنات بن جاتی ہیں اَور مسیح کی اِس شریعت کو پاکر ہماری خوُشی کی کوئی اِنتہا نہیں رہتی۔

## پُولس رسُول اَور شریعت

اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شریعت کے متعلق پُولس کے کچھ اچھے تاثرات نہ تھے لیکن یاد رہے کہ اُس کا یہ سرسری خیال تھا نہ کہ حقیقی طور پر وُہ عہدِ عتیق کی شریعت کا مُخالف تھا۔ ہمیں یہ بالکل فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ پُولس اکثر ایک مشرقی اُستاد کی



طرح مُتنقاضانہ زبان اِستعمال کرتا تھا اَور اُس نے خُود واضح طور کہہ دیا کہ "شریعت پاک، راست اَور اچھی ہے" (رُومیوں ۷ : ۱۲)

مُقدّس پُولس کا بنیادی اعتراض یہ نہ تھا کہ مُوسوی شریعت باطل ہے بلکہ یہ کہ وہ اِنسان کو نجات دینے سے معذُور ہے۔ اِسرائیل کی خُدا سے نافرمانی کی طویل تاریخ اَور اُس کے ذاتی تجربہ نے اُسے قائل کر دیا تھا کہ " شریعت کے اعمال سے کوئی بشر خُدا کے حضُور راستباز نہیں ٹھہر سکتا" (رُومیوں ۳ : ۲۰) پُولس رسُول اِس حقیقت کو اور وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ وہ نجات جو صِرف مسیح ہی دے سکتا ہے۔ اِس کا ایک پہلُو یہ ہے کہ یہ اخلاقی نجات ہے تاکہ " شریعت کا تقاضا ہم میں پُورا ہو جو جِسم کے مطابق نہیں بلکہ رُوح کے مُطابق چلتے ہیں" (رُومیوں ۸ : ۴)

پُولس رسُول خُدا کی شریعت جس کو وُہ مسیح کی شریعت کہہ کر پُکارتا ہے اَور یہُودیت کے قانُونی نظام میں امتیاز کرتا ہے۔ تاہم وہ اِس اِمتیاز کو بڑھاتا نہیں۔ یہ قانُونی نظام تھا جسے ہم شریعت پرستی کہہ کر پُکار سکتے ہیں جو یہُودیوں کے پُولس کو رُوحانی تباہی تک لے آیا۔ مقدّس پُولس جانتا تھا کہ ایسے نظام کو رُومی حکُومت میں کچھ مقام حاصل تھا اَور اُس کی خواہش تھی کہ اُس کے قارئین اِس کی قدر کریں (رُومیوں ۱۳ : ۱ - ۷) لیکن خُدا اور انسان کے درمیان ایسی شریعت پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پُولس رسُول جانتا تھا کہ ایک قانُون کے ساتھ مختلف اصُولوں کے اضافہ سے، اس کی تابعداری ایک قِسم کی غُلامی بن جاتی ہے مثلاً تحریری قوانین جو کہ بدلتے ہوُئے حالات کیلئے بالکل لاتعلقی کا اظہار کرتے اور رُوح کی آزادی کی مُخالفت کرتے ہیں اَور پھر غیر موزُوں قانُون وضع کرنا، لوگوں کو اُن کی نافرمانی کی ترغیب دلاتے ہیں (سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گملی ایل کے سکُول میں جہاں پُولس نے تعلیم پائی، کچھ ایسے اصُول تھے جن کی وُہ نافرمانی کرتے ہوُئے بھی اپنی انسانی آزادی کو برقرار رکھ سکتے تھے؟) یقیناً مُقدّس پُولس نے کسی طرح بھی خُدا کی شریعت کی مُخالفت نہ کی بلکہ اسے فریسیوں کی نِسبت مُوسوی شریعت کا گہرا تجربہ ہوُا۔

پولس رسول کی رائے کے مطابق موسوی شریعت، مسیحی ایمانداروں کیلئے تین اہم باتیں پیش کرتی ہے۔

(ا) شریعت لوگوں کو انجیل کی خوشخبری کیلئے تیار کرتی ہے۔ یہ "مسیح تک پہنچانے کیلئے ہماری اُستاد ہے" (گلتیوں ۳ : ۲۴) عہدِ عتیق کی شریعت نے لوگوں کو خدا کے متعلق اور اُس کے انسان پر اخلاقی تقاضوں کیلئے بتایا اور اُنہیں تیار کیا کہ جو کچھ خدا مسیح میں دیتا ہے اُسے سمجھ سکیں اور اُسے قبول کر سکیں۔

(ب) شریعت انسان کو قائل کرتی ہے کہ وہ گنہ گار ہے اور اُسے نجات دہندہ کی ضرورت ہے۔ پولس کی اپنی گواہی ہے کہ "بغیر شریعت کے میں گناہ کو نہ پہچانتا" (رومیوں ۷ : ۷)

(ج) شریعت اب بھی خدا کی راہوں میں انسان کی راہنما ہے۔ ایک یہودی شریعت رکھنے کے باعث "اندھوں کا راہنما اور اندھیرے میں پڑے ہوؤں کیلئے روشنی ہو سکتا ہے" (رومیوں ۲ : ۱۹) مسیحیوں کو اب بھی اپنی روزمرہ زندگی اور عمل میں راہنمائی کی ضرورت ہے اور موسوی شریعت ہماری راہنمائی کا ایک ماخذ ہے اسی لئے بہت سے گرجا گھروں کی دیواروں پر دس احکام کندہ ہیں۔

## ۵۔ شریعت اور سزا

انسانی قانون میں سزا ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور کتابِ مقدس کی تعلیم سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ خدا کی شریعت کی نافرمانی کیلئے بھی سزا کی ضرورت ہے۔ اکثر اوقات مسیحی مبشر جہنم کی سزا کیلئے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے بہت سے لوگ سزا کے تصور سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت ہو گا جب بائبل کی تمثیلی زبان کی لفظی تشریح کی جائے۔ ایسی زبان کے استعمال کا یہ مقصد ہے کہ ہمیں اُس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ ہم خدا کی شریعت کی سنجیدگی سے فرمانبرداری کریں۔ اگر خدا کے احکام میں سزا کیلئے اُس کا الٰہی اختیار نہ ہوتا



تو اُس کی وقعت بالکل ایک فرسودہ اور غیر مؤثر اخلاقی قول کی مانند ہو کر رہ جاتی۔ عبرانیوں کے خط میں اِس حقیقت کی اِن الفاظ میں تشریح کی گئی ہے "کیونکہ جس سے خداوند محبت رکھتا ہے اُسے تنبیہ بھی کرتا ہے اور جسے بیٹا بنا لیتا ہے اُس کے کوڑے بھی لگاتا ہے" (عبرانیوں ۱۲ : ۶) خدا کی طرف سے انسان پر عائد کردہ سزائیں ایک شفیق آسمانی باپ کی محبت کا ثبوت ہیں لیکن اکثر ہم اپنی لاعلمی کے باعث اُنہیں بہت کم سمجھتے ہیں تاہم سزا کی تعلیم اُس حقیقت کی تشریح کرتی ہے کہ کائنات جس کی اخلاقی اور مادی اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے اگر اِس کے قوانین کی خلاف ورزی کی جائے تو یقیناً تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے۔ بہ الفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کے قانونِ قدرت کی نافرمانی سے یہ نتائج ایک سزا کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ سی۔ ایچ ڈاڈ کہتا ہے کہ "خدا کا غضب اِس اخلاقی کائنات میں سبب اور انجام کا قدرتی عمل ہے۔" ایسی تشریح سے ایک خطرہ ہے کہ شاید ہم بھول جائیں کہ خدا کا ہم سے شخصی تعلق ہے نہ کہ وہ سبب اور انجام کے مکانکی اصولوں سے ہمارے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سزا سے متعلق کتابِ مقدس کا طرزِ بیان کافی حد تک عدالتی قوانین اور اِس کی کاروائیوں کی مانند معلوم ہو جیسے کہ یہودیوں نے موسوی شریعت کو قانونی نظام کا ایک حصہ بنا لیا تھا جس سے ہم بھی پولس رسول کی مانند چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ خواہ ہم اِس خیال کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں خواہ اِسے غلط سمجھیں لیکن کتاب مقدس کی تعلیم سے بالکل واضح ہے کہ خدا کی شریعت کی نافرمانی کے لیئے سزا لازمی ہے تاہم اِس نافرمانی اور سزا سے بچنے کے لیئے مسیح کی طرف سے دی ہوئی مخلصی ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔

---

تیسرا باب

# ضمیر اور رُوح القُدس کی راہنمائی

## ۱۔ ضمیر اور قانونِ قُدرت

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مسیحی بلکہ غیر مسیحی روایات، دونوں میں ضمیر کو ایک اِخلاقی راہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ مننڈیر نامی ایک مُلحد شخص نے کہا تھا کہ "ضمیر تمام فانیوں کا دیوتا ہے۔" اور ایک مسیحی شخص یونا وینتوُرا کے خیال کے مُطابق "ضمیر خُدا کا پیغام رساں اور نقیبِ شاہی ہے۔" کارڈینال نیومین اِس کی یُوں وضاحت کرتا ہے کہ "ضمیر مسیح کا اصلی نائب مُختار، پیغام دینے میں نبی، اپنے جبر میں مُطلق العنان فرمانروا اور اپنی برکات اور نعمتوں کے لحاظ سے کاہن ہے۔" نیومین کے خیال کے مُطابق ضمیر کے خلاف پوپ کے فیصلے کو بھی ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ اینگلکن بشپ بٹلر یہ خیال پیش کرتا ہے کہ اپنے مقام کے لحاظ سے ضمیر کو خُداداد انسانی ذہن کی تشکیل کے سبب قُدرتی اختیار حاصل ہے کیونکہ "یہ اپنی فطرت کے باعث دُوسرے سب اصُولوں پر اعلیٰ اختیار کا مُطالبہ کرتی ہے" "اور اگر اِس اِختیار کے ساتھ ساتھ اُس کے پاس قوّت و اِقتدار ہوتا تو یقیناً ساری دُنیا پر اِس کی حکُومت ہوتی۔" دورِ وکٹوریہ میں ضمیر کی آواز یہاں تک ذی اثر خیال تھا کہ اوسکر وائلڈ نے اپنے ایک ہونہار نوجوان شاگرد کو یہاں تک کہنے پر آمادہ کر دیا کہ "اِس دُنیا میں عورت کے لیئے دَبی ہُوئی ضمیر سے بڑھ کر کوئی نازیبا چیز نہیں۔"



حالانکہ مسیحیوں نے ضمیر کی وُقعت کو اِتنا بڑھا دیا ہے لیکن پھر بھی اُن کے نظریات ہمیشہ ایک دُوسرے سے مُختلف رہے ہیں کہ درحقیقت ضمیر ہے کیا؟ کاتولیک کلیسیا کی روائیت کے مُطابق تھوماس اکوئناس نے ضمیر کو یُوں بیان کیا ہے کہ "یہ اِنسانی ذہن ہے جو اِخلاقی فیصلے صَادر کرتا ہے" اَور جیسا کہ ہم دیکھ چُکے ہیں، اکوئناس نے یُونانی تعلیم کو قبُول کیا کہ بُنیادی طور پر یہ ادراک کا کام ہے اور اُس نے اس کے دو پہلُو دریافت کیئے۔ (۱) اَوّل، اصُولوں کا وجدانی ادراک جس سے اِخلاقی اِمتیاز کیا جاتا ہے۔ (۲) دوئم، پہلے اصُولوں کے عِلم کا مخصُوص اعمال پر اطلاق کرنا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اچھّے ہیں یا بُرے۔ جیسے کہ پہلے باب میں بیان کیا جا چُکا ہے۔ اکوئناس کافی حَد تک اِن اصُولوں کو قانُونِ قُدرت کے ہم پلّہ قرار دیتا ہے۔ درحقیقت قانُونِ قُدرت کی وضاحت کرتے ہُوئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ اُن اِخلاقی اصُولوں پر مُشتمل ہے جن کا براہ راست اِنسانی ضمیر کو علم ہے

مقدّس تھوماس کی دراصل یہ رائے ہے کہ لفظ "ضمیر" اِخلاقی ادراک کے مؤخرالذکر کام یعنی قانُونِ قُدرت کے عِلم کا مخصُوص اعمال پر اِطلاق کرنے کے لیئے محدود کر دینا چاہیئے۔ یہ ہماری وجدان بلا واسطہ کہ نیکی اور بدی کیا ہے کی نِسبت اِنسانی ادراک کا دُوسرے حلقوں کے تمام لوگوں کے تجربہ میں ایک معمُولی عمل ہے مثلاً وکیل کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے آیا کہ ایک خاص مُقدمہ اُس کے کسی مُلکی قانُون کے صیغہ میں شامل ہے اور ایک ڈاکٹر کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے آیا کہ ایک مریض کی خاص بیماری اُس کی طِبّی کِتابوں میں درج ہے یا نہیں۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسیحی کِتاب مُقدّس کی تعلیم یا کلیسیا کی اِخلاقی روایات کو قانُونِ قُدرت پر جس کا ضمیر کو عِلم ہے ترجیح دے تو پھر بھی اُسے عَام اصُولوں کا مخصُوص معاملات پر اِطلاق کرنا پڑتا ہے۔ اہلِ اِسلام بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلّمہ اصُولوں کا نئے حالات پر اِطلاق کرنا ضروری ہے۔ اِس عمل کو وہ قیاس

کے نام سے پُکارتے ہیں جیسا کہ ہم نے قانُونِ قُدرت کو سمجھا ہے"۔ یہاں پر بھی ہم تعصبات سے اُس گُمراہی کی طرف مائل نظر آتے ہیں جو گرے ہُوئے اِنسان کی ادراکی قُوتوں کو مُتاثر کرتی ہے۔ بہر کیف مجُھے شک ہے کہ آیا قیاسی ادراک کے اِس عمل سے جو اِخلاقیات میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ضمیر کے کبھی وُہ معنی اَخذ کیئے گئے ہوں جیسے کہ موجُودہ زمان میں معنے لیئے جاتے ہیں۔

ہم جو کچُھ پہلے باب میں بیان کر چُکے ہیں، اُس کے بعد یہ جاننا مُشکل ہے کہ مسیحیوں کو ضمیر کے فیصلہ کو اِنسانی ادراک کے ماحَصل کی حیثّیت سے کیا مقام دینا چاہیئے۔ یُونانی فلسفہ دانوں اَور کا تو لیک ماہرینِ علم الٰہیات کے خیال کے مُطابق ادراک جو اِنسانی گُناہ سے بُہت کم مُتاثر ہُوا ہے، خُدا کی بخشش ہے اَور مسیحیوں کے نظریہ کے مُطابق اِخلاقی مُعاملات میں عقلِ سلیم کا بُہت سا حِصہ ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چُکے ہیں، جدید نفسیات نے اِنسانی ذہن کے لیئے ایسے بُہت سے انکشافات کیئے ہیں جو یرمیاہ نبی کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں "دِل سَب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز اور لا علاج ہے اُس کو کون دریافت کر سکتا ہے۔" (یرمیاہ ۱۷: ۹) عبرانیوں کے خیال کے مُطابق دِل بہ نسبت جذبات کے کہیں زیادہ مقامِ اِدراک ہے۔ ماہرینِ نفسیات ہمیں بتاتے ہیں کہ عقلیت پسندی کا رُحجان، کردار کے راستے کو اختیار حاصل کرنے کے لیئے کامل نیکی اور قائل کرنے والے ادراک کو ڈھونڈتا ہے کیونکہ ہم حقیقتاً گھٹیا مقاصد کو جنہیں ہم اپنی طرف سے ذہنِ لاشعُور کے گوشوں میں چھُپا دیتے ہیں، اپنانا چاہتے ہیں مثلاً ہم مسٹر الف کی کسی عُہدہ پہ تقرّری کیلئے مخالفت کرتے ہُوئے دُوسروں کے سامنے ایسے دلائل پیش کر دیتے ہیں تاکہ یہ ثابت کریں کہ مسٹر الف بالکُل اعلیٰ خُوبیوں کا مالک نہیں لیکن درحقیقت مسٹر الف اَور ہمارے خاندان کے درمیان ایک دیرینہ جھگڑا اِس مُخالفت کا سَبب ہے اَور اگر کبھی اِس جھگڑے کے لیئے ہمیں للکارا جائے تو ہم ضرُور یہ عُذر پیش کریں گے کہ ہم تو بالکُل اِس



جھگڑے کو بھُول چُکے ہیں۔ جب ہم تارِیخ کلیسیا کی سیاہ کاریوں کو پردۂ ذہن پر لائیں گے تو ایک اَور زاویہ سے اِنسانی ادراک کو جسے ضمیر میں ظاہر کیا گیا ہے، شک کی نِگاہ سے دیکھیں گے مثلاً سپین کی عدالتِ تفتیش بدعات کے حُکم سے بدعتیوں کو جلایا گیا اَور جب کیلون نے سروِیٹس کو ملامت کی تو اُسے موت کے پنجوں میں جانا پڑا۔ یہ دونوں المناک واقعات ضمیر کے سخت حُکم سے وقُوع پذیر ہوئے۔

## ۲۔ کتابِ مُقدّس کی ضمیر سے مُتعلّق تعلیم

ہم کبھی یہ خیال نہ کریں کہ اِنسانی ادراک کی قوتیں جو اِخلاقی اصُولوں میں اِمتیاز کرتی ہیں یا مخصُوص حالات پر اِن اصُولوں کے اِطلاق کرنے کی اِنسان کی عملی مشق کو ہم "ضمیر" کے نام سے پُکارتے ہیں بلکہ یہاں تو عام آدمی کی بات بہ نسبت ایک پیشہ ور اِخلاقی فلسفہ دان کے، عہدِ جدید کے طرزِ بیان سے قریب تر ہے۔ عہدِ عتیق کے اِس جُملہ میں ضمیر کے ایک مسلّمہ تجربہ کی واضح طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ "اَور اُس کے بعد ایسا ہُوا کہ داؤُد کا دِل بے چین ہُوا اِس لِئے کہ اُس نے ساؤل کے جُبّہ کا دامن کاٹ لیا تھا" (۱۔ سموئیل ۲۴: ۵) یہاں پر ضمیر کا تعلّق ادراک یا اِخلاقی اصُول سے نہیں بلکہ احساسِ تکلیف سے ہے۔ یاد رہے کہ "ضمیر کی ملامت" کبھی اِس طرح شرُوع نہیں ہوتی کہ یہ ایک راہنما کی طرح قبل از وقت با اختیار حیثیّت سے راہنمائی کرے کہ اِنسان کو کیا کرنا ہے بلکہ کام کرنے کے بعد ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ شرُوع ہوتی ہے۔ ہاں البتّہ یہ بھی مُمکن ہے کہ کبھی یہ احساس مستقبل کے لیئے بھی آگاہ کرے لیکن اِس کے پسِ پُشت کسی گُذشتہ بُرائی کا احساس ہے۔ یہاں پر یہ بیان کرنا بھی لازمی ہے کہ ضمیر دُوسرے لوگوں کے اعمال کا فیصلہ نہیں کرتی کیونکہ اِس فعل کو ہم عیب جوئی کے نام سے پُکارتے ہیں جس کیلئے ہمارے خُداوند نے سخت ملامت کی۔ دورِ حاضرہ کے عُلماء نے

پُورے وثُوق سے وضاحت کی ہے کہ ترجمہ شدہ لفظ "ضمیر" سے عمُوماً یُونانی اَدب میں اَور عہدِ جدید میں یہی مطلب لیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک رائے تھی، کہ 'ضمیر' ستوئیکیوں کی فلسفیانہ اِصطلاح تھی جسے پَولُس نے بھی اِستعمال کیا لیکن اَب ہمارے پاس ایسی شہادتیں موجُود ہیں جن سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ لفظ عمُوماً تکلیف دہ احساس کو بیان کرنے کے لیئے اِستعمال ہوتا تھا۔ مگر پَولُس نے ستوئیکیوں کے خیال کی نِسبت اِس لفظ کو ہمیشہ اہم مقام دیا۔ بائبل میں ضمیر خصُوصاً کسی بُرائی کے اِرتکاب کا احساس ہے۔ ضمیر اَور اِس سے متعلقہ الفاظ کے تیس دفعہ اِستعمال میں سے نِصف براہِ راست بُری ضمیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دُوسرے نَو[9] میں منفی طور پر یہی مفہُوم لیا گیا ہے کہ ایک اچھّی، صاف اور نیک ضمیر ملامتِ نفس کے احساس سے آزاد ہے۔ عہدِ جدید میں چند ایسے اشارے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضمیر کو ایک حقیقی راہنما خیال کیا گیا ہے مثلاً مقدس پَولُس ۲۔ کرنتھیوں ۱ : ۱۲ میں یُوں رقمطراز ہے "کیونکہ ہم کو اپنے دِل کی اِس گواہی پر فخر ہے کہ ہمارا چال چلن دُنیا میں اور خاص کر تُم میں جسمانی حِکمت کے ساتھ نہیں بلکہ خُدا کے فضل کے ساتھ ایسی پاکیزگی اور صفائی کے ساتھ رہا، جو خُدا کے لائق ہے۔" لیکن جس طرح کہ ہمارا اُردو ترجمہ ظاہر کرتا ہے اس آیت میں یُونانی کا موزُوں ترجمہ 'دِل' ہے نہ کہ 'ضمیر'۔

## ۳۔ ضمیر کی معقُولیّت اَور اِستعمال

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک کام کرنے کے بعد احساس تکلیف' ایک قابلِ اِعتماد دلیل ہے کہ یہ کام غلط تھا؟ یقیناً اِس سوال کے جواب کے لیئے مُقدّس پَولُس کا جواب نفی میں ہوتا مثلاً وہ اِس حقیقت سے واقف تھا کہ ایک ایسے جانور کا گوشت کھانا جس کو غیر قوموں کے معبد میں قربانی کے طور پر ذبح کیا گیا ہو، اِخلاقی طور پر اِس کی کوئی اہمیت نہیں ہے (۱۔ کرنتھیوں ۸ : ۴)۔ تاہم وہ جانتا تھا



کہ کچھ لوگ 'کمزور' ہیں، جنہیں اگر یہ معلُوم ہو جائے کہ وُہ گوشت جو وُہ کھا رہے ہیں کِس طرح ذبح کیا گیا ہے، تو لازمی بات ہے کہ وہ ضمیر کے اِلزام کے احساس میں مُبتلا ہو جائیں گے۔ مُقدّس پَولُس تسلیم کرتا تھا کہ اگر یہ تنگ نظر لوگ مسیحی عرفان میں بڑھیں اَور اپنے ایمان میں مضبُوط ہوں تو اِس مُعاملہ میں وُہ ضمیر کی اِس قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ چند سال ہُوئے، ایک دفعہ جب لاہور میں مسیحی عبادت میں ہندُو مذہب کے کچھ طریقے استعمال کیئے گئے تو بہُت سے مِشنریوں اور چند دُوسرے لوگوں نے اِسے بہُت پسند کیا لیکن وہ جو ہندُومت کو چھوڑ کر مسیح کو قبُول کر چُکے تھے، غیر قوموں کے اِن طریقوں کو خُدا کی عبادت میں اپنانے سے ضمیر کے اِس اِلزام کے احساس میں مُبتلا ہو گئے۔ ہم کمزور و مضبُوط سَب ضمیر کے احساس تکلیف میں مُبتلا ہیں لیکن اِس کا سبب اِخلاقی راہنماؤں کے نقائص ہیں۔ ایسی تکلیف کا احساس اُس وقت لازمی ہے جب ہم نے مُعاشرتی آداب و رسُوم کی خلاف ورزی کی ہو مثلاً جب ایک مشرقی مجلس میں مغربی وضع کے تحت ہم نے ٹوپی اُتار لی ہو، حالانکہ مشرقی آداب کے تحت سر ڈھانپنا ضرُوری ہے تو اُس وقت ہم ایسے ہی احساس میں مُبتلا ہو جائیں گے جس کو ہم بمُشکل ضمیر کے احساس سے علیحدہ کر سکتے ہیں۔ ایسے احساس کا پیدا ہونا اُس وقت بھی لازمی ہے جبکہ اپنے محدُود عِلم کے باعث کسی بدیسی زبان میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہُوئے ہم نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔ سکاٹ لینڈ کے ایک باشندے کو جس نے اپنے آباؤ اجداد سے کفایت شعاری وَراثت میں لی ہو اَور اُس کی مُلکی تعلیم و تربیّت یہ عادت اَور پُختہ ہو گئی ہو، ضمیر کے تحت گھبراہٹ کا احساس ہونے لگے گا جب کبھی وُہ ایسے موقعوں پر بہُت سا رُوپیہ خرچ کرتا ہے جہاں اِس کا ادراک بتاتا ہے کہ یہ عقلمندی اور فیاضی سے خرچ کیا جا رہا ہے۔ دورِ وکٹوریہ میں لوگ جب دُعا نہ کر سکتے اور نہ ہی گرجہ گھر میں عبادت کے لیئے جا سکتے تو اُن کی ضمیر ایسی ہی ملامتِ نفس کا شکار ہو جاتی۔ آج کل بھی اکثر لوگ

اگر اُن کے پاس اپنے پڑوسیوں کی طرح موٹر کار یا ٹیلی ویژن نہ ہو، تو ایسی ہی ندامت محسُوس کرنے لگتے ہیں۔ معلمینِ اخلاقیات اِس امر کی یُوں تشریح کریں گے کہ لوگوں کا یہ احساسِ تکلیف، ضمیر کی تکلیف نہیں بلکہ یہ احساس مُعاشرہ کے معیار تک نہ پہنچ سکنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔

ضمیر کے احساسِ تکلیف کے متعلق، عِلمِ تحلیل نفسی نے بہُت سے اہم حقائق کا انکشاف کیا ہے کہ طبعی لحاظ سے ذِہنی طور پر صِرف صحت مند لوگ ایک حقیقی بُرائی کے بعد ضمیر کے احساسِ تکلیف میں مُبتلا ہو جاتے ہیں تاہم بہُت سے لوگ (خصُوصاً وہ جو ذِہنی لحاظ سے بیمار ہیں اور احساسِ جُرم کا شکار ہیں) معمُولی غلطی کے بعد ایسے شدید احساسِ تکلیف کی زد میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی مُمکن ہے کہ انہوں نے ایسے کام کِئے ہوں جِن سے اُن کے احساساتِ جُرم بیدار ہو گئے ہوں لیکن وُہ اپنے ذِہنِ شعُور سے اُن کی یاد کو فراموش کرتے ہُوئے اپنے احساسِ جُرم کو کسی معمُولی جُرم سے منسُوب کر دیتے ہوں۔ مسیحی بشارت کے کُچھ طریقوں میں ایک یہ بھی رُحجان رہا ہے کہ مسیح کی نجات کو قبُول کرنے سے پہلے گُنہ گار کی تیاری کے لیئے اُس کے احساسِ جُرم پر زور ڈالا جائے لیکن اُس وقت ایسا زور دینا واجب اور مُناسب ہے جبکہ ایک تائب دِل ذِہنی مریض کا احساسِ جُرم بالکُل حقیقی ہو۔ اِسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ اُس کو یہ بھی احساس دلایا جائے کہ وُہ گُنہ گار ہوتے ہُوئے خدُا سے دُور رہا ہے۔ ماہرِ تحلیلِ نفسی ہماری کسی حقیقی غلطی کے اِرتکاب کے بعد ہمیں احساسِ جُرم سے آگاہ تو کر سکتا ہے لیکن ہمارے پریشان ذِہن کے لیئے عملی تدابیر ہی ہماری حقیقی ضرُورت کو پُورا کر سکتی ہیں۔ ماہرینِ تحلیلِ نفسی یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب ضمیر کا یہ احساس تکلیف غیر معمُولی پر شدید ہو تو یہ بہُت حسّاس ضمیر کی علامتیں نہیں بلکہ ہماری نشو و نما کے ایک اِبتدائی دور کے اصُولاتِ بقا ہیں جب بچّہ اپنے آپ کو تکلیف دینے کے لیئے اپنی جنگجُو جبلّتیں اِستعمال کرتا ہے۔ معمُولی غلطیوں پر شدید احساسِ ندامت ایک نابالغ ضمیر کی علامت ہے



نہ کہ مسیحی بلُوغت کی۔ یہ مُمکن ہے کہ چند حالات میں ماہرِ تحلیلِ نفسی کِسی ذہنی مریض کو اُس کے احساسِ جرم کی صحیح وجُوہات بتا سکے اور یُوں اُسے اُس کی تکلیف سے بچا دے لیکن وُہ کبھی بھی بُرائی کے احساسِ جُرم کو نہ تو دُور ہی کر سکتا ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔ مگر ایسے احساس کو صِرف مسیح یسُوع ہی دُور کرنے میں قادر ہے۔

ضمیر کی تکلیف کا وُہی کردار ہے جو کہ جسمانی تکلیف کا۔ اور یہ اِس اَمر کی علامت ہے کہ کہیں نہ کہیں ضرُور خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی سر درد دماغ میں ایک بڑھتے ہُوئے ناسُور، پیٹ کی تکلیف یا محض طبیعت کی اُکتاہٹ سے ہو۔ مُمکن ہے کہ محض تشخیص کے لیئے یہ مُفید اشارے ہوں لیکن یہ ہماری اِنسانی جبلت ہے کہ جِتنی جلدی مُمکن ہو اِس سے چھٹکارا حاصل کر کے اسے بھُول جائیں۔ باہوئیفر یُوں بیان کرتا ہے کہ ضمیر کا احساسِ تکلیف گرے ہُوئے اِنسان کی اپنی ذات سے نا اتفاقی اور خدُا سے گہری ناچاقی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مُلحد اور دینِ انسانی کے پیرو بھی ویسے ہی ضمیر کے احساسِ تکلیف میں مُبتلا ہیں جیسے کہ وہ لوگ جو خُدا کو مانتے ہیں۔ یہ ضمیر کی ایک مجبُوری ہے کہ اِنسان کا خُدا سے براہِ راست تعلّق پیدا کرنے میں اِس کا کوئی حِصّہ نہیں، کیونکہ وُہ کسی ذہنی بِیماری کی تہ تک پہنچنے سے بالکُل معذُور ہے۔ ایک غیر مخلصی یافتہ اِنسان میں بہر صُورت ضمیر کا تعلق ہماری سالمیّت سے ہے نہ کہ ہماری خُدا سے علیحدگی کے بارے فِکر مندی سے۔ تاہم ضمیر کی تکلیفیں قابلِ توجّہ ہیں اور دُوسری تمام تکلیفوں کی طرح ہم اِن سے بچنا چاہتے ہیں۔ ضمیر کے احساسِ تکلیف سے بچنے کی خاطر اِنسان کے لیئے آسان اور معقُول طریقہ یہی ہے کہ جِن چیزوں کو ضمیر بُرا ٹھہراتی ہے، اُن سے دُور رہے۔ تاہم عِبرانیوں کے خط کے حوالہ جات کے بغور مُطالعہ سے ہمیں معلُوم ہوتا ہے کہ مسیحی زِندگی میں ضمیر کا احساسِ تکلیف رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے کیونکہ

CamScanner

مسیح میں ہماری تمام تکلیفیں ختم ہو گئی ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ اِس تکلیف کے عوض ہمیں ایک حقیقی خوشی مل جاتی ہے۔

گزشتہ صدی کے ایک ناول میں ایک ایسا کردار تھا کہ ایک نوجوان جو اپنی صحت کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند تھا، طبّی لغت میں ڈھونڈنے لگا اور یہ معلوم کیا کہ سوائے گھٹنوں کی سوزش کے وہ ہر ایک بیماری میں مُبتلا ہے۔ انسان کو اپنی رُوحانی صحت کے لیئے ایسی ہی فکرمندی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ مُقدّس پولس کے چند کرنتھی مسیحی جنہیں وُہ کمزور کہہ کر پُکارتا ہے ایسے ہی احساس میں مُبتلا تھے۔ ایک حقیقی مسیحی کا کبھی بھی یہ رویّہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اپنے ماضی کے اعمال کے نقائص کو ڈھونڈتا رہے، بلکہ جو کچھ بیت چکا ہے اُسے بھول جائے اور مسیح یسوع میں خُدا کے بُلاوے کو مدّنظر رکھتے ہوئے آگے کی طرف بڑھتا جائے۔ (فلپیوں ۳: ۱۴) اگر باہنوئیفر کا یہ نظریہ دُرست تھا کہ ضمیر کا بُنیادی تعلّق ہماری سالمیّت سے ہے، تو یہ ایک ضرورت سے زیادہ محتاط ضمیر کی طرف زیادہ توجّہ دینے سے مسیحی بلاہٹ کے اہم تقاضوں کو پُورا کرنے سے قاصر ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اگر اپنے آپ کو کبھی ایسی حالت میں پائیں جیسی کہ کانٹ نے بیان کی ہے جبکہ ایک مُسلّح دُشمن ہمارے کسی ایک ایسے دوست کے متعلق جو ہمارے مکان میں پوشیدہ ہے، نقل و حرکت کے بارے میں پُوچھتا ہے تو ہم صاف جھُوٹ بولتے ہُوئے انکار کر دیں گے کہ وُہ ہمارے ہاں نہیں ہے۔ لیکن ایسا قدم اُٹھانے میں ہم حق بجانب ہیں۔ جھُوٹ بولنے کے بعد ہمیں ضمیر کا احساسِ تکلیف تو ہوگا۔ تاہم ہمارے سچ بولنے کے نتیجہ میں ہمارے دوست کے قتل ہو جانے کی نسبت یہ احساسِ تکلیف اِتنا شدید نہ ہو گا۔ باہنوئیفر اِسے "انسانی محبّت کی خاطر جُرم برداشت کرنے" کے نام سے پُکارتا ہے۔ اُس کا ایمان ہے کہ اگر مسیحی اِس دُنیاوی زندگی میں اُن مشکلات میں ہے جن کا مسیح خُداوند



تقاضا کرتا ہے تو اُن کے لیئے بعض ایسے مواقع بھی ہوں گے، جب اُسکی محبت اُن کو ایسے کام کرنے پر بھی مجبُور کرے گی جو اُن کی ضمیر کے خلاف ہوں گے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ باہنوئیفر بھی ایسے ہی جُرم کا مُرتکب ہوا، جب اُس نے ہٹلر کو قتل کرنے کی سازش میں قدرے حِصّہ ادا کیا۔ جیسے کہ ہم اکثر تصوّر کرتے ہیں، ضمیر کا احساسِ تکلیف ہی نیکی اور بدی کے درمیان مُنصف نہیں اور جیسے کہ ایک شخص کو خُدا کی بخشش، جسمانی صحت کو اکثر حالات میں مسیح کی خاطر قُربان کر دینا پڑتا ہے، اِسی طرح یہ بھی مُمکن ہے کہ اُسے چند خطرناک حالات میں مسیح کی بلاہٹ کی فرمانبرداری کے تحت اپنی رُوحانی ایمانداری کو بھی قُربان کر دینا پڑے۔

ضمیر کے احساسِ تکلیف کو ہم اِس قسم کے لفظ "ٹھہر جاؤ" سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ایک نشان ہے جو ہمیں ٹھہرنے اور سوچنے کے لیئے حُکم دیتا ہے۔ ایک مُلحد شخص کو بھی اپنے ساتھ ایک ایسی رُوحانی موجُودگی کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ اپنا 'دیوتا' کہہ کر پکارتا ہے لیکن وُہ اِس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس 'دیوتا' نے اُس کو صِرف منفی راہنمائی دی جس نے اُسے یہ تو بتایا کہ وُہ ٹھہر جائے لیکن یہ نہ بتایا کہ اِس کے بعد وُہ کیا کرے۔ جب نیومین اینگلکن کلیسیا کو چھوڑ کر رُومی کلیسیا میں جانے سے پہلے قدرے شک میں مُبتلا تھا تو اُس نے اپنے ایک دوست کو لِکھا کہ "یہ جاننا مُشکل ہے کہ بلاہٹ ادراک سے ہے یا کہ ضمیر سے" یقیناً نیومین نے اپنے اِس اقدام کے لیئے اپنے "دلیل نامہ" میں مضبُوط دلائل پیش کیں۔ لیکن اِس کے خط میں ضمیر کی طرف اشارہ ہمیں حیران کر دیتا ہے کہ کیا اِس مرحلہ پر سُقراط کی ضمیر کا دیوتا نیومین کے ساتھ نہ تھا کہ اُسے ٹھہرا کر سوچنے کے لیئے حُکم دے؟ ماہرینِ نفسیات ایسے تجزیہ کا تجزیہ کرنے میں غالباً یہ بتائیں گے کہ ہمارے شعُور میں ایک ملامت کرنے والا عنصر ہے یا شاید وُہ ایک پُراسرار فوق الذات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کے اِس خیال میں حقیقت

ہو۔ لیکن ایک مسیحی کے لیئے کم از کم ضمیر کی آواز خاص حالات میں خُدا کی مرضی کو معلوم کرنے کا ایک نشان ہوگا۔

## ۵۔ ضمیر اور رُوح القُدس

اگر ہمارا رُوح القُدس پر ایمان نہ ہوتا تو شاید ہم اس باب کو یہیں ختم کر دیتے اور اِس کے مسیحی قاری کو جس نے اِس کی دلیل کو قبول کیا ہے، یہیں پریشانی اور مایوسی کی حالت میں چھوڑ دیتے۔ ہم نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اِنسانی گُناہ سے ضمیر بگڑ سکتی ہے اور اِسی بِنا پر یہ ایک غیر واضح ماحول جس میں ہماری پرورش ہوئی ہے، پیش کرتی ہے۔ یہ بھی مُمکن ہے کہ وُہ اُن پاکیزہ احساسات کو مُنعکس کرتی ہو جن سے ہماری زندگی مُتاثر ہُوئی ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ ہماری ضمیر رُوح القُدس سے تبدیل ہو جائے، جیسے کہ مسیح خُداوند نے خُود وعدہ کیا ہے۔ رُوحِ حق اُس کے شاگردوں کو سچائی کی راہ دِکھاتا ہے۔ ہم کبھی یہ خیال نہ کریں کہ وُہ ہماری اِنسانی فطرت کے اِس پہلُو یعنی ضمیر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چُکے ہیں رُوح القُدس کی اس تبدیلی کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ بہُت سی سطحی چیزیں، جو پہلے تو ہم میں ضمیر کا احساسِ تکلیف بیدار کر دیتی تھیں، اب آئیندہ ایسا کرنے سے رُک جائیں گی۔ مُقدس پُولس کے کمزور کرنتھی مسیحی جب رُوح القُدس کی قُوّت سے مُلبس ہو جائیں تو وہ قُربانی کے گوشت کو بغیر سوال کئے کہ یہ کہاں اور کیسے ذبح کیا گیا، خُوشی سے کھا سکیں گے، اور اِس کے لیئے خُدا کا شُکر ادا کریں گے۔ سکاٹ لینڈ کا ایک کفایت شعار باشندہ جب رُوپے کی گُناہ آلُود فضول خرچی کا خیال کرے گا تو اچھے مقصد کیلئے وُہ خُوشی سے بغیر کبھی احساسِ تکلیف کے خیرات دے گا اور سبت کی پابندی کرنے والا بھی جب رُوح القُدس سے معمُور ہو جائے گا تو اِتوار کے دِن وُہ ضمیر کے



احساسِ تکلیف کے بغیر عبادت اور تفریح سے لُطف اندوز ہوگا۔ ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ وُہ حلقہ جس کا ضمیر سے تعلق ہے وسیع ہو جائے گا۔ کیونکہ ضمیر کی ملامت اَب صِرف اُس وقت ہوگی جب ہم نے جھُوٹ بولا ہو، یا کِسی حاجت مند کی مدد کرنے سے گریز کیا ہو۔ ضمیر کا احساسِ تکلیف اُس وقت بھی ہوگا جب ہمارا مُعاشرہ، حکُومت یا کلیسیا مسیح خُداوند کی راہوں سے بھٹک گئے ہو، حالانکہ اُن کے غلط کاموں میں ہمارا براہِ راست کوئی حِصّہ نہیں۔ ہمیں اُس وقت بھی ضرُور ایک احساسِ جُرم ہوگا جب ہماری فضائیہ فوج نے اَندھا دُھند کِسی شہر پر بم گرائے ہوں یا ہمارے محلّہ میں کسی نے شراب خانہ کھول دِیا ہو جہاں ہم خُود کبھی بھی داخل نہ ہوتے ہوں یا جب ہماری جماعت مسیح کی کلیسیا کے اِتحاد کیلئے مُتفق نہیں بلکہ اِس کے لیئے اپنے دروازے بند کرتی ہے۔

ہم جبلّی اِخلاقی راہنمائی سے کبھی مُطمئن نہ ہوں گے یعنی اِس احساس کے تحت کہ کسی کام کا فلاں طریقہ ضرور غلط ہوگا حالانکہ ہم جانتے بھی نہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ مُمکن ہے کہ یہ احساس محض تعصّب کی بنا پر ہو اور اِس کا ضمیر سے بالکُل کوئی تعلق نہ ہو۔ چُنانچہ ہمیں رُوح القُدس کی ضرُورت ہے کہ وُہ ہماری اِخلاقی قُطب نما کو دُرست رکھے اور یہ ظاہر کرے کہ خُدا ہم سے کیا چاہتا ہے؟ رُوح القُدس ہماری ضمیر کو منوّر کرتے ہُوئے کتابِ مُقدّس میں خُدا کے کلام کی طرف راہنمائی کرے گا اور مسیح یسُوع کی مِثال کو ہمارے سامنے لائے گا۔

اِس پر ہم اگلے تین ابواب میں غور و خوض کریں گے۔ لیکن عِلاوہ ازیں مسیح خُداوند خُود رُوح القُدس کے وسیلہ سے، ایمان سے ہمارے دِلوں میں سکُونت کرے گا۔ یہ اِخلاقیات سے کہیں بالا ہے اور مسیحی نیکی کی رُوحِ رواں ہے جس پر ہم اِس کتاب کے آخری باب میں غور کریں گے۔

---

چوتھا باب

# اسرائیل کی اخلاقی وراثت

## ۱۔ عہدِ عتیق کے بارے میں مسیح خداوند کا نظریہ

ایک نو مریدِ مسیحی کے لیئے یہ ایک آزمائش ہے کہ وہ اپنے اُن اخلاقی اصولوں کو جِن کے تحت اُس کی تربیّت ہُوئی ہے، بالکُل ترک کر دینا چاہتا ہے لیکن ایک شخص جو مذہبِ اسلام کو ترک کر کے مسیحی ہُوا ہے، اُس کے لیئے بہتر ہوگا کہ وہ شراب نوشی سے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ پر قائم رہے یا جس نے ہندومت کو چھوڑ کر مسیحیت کو قبول کیا ہے اُسے شادی سے متعلق یہی نظریہ رکھنا چاہیئے کہ شادی ایک دائمی رِشتہ ہے۔ اسی طرح اخلاقی مُصلحین اور نئے مذاہب کے بانیوں کے لیئے یہ ایک آزمائش ہے کہ شاید وہ کُلّی طور پر ماضی کے نظریات کو ترک کردیں لیکن اگر وہ عقلمندی سے قدم اُٹھائیں تو اِس آزمائش کا مُقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا خُداوند بھی یہودیوں کی تمام اخلاقی روایات کو جنہیں فریسیوں نے بِگاڑ دیا، آسانی سے ترک کر سکتا تھا لیکن اُس کا رویّہ اُس کی اپنی اِس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے "اُس نے اُن سے کہا اِس لیئے ہر فقیہہ جو آسمان کی بادشاہی کا شاگرد بنا ہے اُس گھر کے مالک کی مانند ہے جو اپنے خزانہ میں سے نئی اور پُرانی چیزیں نکالتا ہے۔" (متی ۱۳ : ۵۲)

ہمارے پاس واضح دلائل ہیں کہ مسیحیوں کو عہدِ عتیق کی تعلیم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے (ا) ہمارے خُدانے خُود واضح طور پر کہا "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسُوخ کرنے آیا ہُوں۔ منسُوخ کرنے نہیں



بلکہ پُورا کرنے آیا ہُوں، کیونکہ مَیں تُم سے سچ کہتا ہُوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نُقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کُچھ پُورا نہ ہوجائے۔" (متی ۵ : ۱۷، ۱۸)۔ ہم خیال کر سکتے ہیں کہ گویہ ایک مشرقی اُستاد کی واضح اور تمثیلی زباندانی ہے لیکن ہمیں اِس حقیقت سے مُتعارف کراتی ہے کہ عہدِ جدید کی اخلاقیات کی، عہدِ عتیق کے مُکاشفہ میں گہری بُنیاد ہے۔ (ب) کلیسیا نے ہمیشہ اِسے تسلیم کیا ہے کہ عہدِ عتیق محض یہودیوں کی کتاب نہیں بلکہ مسیحی بائیبل کا ایک لازمی جُزو ہے جس میں مسیح کے نجات بخش کام کی کہانی کا پہلا حِصّہ ہے۔ ایک نو مُرید مسیحی کے لیئے یہ مطالبہ ہوتا ہے اور ایک مسیحی بچّے کی تعلیم کا بنیادی حِصّہ ہے کہ وُہ دس احکام جسے عہدِ عتیق کی اخلاقی شریعت کا نچوڑ کہا جاتا ہے، یاد کرے۔ آج کل بھی مسیحیوں کا خیال ہے کہ دس احکام کی بجائے ہم مسیح خُداوند کے دو احکام سکھائیں جسے مسیح خُداوند نے اوّل مقام دیا لیکن یہ دونوں اِسرائیل کی قدیم شریعت سے ماخوذ ہیں۔ خُدا سے محبّت کرنے کا حُکم استثنا ۶ : ۵ اور پڑوسی سے محبّت کرنے کا حُکم احبار ۱۹ : ۸ سے لیا گیا ہے۔

جب ہم مسیحی اخلاقیات کے لیئے عہدِ عتیق کی اہمیّت کو جانیں گے تو یقیناً کُچھ نہ کُچھ نتائج برآمد ہوں گے۔ (د) معاشرتی مُعاملات اور سیاسیات سے مُتعلق کُچھ ایسے اخلاقی مُعاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں عہدِ عتیق میں انبیاء کی تعلیم سے بہت سا مواد مِل سکتا ہے کیونکہ اُنہوں نے یہ تعلیم اُس وقت دی جب اسرائیل ایک آزاد قوم کی حیثیّت سے اپنے مُعاملات کے لیئے خود مُنتظم تھی لیکن دُوسری طرف عہدِ جدید کے مصنّفین جو مسیحی اقلیّت کے لیئے لِکھ رہے تھے، اُن کی رُومی حکومت میں کوئی آواز نہ تھی۔ تجارتی معاملات میں انعام اور رشوت لینے اور بغیر کسی سیاسی دباؤ کے معمُولی لوگوں کے انصاف میں کوتاہی کی تعلیم ابھی تک مسیحیوں پر لاگُو ہے مثلاً (یسعیاہ ۱ : ۲۳ ب) مسیح یسُوع کی طرح

ہمیں بھی عہدِ عتیق کی بنیادی اَور ضمنی اخلاقی تعلیم میں فرق معلوم کرنا چاہیئے پاکیزہ دِل اور پاکیزہ رُوح کی تعلیم کی نسبت اِس تعلیم کی کہ کونسا کھانا ناپاک کر دیتا ہے، بہت کم اہمیت ہے۔ (مرقس ۷ : ۱۵) اَور طلاق سے متعلق مُوسوی شریعت کی عارضی رعایت خُدا کے اِس بُنیادی قانُون کہ شادی ایک تاحیات رشتہ ہے کے متضاد نہیں ہونی چاہیئے۔ بعض مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کا یہ نظریہ ہے کہ عہدِ عتیق کی اِنتقام اَور ظُلم کی اخلاقیات کی جگہ عہدِ جدید کی محبّت اَور رحم کی اِخلاقیات نے لے لی ہے لیکن اُن کے اس بیان میں بہت کم حقیقت ہے۔ تاہم عہدِ عتیق کے مصنّفین کو یقیناً خُدا کی نیکی اَور اخلاقی تقاضوں سے بہت کچھ سیکھنا تھا لیکن جیسا کہ ہمیں کہنا چاہیئے، خُدا نے اُنہیں صحیح راستہ پر ڈال دیا تھا۔ قدیم سُور ما لمک ایک بُرائی کے لیئے ستر گُنا اِنتقام کا مُطالبہ کرتا ہے (پیدائش ۴ : ۲۴)۔ مُوسوی شریعت نے اِنتقام کو "آنکھ کے بدلے آنکھ اَور دانت کے بدلے دانت" (خروج ۲۱ : ۲۴) تک محدُود کر دیا لیکن ہمارے خُداوند نے اِس سمت ایک قدم اور آگے بڑھتے ہُوئے شریر کا مُقابلہ نہ کرنے کا حُکم دیا (متی ۵:۳۹)

ہاں البتّہ عہدِ عتیق کے ایّام کے قانُونی ضابطہ اَور عمل میں کُچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں ہم مسیحی قبُول نہیں کر سکتے مثلاً زیادہ بیویاں رکھنا یا جنگ میں مفتُوحہ شہر کو مکمّل طور پر لُوٹ لینا وغیرہ۔ تاہم ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم عہدِ عتیق کے معیار پر اِتنی سختی سے فیصلہ دیں لیکن ہم اَب بھی خیال کرتے ہیں کہ اخلاقی قوانین مُختلف حالات میں مُختلف طور سے اطلاق کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً اَمن کے ایّام میں قتل کرنا عالمگیر طور پر ممنُوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قوانین جنگ کے تحت ایسی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ تاہم، ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح کی اعلیٰ تعلیم اُس کے پیروکاروں کو بُرائی کے اِرتکاب سے باز نہ رکھ سکی مثلاً عہدِ عتیق کے ایّام کی مانِند، مسیحیوں نے بھی مذہب



کے نام میں اپنے مسیحی بھائیوں اَور یہُودیوں کو اِیذائیں دیں حتےٰ کہ موت کے گھاٹ بھی اُتار ڈالا۔ حالانکہ عہدِ عتیق کے لوگوں کو خُدا کی مرضی کا وُہ مُکاشفہ حاصل نہ تھا جیسے کہ ہمیں مسیح میں حاصل ہے جو عہدِ عتیق کے اِخلاقی نظریہ کو نئی شکل دینے اَور مکمّل کرنے کے لیئے آیا۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مسیح کے خزانے میں دونوں نیا اَور پُرانا سرمایہ ہے۔

## ۲۔ عہدِ عتیق کی اِخلاقیات کی خصُوصیات

(۱) اِنسانی نیکی کا اِختیار، نمُونہ اور محُرک خُدا کی پاکیزگی میں ہے۔

کتابِ مُقدّس ایک اور حقیقت کا اِنکشاف کرتی ہے کہ عہدِ عتیق میں اِنسانی اخلاقیات کی بُنیاد الٰہی اِخلاقیات پر ہے اَور یہ اُن نظاموں سے مُختلف ہے جن سے اِخلاقیات کے طلباء واقف ہیں۔ احبار کے قوانینِ پاکیزگی میں عام حُکم میں واضح طور پر بتایا گیا ہے "تم پاک رہو کیونکہ مَیں جو خُداوند تمہارا خُدا ہُوں، پاک ہوں۔" (احبار ۱۹ : ۲) اَور خُدا کے ہر ایک خاص حُکم کی بُنیاد اِس حُکم پر ہے "مَیں خُداوند تمہارا خُدا ہُوں۔" عبرانی لفظ "قادوش" کا ترجمہ "پاک" کیا گیا ہے۔ اِس کے مصدر کا یہ مطلب ہے جو دُنیاوی اِستعمال سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ دورِ حاضرہ کے عُلماء نے اِس بات پر زور دیا ہے کہ مُمکن ہے کہ اِس لفظ کا بنیادی طور پر اِخلاقیات سے کوئی تعلّق نہ ہو، بلکہ اِس کا یہ مطلب ہے "وُہ جو بالکل مُختلف ہے" یا "خدا کا بُہت عظیم اَور دِلفریب بھید" ہے۔ کتابِ مُقدّس میں یقیناً ایسے مقامات ہیں جہاں کہ "قادوش" کے معنی صِرف یہاں تک محدُود ہیں کہ کسی شخص کے لیئے کُچھ ممنُوع قرار دِیا گیا ہے یا جیسا کہ سیموئیل کی کتاب میں عہد کے صندُوق سے متعلق پُراسرار

کہانیاں ہیں (۱۔ سیموئیل ۵، ۲۔ سیموئیل ۶ : ۶ - ۹) تاہم عہدِ عتیق میں اِس لفظ کی اوّلین اہمیّت یہ نہیں ہے۔ خُدا کی پاکیزگی کا دو بیانات میں ذِکر آیا ہے یعنی ہیکل میں یسعیاہ کی رویا اور ایوّب کی رویا میں جس میں کائناتِ قدرت میں خدُا کے کاموں کے بیان میں وُہ اِس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خدُا کی اِخلاقی عظمت کی معراج ہے جس سے یہ لوگ مُتاثر ہیں۔ یسعیاہ کا یہ تاثر ہے کہ "مجھ پر افسوس! میں تو برباد ہُوا! کیونکہ میرے ہونٹ ناپاک ہیں اور نجس لب لوگوں میں بستا ہُوں کیونکہ میرے آنکھوں نے بادشاہ ربّ الافواج کو دیکھا" (یسعیاہ ۶ : ۵) ایُوب کا بھی ویسا ہی ردِ عمل ہے "مَیں نے تیری خبر کان سے سُنی تھی، پر اب میری آنکھ تجھے دیکھتی ہے اس لیئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے اور مَیں خاک اور راکھ میں توبہ کرتا ہُوں" (ایُوب ۴۲ : ۵ - ۶) عہدِ جدید میں جب مقدّس پطرس مچھلیوں کے جال کے کھینچنے کا مُعجزانہ واقعہ دیکھتا ہے تو اُس کا بھی ایسا ہی احساس ہے "اے خداوند! میرے پاس سے چلا جا کیونکہ میں گنہگار آدمی ہُوں" (لُوقا ۵ : ۸)۔ اِن مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ کس طرح خدُا کی پُراسرار پاکیزگی کے مکاشفہ کا جواب، ایک شخص کی اپنی گُناہ آلود حالت کا گہرا احساس ہے۔ تاہم خدُا کی پاکیزگی کو بالکل اِخلاقیات کی اِصطلاحات میں سوچنا نامُمکن ہے کیونکہ اُس کی بھلائی ایک دہشت ناک بھید ہے۔

ہم خدا کی پاکیزگی کے کچھ پہلو جن کا تعلّق ہمارے موجودہ حالات سے ہے، معلُوم کر سکتے ہیں۔

ہماری اِن تینوں مثالوں سے واضح ہے کہ وہ لوگ جو خدُا کی پاکیزگی کو محسُوس کرتے ہیں، یقیناً اُنہیں اپنی گناہ آلُود حالت کا احساس ہوتا ہے اور یسعیاہ کے واقعہ میں تو یہ اُن کے معاشرہ کی گُناہ آلُود تصویر بھی تھی۔ اپنے



گُناہ کا احساس اِنسانی فِطرت کے بالکُل مُتضاد ہے۔ لیکن دورِ حاضرہ کا دینِ اِنسانی کا پیرو ایسے احساس سے بالکُل آزاد ہے۔ ایک مسیحی کا اس بات پر فخر کرنا بالکل بجا ہے کہ اُس کا اپنا فِرقہ دُوسرے تمام فرقوں سے بہتر ہے۔ لیکن جب کبھی ایک آقا اور نوکر، ایک قوم اور دُوسری قوم اور مسیحی جماعت کی ایک پارٹی اور دُوسری پارٹی کے درمیان نظریات کا اِختلاف ہو تو اُسے احساس ہونا چاہیئے کہ اُس کی اپنی طرف اور دُوسری طرف بھی کوئی نہ کوئی بُرائی موجُود ہے اور یہ احساس صُلح کی طرف پہلا اہم قدم ہے۔ کم سے کم بُرائی کو محسُوس کر کے اُسے تسلیم کر لینے سے ہی ایک مسیحی کی طرف سے جماعتی اور بین الاقوامی جھگڑوں میں عملی حِصّہ اور اِمداد ہے۔

۲۔ خدُا کی پاکیزگی کا دُوسرا نتیجہ یہ ہے کہ وُہ انسان کو اپنی پیروِی کی طرف مائل کرتی ہے۔ "تم پاک رہو کیونکہ میں جو خدُاوند تمہارا خدُا ہُوں پاک ہُوں" (احبار ۱۹ : ۲) پہاڑی وعظ میں ایک ایسی ہی پیروِی کے لیئے براہِ راست حُکم ہے "پس چاہیئے کہ تُم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے" (متی ۵ : ۴۸)۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم ایک ایسے خدُا کی پیروِی کرتے ہیں جو ہمارے سب خیالوں سے اعلیٰ ہے اور ہماری مسیحی اِخلاقیات کیلئے ایک فوق الفِطرت ماحول پیدا کرتی ہے۔ مسیحی نیکی میں فیاضی، معافی کی توفیق اور تعظیم و ادب کی ایسی رُوح ہونی چاہیئے جو مسیحی ایمان سے باہر نیک سے نیک ترین لوگوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

عام طور پر خدُا کے عظیم الشان کام، ہماری طرف سے مناسب ردِّ عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کی اعلیٰ ترین مثال عہدِ عتیق کے مرکزی مضمُون میں پائی جاتی ہے کہ خدُا نے اِسرائیل کو مِصر سے مُخلصی دلانے کے بعد وفاداری

اَور فرمانبرداری کا مُطالبہ کیا۔ یہ مُخلصی نہ صِرف زِندگی کی نیکی کے لِئے عام چیلنج تھا بلکہ خُدا کے کام کی خاص خُوبی نے مُخلصی یافتہ لوگوں سے ایسے ہی جواب کا تقاضا کیا مثلاً اِستثنا کی کتاب میں مذکُورہ شریعت میں جب ایک غُلام کو آزاد کرانے کے لِئے شرائط ٹھہرائی گئیں تو اِس میں اعلان رکیا گیا کہ "یاد رکھنا کہ مُلک مِصر میں تُو بھی غُلام تھا اَور خُداوند تیرے خُدا نے تُجھ کو چُھڑایا اِسی لِئے میں تُجھ کو اِس بات کا حُکم آج دیتا ہُوں" (استثنا ۱۵ : ۱۵)۔ برُونز' خُدا کے کام کے اِس جواب میں مسیحی اخلاقیات کی خاص خُوبیوں کو پاتا ہے بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ " الٰہی کردار سے معین کی ہُوئی یہ اِنسانی کردار کی سائنس ہے"۔

## ۳۔ عہدِ عتیق کی اِخلاقیات کی خصُوصیّات

(ب) اِنسان کی نیکی کا اِظہار' مُعاشرہ کی زِندگی میں ہَے۔

اِسرائیل کے کِسی فرد نے کبھی بھی اپنے آپ کو محض ایک فرد کی حیثیّت سے تصوّر نہیں کیا تھا بلکہ اُس قوم کے فرد کی حیثیّت سے جسے خُدا نے ایک خاص مَقصد کے لِئے چُنا اَور جِس کے ساتھ اُس نے کوہِ سینا پر عہد باندھا۔ چُنانچہ نیکی کا اظہار محض افراد کی دینداری میں نہیں بلکہ قومی زِندگی کے دستُوروں میں ہے مثلاً ایسے ہی پناہ کے شہر تھے جن کا مَقصد تھا کہ ایک ظاہری مُجرم پر غیر مُنصفانہ انتقام کو روکا جائے۔ (گنتی ۳۵ : ۹–۳۴) ایک نیک بادشاہ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ قومی مسائل کے فیصلوں میں خُدا کے نبی کی راہنمائی حاصل کرے مثلاً (۲۔سلاطین ۳ : ۱۱)۔ عہدِ عتیق اَور دیگر پُرانے اِخلاقی ضابطوں میں اخلاقی فرائض کی ادائیگی صِرف اپنی قوم تک ہی محدُود تھی لیکن ایک مسیحی کا ایمان ہَے کہ یہ تمام ذمہ داریاں تمام بنی نوعِ اِنسان کے لِئے ہم پر عائد ہیں۔



عالمگیر سطح پر اخلاقیات کے اطلاق میں ہم اِس حقیقت سے بے بہرہ نہ رہیں کہ " خُدا کی قوم " عہدِ عتیق کا ایک ایسا نظریہ ہَے جِس کو مسیحیت نے بالکُل ترک نہیں کیا۔ عہدِ جدید میں وُہ کلیسیا جو ایک قومی گروہ تک ہی محدُود نہیں' حقیقی اسرائیل ہَے یعنی وہ لوگ جِن کو خُدا نے خُود نئے زمانے میں چُنا ہَے (۱۔پطرس ۲ : ۱۹)۔ اَب تک مسیحی علم الٰہیات میں اس بات پر تو خاصہ زور دیا جاتا ہے کہ خُدا نے اپنے لِئے لوگوں کو چُنا لیکن اسے اکثر مسیحی اخلاقیات میں نظر انداز کر دیا جاتا ہَے۔ مُقدّس یوحنّا کی تحریروں میں اس کی اِخلاقی اہمیّت کا اندازہ لگایا گیا ہَے کیونکہ اُس نے بھائیوں کی محبّت کو اہم مقام دیا ہَے حالانکہ عہدِ جدید کی یہ تعلیم ہَے کہ تمام لوگوں سے محبّت کی جائے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یوحنّا نے آدمیوں کی تنگ دِلی کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ تاہم کلیسیا کی حقیقت جِسکو خواہ ہم مسیح کا بدن کہیں خواہ خُدا کی اُمّت' سے یہ مُراد ہَے کہ اِس کے افراد کے لِئے محبّت ' وفاداری اَور ایک دُوسرے کی خِدمت کرنا فرض ہَے لیکن یہ اُس سلُوک سے متفرق ہے جو تمام لوگوں سے کرنا پڑتا ہَے لیکن کوئی ضرُورت نہیں کہ حلقۂ رفاقت میں اِن ذِمّہ داریوں کو نبھانے میں خُودغرضی کا مظاہرہ ہو۔ فِی الحقیقت یہ اس لِئے ہے کیونکہ عہدِ عتیق کی اسرائیلی قوم کی مانند کلیسیا بھی "غیر قوموں کے لِئے نُور" ہونے کے لِئے بُلائی گئی ہَے (یسعیاہ ۴۲ : ۶) اِسی بِنا پر اِس کے افراد کے ایک دُوسرے سے تعلّقات نہایت ضرُوری ہیں۔ " اگر آپس میں محبّت رکھوگے تو اِس سے سب جانیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو " (یوحنّا ۱۳ : ۳۵)۔ اِسرائیل کی حکُومتوں کے زوال اَور تنزّلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ قوم اپنی ہی فلاح و بہبُود تک محدُود تھی اور کلیسیاء کے لِئے بھی یہ آگاہی ہَے کہ وُہ عالمی زِندگی میں اپنے کردار کو ادا کرنا فراموش نہ کرے۔

اِجتماعی اِتحاد کا شعُور عہدِ عتیق کے انبیاء کو انفرادی حقوق کے تشدید

CamScanner

احساس سے نہ روک سکا اَور عبرانیوں کا بھی یہی دستوُر تھا جیسے کہ جدید جمہوریت' انفرادی طور پر لوگوں کی آزادی اَور مساوات پر زور دیتی ہے۔ تاریخ کے کچھُ ادوار میں کلیسیا نے اِس کی اہمیّت کو فراموش کر دیا ہے۔ زبُور نویس اَور انبیاء نے بھی اِس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ افراد کے ذاتی فرائض کے ساتھ اسرائیل کی تمام قوم کو اجتماعی طور پر کچھُ ذمہ داریاں ادا کرنا پڑتی تھیں بعینہٖ کلیسیا کی آج بھی وہی ذمہ داریاں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہَے کہ مُعاشرتی اَور سیاسی سوالات میں اُلجھے ہُوئے اِخلاقی مسائل کے واضح فیصلہ کے لِئے مصمّم ارادہ کرے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ آج کی کلیسیا بہُت سے اِخلاقی مسائل پر جُداگانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہَے کیونکہ ایسے مسائل سیاسی فیصلوں میں اُلجھے ہُوئے ہیں مثلاً الکحلی مشروبات اور جنگی ساز و سامان کی مُمانعت جیسی باتوں کے بارے میں ہم کلیسیا کے حلقہ میں اِس اختلاف رائے سے درگذر کرنا مُناسب سمجھتے ہیں کیونکہ یہ اِس اختلاف رائے کا ایک اٹل نتیجہ ہَے جِس کو ہم اپنی مسیحی میراث کا ایک لازمی جُز و خیال کرتے ہیں لیکن اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسیا ایک بدن کی حیثیّت سے کمالِ تابعداری سے قاصر رہی تو اِس کا یہ نتیجہ ہُوا کہ دُوسری قوموں میں اُن کی قوموں کی گواہی کی صلاحیتیں کھو کر رہ گئیں حالانکہ اِسی مَقصد کے لئے تو وُہ چُنی گئی تھی۔

## ۴۔ عہدِ عتیق کی اِخلاقیات کی خصُوصیّات

(ج) خُدا کی وُہ پاکیزگی جو نیکی سے مُنعکس ہونی چاہیئے' اُس کا بیان عہدِ عتیق میں انصاف' رحم اَور سچّائی جیسی اصطلاحات میں درج ہے۔

بعض لوگوں کا عمُوماً یہ خیال ہے کہ انصاف اَور رحم ایک دُوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں اَور انفرادی اِنصاف اِنتقام کا تقاضا کرتا ہَے جیسے کہ عہدِ عتیق میں ایک ایسا انتقام لیا جاتا رہا ہَے' حالانکہ رحم کا مطالبہ تو یہ ہے



کہ ہر قسم کی سَزا کے تقاضا کو موقوف کر دیا جائے۔ اِن دونوں میں سے کوئی دعویٰ بھی دُرست نہیں۔ یہ مُمکن ہَے کہ عہدِ عتیق کے کچھُ مُصنّفین نے اس صدی کی جنگ کے دوران یورپین مبشّروں کی طرح اپنے قومی مقاصد کو خُدا کے نیک مقصد کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ اِنتقام تو رحم کو نیست و نابود کر دیتا ہَے لیکن عام طور پر عہدِ عتیق میں بھی خُدا کے اِنصاف اَور رحم میں کوئی تضاد نہیں۔

یہ حقیقت ہَے کہ ایک مُعلّمِ اخلاق کو عہدِ عتیق میں 'اِنصاف' کا مُطالعہ کرتے ہوئے کچھُ تعجّب ہوگا کیونکہ "قضاۃ" جیسے کہ کِتاب کا نام بھی ہے مشہُور جنگجُو ہیں جو بہ نسبت قاضی کی حیثیت سے عَدالت میں فیصلہ کرنے کے' اپنے قبائل کو دُشمنوں کے حملوں سے بچاتے ہیں' تاہم اِن میں سے کچھُ ایسے بھی ہیں جو اپنی جنگی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ 'انصاف' بھی کرتے ہیں۔ عبرانی لفظ 'شافیط' جو ایک ایسے ہی جنگجُو قاضی کے لیئے استعمال کیا گیا ہَے' اُس کا وُہی مصدر ہَے جو کہ 'مشپات' کا جو قانونی فیصلہ کے معنوں میں مُستعمل ہوتا ہَے پھِر عبرانی لفظ 'نصدیقاہ' جو صَداقت کے لیئے اِستعمال کیا گیا ہَے اُردُو لفظ 'صادق' کی مانند غالباً یہ اُس مصدر سے مُشتق ہے جِس کے معنی 'رسیدھا' ہیں۔ اکثر معلُوم ہوتا ہے جیسے کہ یہ متعصبانہ طور پر بیوہ' یتیم اَور پردیسی جو آج کی طرح عام سِتم رسیدہ لوگ تھے' کی حمایت کی طرف اشارہ کرتا ہَے۔ یُوں ایک طرف تو مُنصف کے اِنصاف میں ایسے لوگوں کی فلاح و بہبُود اور دُوسری طرف قوانین کی بجا آوری کا خیال ہوتا تھا۔ راستباز خُدا اور راستباز اِنسان اُس جنگجُو قاضی کی مانند ہے جو لوگوں کی حمایت کے ساتھ ساتھ اُن کے لیئے فتوُحات بھی حاصل کرتا تھا۔ یہوواہؔ کی راستبازی کا ذِکر دبورہ کے گیت میں کیا گیا ہَے (قضاۃ ۵:۵) جِس میں محض فوجی فتوُحات کا بیان ہے اَور بعد ازاں ایک نبی کے

CamScanner

الفاظ کے مطابق "راستباز" استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے 'فاتح' لیکن اِس کا اخلاقی معنوں سے کوئی تعلق نہیں۔ (یسعیاہ ۴۹ : ۲۴)

راستبازی اور عدالت کے مختلف معنوں کی پس پُشت ایک ایسے بادشاہ کی تصویر ہے جو موجودہ قانونی عدالتوں سے مختلف طور پر عدل وانصاف کر رہا ہے۔ آج کل ہم مُنصف کے کام کو صحیح قانونی فیصلے دینے تک محدود کر دیتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ مجرم میں ذاتی دلچسپی سے فیصلہ میں تعصّب کی جھلک دکھائی دے گی۔ ایک حکمران یا مُنصف خواہ وُہ دورِ قدیم کا ہو خواہ دورِ حاضرہ کا، اُس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وُہ اپنے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ موجودہ دور میں مُنصف مجرم کو سزا دے کر اُس کی حفاظت کر سکتا ہے لیکن قدیم اسرائیل کے دستور و شرائط میں اکثر اوقات اپنے لوگوں کو دشمنوں کے ہاتھ سے بچا کر اُن کی حفاظت کرتا تھا۔ جب کبھی کسی شخص کا مقدمہ پیش ہوتا تو عادل مُنصف اُس شخص میں ذاتی دلچسپی ظاہر کرتا اور عربی بہادروں کی کہانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اچھے اور نیک دل حکمران سے کہاں تک ایسی توقع کی جاتی تھی۔ ایسی صورت حال میں کسی شخص کو بیگناہ یا راستباز ٹھہرانا ایک رسمی بریت نہیں تھی بلکہ مُنصف شخصی طور پر اُس شخص کی تصدیق کرتا تھا جس سے نہ صرف وُہ اُسے سزا سے بچاتا، بلکہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے مدد دیتا ہے۔ خُدا کا انصاف بھی اِسی قسم کا ہے خواہ وُہ سزا دے خواہ بری کر دے لیکن اِس میں گُنہ گار کے مستقبل کی بہتری اور اچھائی کی فکر مندی بھی پوشیدہ ہوتی ہے چنانچہ انسانی انصاف میں بھی ہم سے یہی توقع کی جاتی ہے۔ عہدِ عتیق میں خُدا کے رحم کا متعدد بار لفظ "حِسِد" کے استعمال سے تذکرہ ہُوا ہے۔ عُلماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہی ایک خوبی ہے جس سے خُدا اور اُس کے



لوگوں کے درمیان عہد کے تعلقات کو قانونی سزا سے نہیں بلکہ شخصی محبّت سے مستحکم و مضبوط کرتی ہے۔ ہم اس عبرانی لفظ کا 'رحم'، مہربانی یا خلوصِ عہد جیسے الفاظ سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ جب اِس لفظ کا اطلاق خدا پر کیا جاتا ہے تو اس کے معنوں میں قدرے فرق ہوتا ہے کیونکہ اُس کا 'حِسِد' اُس کے رحم و فضل میں ظاہر ہے لیکن جب اِنسان پر اِس کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اِس سے مختلف ہوگا کیونکہ اُس کا 'حِسِد' اس کی فرض شناس تابعداری میں ہے تاہم بنیادی طور پر 'حِسِد' خُدا اور اِنسان دونوں میں ایک ہی خوبی کا حامل ہے جیسے کہ ہمارا انصاف کسی فرد میں اُس کی ذاتی دلچسپی لیتے ہُوئے خُدا کے انصاف سے مشابہ ہونا چاہیئے، اسی طرح لازمی ہے کہ ہمارا اِنسانی رحم خُدا کے رحم سے مُشابہ ہو، خاص کر اِس میں استحکام و استقلال جیسی خصُوصیات کا ہونا ضروری ہے جس میں ذرّہ بھر بھی بے اصُولی اور تلون مزاجی کا عنصر نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اکثر اوقات انسانی مہربانی کے کاموں میں ایسی خامیاں ہوتی ہیں۔ عہدِ عتیق کا نظریۂ 'حِسِد' مسیح کی تعلیم معافی سے متعلق ایک پیش بندی کے طور پر ہے۔ "اس لئے کہ اگر تم آدمیوں کے قصُور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصُور معاف نہ کرے گا" (متی ۶: ۱۴-۱۵) خواہ ہم اُسے حِسِد کہیں خواہ مُعافی یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں لازمی طور پر خُدا اور اِنسان دونوں شریک ہوں تاکہ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے تعلقات مؤثر ہو جائیں۔

استحکام و استقلال کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے خُدا کی پاکیزگی کے ایک تیسرے پہلو کو ظاہر کیا ہے جس میں عہدِ عتیق میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ 'حِسِد' کے ساتھ ساتھ اَور بھی الفاظ استعمال ہُوئے ہیں جو معنوی لحاظ سے اِس سے بہت مختلف نہیں مثلاً 'عیمتھ' بمعنی 'سچائی' اور 'عیمونَاہ' بمعنی 'وفاداری' میں سے کوئی نہ کوئی لفظ 'حِسِد' کے ساتھ عہدِ عتیق کے

تیس پاروں میں پایا جاتا ہے اور یہ اِس امر کی تصدیق ہے کہ 'حِید' میں اِستقلال و اِستحکام لازمی عناصر ہیں۔ "عیمتھ" اور "عیمونا ہ" غالباً ایک ہی مصدر سے مشتق ہیں جو عہدِ عتیق میں اِن معنوں میں اِستعمال کئے گئے ہیں "جیسے کہ ماں اپنے بچّوں کی حفاظت کرتی ہے" (روت ۴ : ۱۶، یسعیاہ ۹:۴) مقدّس پُولس رُومیوں کے خط میں انجیل کے پیغام کی امتیازی پیشکش کے لیئے اپنے متن کے لیئے یہ آیت اِستعمال کرتا ہے "راستباز ایمان سے جیتا رہے گا" (حبقوق ۲ : ۴)۔ کوئی زیادہ ضرورت نہیں کہ ہم یہاں پر 'عیمونا ہ' سے وفاداری کے معنی اخذ کریں جو خُدا کی خُوبی ہے یا 'ایمان' جس میں اِنسانی اعتماد و بھروسہ کا رویّہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بائیبل کی اِخلاقیات میں تو بنیادی طور پر ایمان کا انحصار کُلّی طور پر خُدا کی وفاداری پر ہے۔ ہمارا اُس پر اعتماد ہے کیونکہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ وہ سچّا اور برحق ہے۔ (مکاشفہ ۳ : ۱۴)

آج کل پروٹسٹنٹ ماہرینِ علم الہیات کا یہ رجحان ہے کہ وہ مسیحی اخلاقیات کو علمِ الٰہی میں بہت کمتر درجہ دیتے ہیں کیونکہ اُن کے نظریہ کے مُطابق بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ "راستبازی صِرف ایمان سے ہے"۔ یہی تعلیم پُولس اور دُوسرے مصلحین کی ہے، وہ اکثر اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اِخلاقی عنصر رُوحِ رواں کی طرح کارفرما ہے۔ اِس کا انحصار خُدا کی وفاداری اور اِستقلال پر ہے جس کا ظہُور اُس کے اِنصاف اور رحم میں ہے۔ ہمیں کبھی اِس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ خُدا کی اِن خُوبیوں کے بغیر نجات کی خوشخبری کا وجُود ناممکن تھا۔ گو یہ خصُوصیات خُدا میں تو بدرجۂ اُتم موجود ہیں لیکن خُدا اور اِنسان دونوں میں یہ مُشترک ہیں۔ اِس حقیقت کو مُسلمان ماہرینِ علم الہیات فراموش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ننانوے نام جن سے وُہ خُدا کو پُکارتے ہیں اُن تمام میں اِنسانی خُوبیوں کا بھی ظہُور ہے۔ جب اِنسان خُدا سے تعلقات میں اِن خصُوصیات کے



چیلنج کا جواب دیتا ہے تو اُس کے جواب میں گو دُوسرے عناصر بھی موجُود ہیں۔ تاہم یقینی طور پر وہ اپنی زندگی میں خُدا کے اِخلاقی اوصاف کو بھی قبُول کرتا ہے۔ وہ اِس نعمت کو بعض اوقات لاشعوری طور پر حاصل کر لیتا ہے اور بعض اوقات اراداتاً تقلید سے۔ خُدا کا اِنصاف اِنسانی اِنصاف کا اور اُس کی مُعافی اِنسانی معافی کا مُطالبہ کرتی ہے جیسے کہ مسیح یسوع نے نے مُعاف نہ کرنے والے نوکر کی تمثیل میں سکھایا (متی ۱۸ : ۲۳ - ۳۵)۔ خُدا کی وفاداری کا جواب جب عہدِ جدید کے ایمان میں مِلتا ہے تو یہ اپنے تمام اِخلاقی مافیہ کو کھو نہیں دیتی۔ یہ نہ محض اخلاقیات اور مذہب کے مابین اور علم الٰہی اور اخلاقیات کے درمیان ایک علمی قیاس ہے بلکہ جب ہم انجیل کی بشارت میں لوگوں کو خُداوند یسُوع مسیح پر ایمان لانے کے لیئے بُلاتے ہیں تو اُس وقت درحقیقت ہم انہیں اُس اِستقلال اور اعتماد میں شریک ہونے کے لیئے دعوت دیتے ہیں جسے خُدا نے بائیبل کے تمام مکاشفہ میں ظاہر کیا ہے۔ ایمان ایک ہی دفعہ کا فیصلہ نہیں بلکہ یہ اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جیسے کہ یہ کسی مسئلہ کو عقلی طور پر قبول کرنے سے کہیں زیادہ ہے۔ ایمان تہ دل سے خُدا کی وفاداری ہے اور ایسی وفاداری جو خُدا کی طرف سے ہمیں ودیعت کی گئی ہے اور روزمرّہ کی زندگی میں کارفرما ہے۔ آج کل ہمیں اِس بات کی ضرُورت ہے کہ ہم اپنی بشارت اور عملی زِندگی میں اِس حقیقت کو اپنائیں کہ ایمان اور وفاداری دونوں لازم و ملزُوم ہیں جس کی جڑ عہدِ عتیق کی تعلیم میں موجُود ہے۔

---

## پانچواں باب

# مسیح کا نمونہ

### ۱۔ کتابِ مُقدّس کی تعلیم

عہدِ جدید اَور مسیحی مُعلّمینِ اخلاق کی ہمیشہ یہ واضح اور صاف تعلیم رہی ہَے کہ اپنے کردار اور اعمال کے مخصُوص طریقوں میں ہم مسیح کی تقلید کے لئے بُلائے گئے ہیں بعض اوقات تو مسیح خداوند نے واضح طور پر کہہ دیا مثلاً جب اُس نے اپنے شاگردوں کو مسیحی اخلاق کی اُن خصُوصیات کو ظاہر کرنے کے لیئے کہا جن کا اُس نے خود نمونہ دیا مثلاً وہ محبّت کا ایک نمونہ تھا "مَیں تمہیں ایک نیا حکم دیتا ہُوں کہ ایک دُوسرے سے محبّت رکھّو کہ جیسے مَیں نے تُم سے محبّت رکھّی تم بھی ایک دُوسرے سے محبّت رکھّو" (یوحنّا ۱۳ : ۳۴)۔ وہ حِلم کا نمونہ تھا "میرا جُؤا اپنے اُوپر اُٹھا لو اَور مُجھ سے سیکھو۔ کیونکہ میں حلیم ہُوں اَور دِل کا فروتن۔ تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی" (متی ۱۱ : ۲۹)۔ وُہ خُود انکاری کی ایک عجیب مثال تھا جس کی حقیقت اُس کی صلیب میں پوشیدہ ہَے "اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اَور اپنی صلیب اُٹھائے اَور میرے پیچھے ہولے۔" (مرقس ۸ : ۳۴)۔ مسیح خُداوند کے لیئے رسُولی گواہی ہمارے لیئے نمُونہ کی حیثیت سے یکساں طور پر واضح ہے۔ مقدّس پُولس نصیحت کرتا ہے کہ ہمیں اراداتاً مسیح خُداوند کے نمُونہ پر چلنا ہَے جس کے لیئے وُہ یوں رقمطراز ہے "تُم میری مانند بنو جیسا مَیں



مسیح کی مانند بنتا ہُوں" (۱۔ کرنتھیوں ۱۱ : ۱)۔ مقدّس پطرس ستم رسیدہ مسیحیوں کو حُکم دیتا ہے کہ وُہ اپنی تکلیفوں کے لمحات میں مسیح یسوع کے نمُونہ پر غور کریں "مسیح بھی تُمہارے واسطے دُکھ اُٹھا کر تمہیں ایک نمُونہ دے گیا ہے تاکہ اِس کے نقشِ قدم پر چلو۔ نہ اُس نے گناہ کیا اور نہ اُس کے مُنہ سے کوئی مکر کی بات نکلی۔ نہ وُہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا اَور نہ دُکھ پا کر کسی کو دھمکاتا تھا بلکہ اپنے آپ کو سچّے انصاف کرنے والے کے سپُرد کرتا تھا" (۱۔ پطرس ۲ : ۲۱ - ۲۳)۔ مُقدّس یوحنّا کے خیال کے مُطابق مسیح سے مُشابہت پیدا کرنا ہی مسیحی زِندگی کا نصب العین ہے۔ "ہم جانتے ہیں کہ جب وُہ ظاہر ہوگا تو ہم بھی اُس کی مانند ہوں گے۔ کیونکہ اُس کو ویسا ہی دیکھیں گے جیسا وُہ ہے، اَور جو کوئی اُس سے یہ اُمید رکھتا ہَے، اپنے آپ کو ویسا ہی پاک کرتا ہَے جیسا وہ پاک ہَے" (۱۔ یوحنّا ۳ : ۲ - ۳)۔ اُس وقت سے لے کر آج تک حقیقی دِیندار مسیحیوں نے مسیح خُداوند کے نمُونہ پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ مسیحی پرہیزگاری کی عظیم کتابوں میں سے ایک کتاب بعنوان "تقلید المسیح" موجُود ہے۔ اپنی زندگیوں کو مسیح کی زِندگی پر چلانے کی کوششیں ہمارے بُہت سے مشہُور کلیسیائی گیتوں اور دُعاؤں میں موجُود ہے۔ یہاں پر رومن کاتھولک کی "نماز کی کتاب" میں سے ایک مثال درج ہے۔ "اے خُدا! تُو جس نے اپنے بیٹے کو ہمارا نمُونہ بننے کے لیئے ہمیں بخش دیا تاکہ وُہ ہماری کمزوری میں اُس راستہ پر چلنے میں مدد کرے جو زِندگی کو پہنچاتا ہے، توفیق دے تاکہ اُس کے شاگرد بننے کے لیئے اُس کے نقشِ قدم پر چلیں اس کے نام کی خاطر سے۔"

### ۲۔ مسیح کے نمُونہ پر چلنے میں مُشکلات

مسیح خداوند کی پیروی کرنا گو ایک آسان کام نہیں، تاہم ہمیں اُن

لوگوں کے اعتراض کا جواب دینا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "تواریخی یسُوع تک پہنچنا ایک مایُوس کُن اَور گمُراہ کُن کوشش ہے۔" دورِ حاضرہ کے عُلماء کے خیال کے مُطابق جب اناجیل پہلی صدی کے آخر میں تحریری صُورت میں پیش ہُوئیں تو اُس وقت ضرُور ایسے بہُت سے مسیحی ہوں گے جو اپنی رُوحانی ضرُوریات کے لیئے نہ صِرف عبادت کی کِتابوں کو چاہتے تھے بلکہ مسیح یسُوع کی زمینی زِندگی، نمُونہ اَور تعلیم کے لیئے مزید معلُومات حاصل کرنے کے خواہاں تھے "اُس سے تُم بے دیکھے محبّت رکھتے ہو۔" (مقدّس پطرس کے قارئین کی طرح) (۱۔ پطرس ۱ : ۸) اُس وقت ایسے لوگ تاحال زِندہ تھے جو مسیح خُداوند کی خِدمت کے چشم دید گواہ ہونے کی حیثیّت سے اناجیل کے بیانات کی صحت و دُرستی کو جانچ سکتے تھے۔ نہ صِرف اُس وقت بلکہ آج کل بھی اناجیل میں مسیح یسُوع کی تاریخی تصویر کے مُستند ہونے میں کسی کو شبہُ نہیں۔ فرانس کے ایک دہریہ تاریخ دان رِناں نے اِس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ یوحنّا کی انجیل جس پر بہُت حد تک تنقید کی گئی ہے، تواریخی ماخذ کے لحاظ سے سقراط کی تعلیم اَور اُس کی زِندگی کے مُتعلق مواخذ سے اعلیٰ ہے۔ ہم قدیم تاریخ مغرب میں صِرف چار ایسے اشخاص سے واقف ہیں جن کی زِندگی نمُونہ کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے یعنی سقراط، سسرو، مسیح یسُوع اور مُقدّس پُولس لیکن اس حقیقت کو غیر مسیحی بھی تسلیم کریں گے کہ اِن چاروں میں سے دُوسروں کے لیئے اعلیٰ ترین نمُونہ مسیح یسُوع ہے۔

ہم میں سے جو اناجیل کے بیانات کو محض تاریخی حیثیّت سے قبُول کرتے ہیں اُنہیں ضرُور تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسیح خُداوند نے جن حالات کے تحت زِندگی بسر کی اَور اُس کا مخصُوص طرزِ زِندگی اِتنا مُختلف تھا کہ ہماری اپنی زِندگی کے مخصُوص حالات کے لیئے اناجیل میں سے 'نمُونہ'



ڈھونڈنا مُشکل ہے اَور جو کچھ ہمیں بتایا گیا ہے اُس میں سے مسیح کی زِندگی کو نمُونہ بنانا ابھی تک قابِلِ اعتراض ہے۔ ہم مسیح کی زِندگی کے پہلے تیس سال کے بارے میں یعنی تقریباً اِس کی ساری زِندگی کا ۹/۱۰ حِصّہ بہت کم جانتے ہیں۔ بیشک وُہ بارہ سال کا تھا جب ہیکل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اُس کے کِردار پر کافی روشنی ڈالتا ہے لیکن اِس کے علاوہ ہم صِرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کا تابع رہا اَور حکمت اور قدوقامت میں اَور خُدا کی اور اِنسان کی مقبُولیّت میں ترقّی کرتا گیا اَور غالباً بالغ ہونے کے بعد اُس نے بڑھئی کا کام کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے کبھی آرزُو کی ہے کہ مسیح خُداوند کی اُس تابعداری میں سے جو اُس نے زمینی والدین کے ساتھ دکھائی، اخلاقی نمونے تلاش کریں؟ لیکن قاری مسیح کے بارہ سال کی عمُر پر یروشلم میں واقعہ سے یہ تأثر نہیں لے گا کہ اُس نے اپنے والدین کا حُکم بغیر سوال کئے قبُول کیا۔ کیا کبھی مبّشروں نے اِن پاکیزہ تصوّرات کو بیان کرنے میں دِلچسپی ظاہر کی کہ مسیح خُداوند نے اپنی ماں کا بوجھ اُٹھایا اَور اپنی بڑھئی کی دوکان میں ملائم جوئے بناتا تھا۔ جب ہم اُس کی خاص خدمت پر غور کرتے ہیں تو اناجیل جن باتوں پر زور دیتی ہیں وُہ اُس کی مُعجزانہ قُدرت ہے۔ ہم اِس بات کو کبھی فراموش نہ کریں کہ اُس کی تعلیم اختیار اَور حقیقت کے لحاظ سے فوق الانسانی تھی اَور اِس سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے کہ یہ براہِ راست خُدا کی طرف سے دی گئی ہے۔ اِس کی خدمت میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خاندانی رشتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ ایک مُبّشر کی حیثیّت سے بے خانماں زِندگی بسر کرتا ہے۔ یہ وُہ باتیں ہیں جن میں شریک ہونے کے لیئے ہمیں بہُت کم دعوت ہے لیکن بعض شریک ہو بھی سکتے ہیں۔ یہ اِس لیئے ہے کہ مُعجزے دکھانے کی قطعاً ہم میں قوّت نہیں اور نہ ہی

براہِ راست خُدا کی طرف سے ہم نئی تعلیم دے سکتے ہیں۔ مزید برآں اُس کے دُکھوں، موت اَور قیامت کی کہانی بالکُل لاثانی ہے اور عملی طور پر اُس کو کبھی بھی دُہرایا نہیں جا سکتا۔ ہاں البتہ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ مسیح یسُوع کی زِندگی میں ایسے بہُت سے واقعات تھے جو ہمیں عظیم مثالیں بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا یقین ہے کہ بہُت سے دیانتدار لوگوں کو پہلی نظر میں اِس کہانی کو مکمّل طور پر پڑھتے ہوئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ایک ایسی زِندگی ہے جو اُن کے لیئے نہیں ہے۔

اِس سے بڑھ کر ہمیں کہیں یہ نہیں کہہ دینا چاہیئے کہ اناجیل میں ایسے واقعات بتائے گئے ہیں جہاں کہ مسیح خُداوند کے نمُونہ پر گو ہم چل سکتے ہیں لیکن نہیں چلنا چاہیئے۔ دینِ اِنسانی کے ایک مشہُور پیرو نے مسیح خُداوند کے فریسیوں کو ملامت کرنے پر تنقید کی ہے مثلاً متی ۲۲ باب میں یہ ایک طرح سے مسیح خُداوند کی اپنی تعلیم "یعنی شریر کا مُقابلہ نہ کرو، اَور دُوسروں کی عیب جوئی نہ کرو" کے متضاد ہے لیکن ہم اُس کی تنقید کے جواب میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہاں اگر مسیح یسُوع ایک عام اِنسان ہوتا اور اِس کے ثبُوت میں اناجیل بھی تمام حقائق بہم پہنچاتیں تو یہ تنقید کافی حد تک بجا تھی لیکن مسیح خُداوند تو نہ صِرف اِنسان تھا بلکہ وُہ خُدا بھی تھا اور خُدا ایسے سے کام کرتا تھا خاص کر جیساکہ یوحنّا کی انجیل زور دیتی ہے کہ مسیح یسُوع خُدا کے عدالتی کام میں بھی شریک ہے۔ مسیح یسُوع جسے عِلم تھا کہ انسان میں کیا ہے؛ وُہ اِنسانوں کی عدالت کے لیئے مقرر کیا گیا کیونکہ وُہ تو ایسی باتیں کہنے اور کرنے میں حق بجانب تھا جنہیں ہم نہ تو کہہ سکتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ مزید برآں اکثر ہم ایسے حالات سے واقف نہیں جن کے تحت مسیح یسُوع نے باتیں کیں اور بعض اوقات اُس کی آواز کا لب و لہجہ ہمارے ذِہن میں مختلف خیالات پیدا کرنے کا باعث بن



جاتا ہے مثلاً جب مسیح خُداوند نے مُضطرب و پریشان عورت سے کہا۔ "پہلے لڑکوں کو سیر ہونے دے کیونکہ لڑکوں کی روٹی لے کر کُتّوں کو ڈال دینا اچھا نہیں" (مرقس ۷: ۲۷)۔ سطحی نظر میں اُس کے الفاظ سے یُوں ظاہر ہوتا ہے کہ خُداوند نے اُس عورت سے بہُت ہی ظالمانہ رویّہ اختیار کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اِس لہجہ سے یہ بات کہی کہ وہ عورت بیدار ہو گئی اَور اُس نے نہایت موزُوں جواب دیا۔ مارٹن لُوتھر خُداوند کے الفاظ کو 'ضرب خُداوندی' کے نام سے پُکارتا ہے جس کے وسیلہ سے اُس عورت نے مسیح خُداوند کو اُس کے اپنے الفاظ میں پھنسا دیا۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اُس وقت مسیح خُداوند کا یہ کہنا بجا تھا لیکن اِن الفاظ کی تقلید کرنا ہمارے لیئے کبھی نمُونہ نہیں بن سکتا۔

مسیح کی تقلید میں ایک اور بھی اندیشہ ہے کہ اگر تمام مسیحی خُداوند کے نمُونہ پر بہُت پابندی سے چلیں بھی، تو مسیح خُداوند کی زِندگی اَور اُن کی زِندگیوں میں اِک بے کیف سی یکسانیّت پائی جائے گی۔ بجائے اخلاقی سنجیدگی اور سرگرمی کے، پیورٹین لوگوں اور اِسلام میں وہابیوں نے بالکُل غیر ضرُوری چیزوں کو اپنانے کی کوشش کی جس سے مذہب بے کیف ہو کر رہ گیا۔ شاید یہ ہمارے لیئے بہُت فائدہ ہے کہ ہم خُداوند کی عام زندگی کو جو اُس نے گھر اور اپنے کام میں بسر کی، بہُت کم جانتے ہیں اور اِسی کم علمی کے باعث اِس آزمائش سے بچ جاتے ہیں کہ ہم اپنے تمام کاموں میں خُداوند کے کاموں سے مُطابقت اور یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہم جو کچُھ مسیح خُداوند کی زِندگی سے مُتعلق جانتے ہیں وُہ ایک ایسا مُتفرق نمونۂ حیات ہے جسے اختیار کرنے میں مسیح کا ایک وفادار سے وفادار شاگرد بھی اپنی زندگی میں اُس کے چند اِمتیازی اوصاف کو اپنا سکے گا۔ مسیح یسُوع کی جدّت پسندی پر ہم بھی تعجّب کرتے ہیں جیسے کہ اُس کے اپنے ایّام میں لوگ حیران تھے

اور خاص کر اسی جدّت پسندی سے یہودی راہنماؤں کو سخت دھچکا لگا کیونکہ اُس کا رویّہ عموماً دُوسرے معزّز اور پرہیزگار لوگوں جیسا نہ تھا۔ اِس جدّت پسندی کے نمُونہ سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پَولس کے بیان کے مُطابق خدا کے فرزند ہونے کی حیثیّت سے ہمیں "جلال کی آزادی" حاصل ہے اور ساتھ ساتھ ہم مسیح کے نمُونہ کی پیروی کے لیئے بھی بُلائے گئے ہیں۔ شاید یہ مسیحی مبّشروں کی ایک کمزوری ہے کہ وہ اپنے نومُریدوں کو روایتی نمُونہ پر چلانا چاہتے ہیں اور مشنری اُستادوں کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے شاگرد اُن خوُبیوں کو ظاہر کریں جو اُن کے خیال کے مُطابق امتیازی مسیحی خوُبیاں ہیں۔ ہم یہ بھی بھُول جاتے ہیں کہ مسیح کے نمُونۂ حیات میں سے دُوسرے لوگ کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں، جسے ہم حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

## ۳۔ تجسّمِ مسیح ایک نمُونہ کی حیثیّت سے

مسیح کے ایک شاگرد کے لیئے اُس کی تقلید کے لیئے نہ صرف اُس کے واقعاتِ حیات اور نہ ہی زمینی خِدمت میں چیلنج پایا جاتا ہے بلکہ اُس کی اپنی اُلوہیت میں اپنے آپ کو خالی کرنے کے عظیم کارنامہ میں جو اُس کی پیدائش سے شرُوع ہو کر اُس کی صلیب میں اپنے عرُوج کو پہنچا۔ بالکل یہی حقیقت ہے۔ جسے مُقدس پولُس ایک مثال کے طور پر اپنے خطُوط میں استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے قارئین کو مسیح کی تقلید کے لیئے دعوت دے (فلپیوں ۲ : ۱-۸ ، ۲۔ کرنتھیوں ۸ : ۸-۹)۔ فلپی کے مسیحی بیکدل نہ تھے بلکہ غالباً وُہ بے سُود کلیسیائی جھگڑوں میں اُلجھے رہتے جن سے اَب بھی مسیحی کلیسیا کی زِندگی برباد ہو جاتی ہے۔ ہماری توقع کے مُطابق پولُس نے اُنہیں وُہ مثال نہیں دی جب مسیح خُداوند نے اپنے شاگردوں کے جھگڑے کو



نپٹایا یعنی اُس وقت جب اُنہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُنہیں بتایا جائے کہ اُن میں سے کون بڑا ہے۔ بلکہ اُس نے یہ مثال استعمال کی "مسیح یسُوع اگرچہ خُدا کی صُورت پر تھا۔ خُدا کے برابر ہونے کو قبضہ میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صُورت اختیار کی اور انسانوں کے مُشابہ ہو گیا اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی۔" وہ لوگ جو مسیح کے اپنے آپ کو خالی کرنے کے نمُونہ کی تقلید کریں گے، وُہ کبھی بھی کلیسیائی فضُول جھگڑوں میں شریک نہ ہوں گے۔

اِس طرح پَولس جب کرنتھی مسیحیوں کو یروشلم کے غریب بھائیوں کی مدد کے لیئے چندہ دینے کی ترغیب دلا رہا تھا تو اُس وقت ہماری توقع کے مُطابق اُس نے وُہ مثال استعمال نہیں کی جب مسیح خُداوند نے بیوہ بُڑھیا کی دو دمڑیوں کی تعریف کی بلکہ اپنے قارئین کو یاد دلاتا ہے کہ مسیح یسُوع نے لوگوں کے درمیان آنے کے لیئے کیا کچھ چھوڑا "کیونکہ تم ہمارے خُداوند یسُوع مسیح کے فضل کو جانتے ہو کہ وُہ اگرچہ دولت مند تھا مگر تُمہاری خاطر غریب بن گیا تاکہ تُم اُس کی غریبی سے دَولت مند ہو جاؤ" (۲۔ کرنتھیوں ۸ : ۹) جو کچھ مسیح نے کیا ہے وُہ شُکرگزاری کے طور پر اُن کے ہدیہ کا محرّک ہے۔ اور مسیح کی قُربانی اُن کے ہدیہ دینے کے لیئے ایک نمُونہ ہے۔

جب ہم مسیح کے ساتھ اپنے آپ کو خالی کرنے کے خاص تجربہ میں شریک ہوتے ہیں تو ہمارا یہ عمل مسیحی اخلاقیات کے بہُت قریب تر ہے لیکن یاد رہے کہ اِس کے بغیر مسیح کی قدم بہ قدم تقلید بے سُود ہو گی۔ گو ہم لفظی طور پر مسیح کی اِس طرح پیروی کریں لیکن اگر حقیقی تقلید کی رُوح نہ ہو تو یہ ایک بے جان مجسّمہ بن کر رہ جائے گی۔ ایسی رُوح کے بغیر حیاتِ مسیح کی تفصیلات کی تقلید کی کوشش کرنے سے ہم فریسیوں کی سی شریعت پرستی میں پھنس

جائیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تجسّم میں مسیح کا اپنے آپ کو خالی کرنا اور اُس کا کفارہ ہماری اِنسانی فِطرت اور ہمارے فہم وادراک سے اِتنے بالا ہیں کہ اُن کی تقلید کا خیال ذہن میں لانا کُفر کے مُترادف ہے۔ تاہم مسیحی خُوشخبری کی یہ مرکزی تعلیم ہے کہ خُدا کے فضل سے گُنہ گار شخص مسیح کی موت اور قیامت میں شریک ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔ عِلم اِلٰہی کے مسئلہ کی حیثیت سے تو ہم اسے قبُول کر لیتے ہیں لیکن کیا اُس وقت بھی ہمارے ذہن میں یہ بُنیادی خیال ہوتا ہے جب ہم کلیسیائی جھگڑوں میں اُلجھ جاتے ہیں یا جب مُختاری کی مہم میں ہمیں اَور زیادہ چندہ دینے کے لیئے کہا جاتا ہے۔

## ۴۔ مسیح کا طرزِ زِندگی

جب ہم مسیح کی زمینی زِندگی کے نمُونہ پر غور کرتے ہیں تو فرانسیسی مفکّر کے خیال کے مُطابق ہمیں اُس کی زِندگی کے مفصّل واقعات کی بجائے اُس کے 'طرزِ زِندگی' کی تقلید کرنا چاہیئے۔ یہ مصنّف اِس حقیقت کا اِنکشاف کرتا ہے کہ ہمارا موجُودہ طرزِ زندگی اِس لحاظ سے بھی مسیح کے طرزِ زِندگی سے مُختلف ہے کیونکہ ہماری یہ مسلسل خواہش ہے کہ ہم کِسی چیز کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اَور اِس کے نتیجہ میں ہم ایک ایسی غُلامی میں ہیں اَور ہم ہر وقت ایسے ذرائع ڈھُونڈتے رہتے ہیں جِس سے ہم اِسے پُورا کر سکیں۔ موجُودہ دَور میں اِنسان کا یہ نظریہ ہے کہ اچھّی زندگی سے مُراد کِسی مقصد کو حاصل کرنا ہے مثلاً زمین حاصل کرنا، اپنے خاندان کے لیئے گھر تعمیر کرنا، کِسی سکُول کی بُنیاد رکھنا یا کِسی کتاب کی تصنیف کرنا۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیئے زیادہ سے زیادہ ذرائع کی ضرُورت ہے اَور سب سے بڑا ذریعہ 'روپیہ' ہے۔ ہمارے خُداوند نے اپنی زِندگی میں نہ تو کوئی ادارہ قائم کیا، نہ کوئی



کِتاب لِکھّی، نہ ہی پانچ سالہ منصُوبہ بنایا بلکہ جو کُچھ ہم دیکھ سکتے ہیں، وُہ یہ ہے کہ اُس نے چند گنہگاروں اَور بیماروں کی مدد کی جو صحت و تندرستی حاصل کرنے کے باوجُود بھی دوسرے آدمیوں کی طرح مَر گئے اَور علاوہ ازیں اُس نے چند دوست اکٹھے کِئے جو خطرہ کے لمحات میں اُسے چھوڑ گئے۔ ہم اِس دور میں پہلی صدی عیسوی کی گلیل کی سَادہ سی زِندگی بھی اختیار نہیں کر سکتے لیکن بعض اوقات ہمارے لیئے یہ مُناسب ہے کہ ہم یاد کریں کہ مسیح خُداوند نے نہ تو کوئی کمیٹی بنائی، نہ ہی کوئی سیکرٹری رکھے، نہ ہی اسکے پاس دفتری سامان تھا اَور نہ ہی کوئی عمارتیں اور اَدارے تھے۔ ہاں البتّہ یہ وسیع تنظیم موجُودہ دَور کا ایک حِصّہ ہے اور اگر مسیحی کلیسیا اس کا صحیح اِستعمال نہ کرے تو یہ بے سُود ہوگا۔ ہمیں اس حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دورِ حاضرہ کے ایک ماہرِ عُمرانیات نے معلُوم کیا ہے کہ اِن چیزوں میں ایک طبعی رُحجان ہے کہ کِسی کو حقیقی فائدہ پُہنچائے بغیر غیر معیّن طور پر اپنے آپ کو بڑھاتی جاتی ہیں۔ یقیناً مسیح نے ایسے کام کیئے کہ اُس نے بیماروں کو شفا دی، لوگوں کو تعلیم دی اَور حاجتمندوں کی مدد کی لیکن اُس کی زِندگی میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے "کام محض کام کی خاطر کیا" حالانکہ موجُودہ دور میں لوگوں کی یہ ایک خُوبی ہے۔ اُس کیلئے زِندگی اہم تھی اور ایک ایسی زِندگی جِس میں خُدا کی حقیقت کا مسلسل احساس وشعُور اور اُس کی مرضی کی تابعداری ہو۔ چونکہ موجُودہ دَور میں لوگوں کو خُدا کا بہُت کم احساس ہے اِس لیئے ہم ہر وقت ایک عام اَور مسلسل مصرُوفیّت میں اُلجھے رہتے ہیں۔ فرانسیسی مفکّر کے نظریہ کے مُطابق ایک حقیقی مسیحی کام کی تصویر بائیبل میں موجُود ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے" جیسا کہ گیہوں کا پودا جو بڑھتا ہے، آٹا میں خمیر جو اپنا کام کرتا ہے اَور روشنی جِس سے تاریکی دُور ہو جاتی ہے۔ ہم اپنی زِندگی کے لیئے نمُونہ اُس کے کاموں میں نہیں بلکہ

اُس کی شخصیّت میں پاتے ہیں۔ میرے اپنے تجربہ میں گذشتہ نسل کے مسیحی جن کی گواہی بہت مؤثر رہی ہے، وُہ نہ تو اتنے عظیم مُنتظم تھے اور نہ ہی معمار اور انجمنوں میں تجویزیں بنانے والے (حالانکہ ایسے لوگوں کی کلیسیا اور مُلک میں عزّت ہوتی ہے) بلکہ یہ وُہ لوگ تھے جن کی روزمرّہ کی زندگی میں مسیح کی کُچھ خُوبیاں موجُود تھیں۔

بعینہٖ ہمارے خُداوند کے طرزِ زندگی میں ایک ایسی خُوبی تھی جسے ہم حقیقت کہتے ہُوئے بھی صحیح طور پر بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ کُچھ اِس طرح سے ہے کہ یہ خُوبی فریسیوں کی خصُوصیات کے مُتضاد تھی اور یہی وُہ خُوبیاں تھیں جن کی بناء پر ہمارے خُداوند نے اُنہیں ریاکار کہہ کر پُکارا۔ یاد رہے کہ یہ فریسی کوئی دُنیاوی آدمی نہ تھے جو جھُوٹ مُوٹ اپنے آپ کو مذہبی جتانے کا دعوےٰ کرتے تھے بلکہ یقیناً وُہ مذہبی تھے۔ بُنیادی طور پر اُن کی زندگی میں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وُہ دُنیا کے سامنے ایک پاکباز یہُودی کی تصویر پیش کرتے کیونکہ عہدِ عتیق کی عظیم رُوحانی حقیقتوں کی اُس وقت تک کوئی وُقعت نہیں جب تک یہ فریسی دُنیا کو تفصیلاً نہ بتائیں کہ ایک حقیقی مذہبی شخص کی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ مسیح خُداوند خُود اِس سے بہت مُختلف تھا۔ وہ صریحاً مسلمہ مذہبی دستُوروں یعنی سبت کو ماننے، رسمی طور پر ہاتھ دھونے اور اپنے حلقۂ ارباب کے لیئے قدرے لاپرواہ تھا۔ اُس کا مذہب ظاہری نہیں تھا بلکہ حقیقی اور غیر اِرادی تھی جس کا تعلّق خُدا اور بنی نوعِ انسان کی محبّت سے تھا۔ پیشہ ور مذہبی لوگوں کی طرح وہ القابات کے اِستعمال سے بھی گریز کرتا تھا۔ حتیٰ کہ کافی عرصہ تک اُس نے اپنے "مسیح" ہونے کو صیغۂ راز میں رکھا اور اکثر جو نام وُہ اپنے لئے اِستعمال کرتا تھا، یعنی "ابنِ آدم" کُچھ اِتنا ذُو معنی ہے کہ عُلماء ابھی تک اِس بحث میں ہیں کہ اُس کا کیا مطلب ہے؟ القابات کا یہ خطرہ ہے کہ اِنسان بجائے خُدا



کی مرضی پر چلنے کے ان القابات کے مُطابق زِندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ جب ہم پاسبان، ایلڈر یا ڈیکنس کے عُہدہ پر فائز ہوتے ہیں تو ہمیں اِتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم ساری دُنیا کے لیئے ایک تماشا ہیں (اِس میں حقیقت بھی ہے) اور یہاں ایک حقیقی خطرہ بھی ہے کہ ہم اِس بات کے بارے میں فِکرمند ہوں کہ دُنیا ہم میں کیا دیکھتی ہے حالانکہ مسیح نے اِس بات کا ہرگز خیال نہیں کیا۔ خُداوند ظاہری صُورت پر نہیں بلکہ دِل پر نظر کرتا ہے۔ (۱۔ سموئیل ۱۶ : ۷)

مسیح کے طرزِ زندگی میں ایک اور نمایاں خُوبی ہے کہ وہ انفرادی طور پر لوگوں میں دِلچسپی لیتا ہے۔ حتےٰ کہ اُن میں بھی جو اُسے راہ کے کِنارے مِلے۔ دُوسرے لوگوں کی فِکر میں یہ امکان ہوتا ہے کہ یہ پیشہ ور نیک کام کرنے والوں کی ناجائز مُداخلت کی طرح بن جاتی ہے لیکن مسیح خُداوند میں کبھی ایسا نہ تھا۔ یہ اُن دو خصُوصیّات کی بنا پر تھا جو ہم بیان کر چُکے ہیں کہ وُہ کام محض کام کے لیئے نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کی مذہبی سرگرمیوں میں حقیقت اور بے ساختگی جھلکتی تھی۔ ہم کبھی یہ خیال نہ کریں کہ مسیحی محبّت سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ وُہ ہمدردی جس کے تحت ہم تمام بنی نوعِ اِنسان کی بہتری کے خواہاں ہیں۔ بلکہ اِس سے یہ مُراد ہے کہ وُہ خاص محبت جس کے تحت ہم اِنفرادی طور پر لوگوں کو پیار کرتے ہیں جو ہماری اِنسانی محبّت کا ایک لازمی جُزو ہے۔ بہُت سے ماہرینِ علمِ الٰہیات نے محبّت کو ایک غیر اِنسانی طریقہ سے سوچا ہے جو یقیناً وُہ محبّت نہیں جو یسُوع نے ظاہر کی اور جس کی تصویر اناجیل میں ہے۔ یہ تھی اُس کی محبّت، جس نے ایک بچّے کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا، جس نے مریم اور مارتھا کی خصُوصیات کو سراہا، جو چھوٹے قد کے زکائی محصُول لینے والے کی گرویدہ ہو گئی، اور جس نے اپنی ماں کے لیئے زمینی گھر کا اور صلیب پر اپنی اذیّت کے

وقت ڈاکو کے لیئے آسمانی گھر کا خیال رکھا۔ ہمارے لیئے یہ بہت آسان
ہے کہ ہم اپنے بڑے بڑے اداروں میں اپنا شخصی تعلق کھو دیں جہاں کہ ہمارا
بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور خاص کر اُس وقت جب ہم
اپنا بہت سا وقت تنظیم اور مالیات میں گذار دیں جو مسیح کی پیروی سے
برگشتہ کرنے کے لیئے شیطان کی اپنی تدبیریں ہیں۔ تاہم ضرورت ہے کہ
ہم اُس کے بہت سے کاموں کی تقلید کریں۔

مسیح یسوع کے طرزِ زندگی میں اور دوسری خصوصیات بھی تھیں
جن کے لیئے عہد جدید کی تعلیم ہے کہ ہم اُنہیں نمونہ کے طور پر استعمال کریں۔
مثلاً شکایات وانتقام کے بغیر مسیح خُداوند کا لعن طعن اور ظلم وستم کو برداشت
کرنا ایسی خصوصیات تھیں جن سے مقدس پطرس متاثر ہُوا۔ مسیح خُداوند نے
اپنے شاگردوں کو دِل کے حلیم ہونے کی بھی تعلیم دی لیکن اس سے یہ مُراد
نہیں کہ ہم ڈرپوک بن کر ہر ایک سے ڈرتے رہیں بلکہ اِس میں ایک ایسی
انکساری ہے جو ادنیٰ خدمت میں مُطمئن ہے اور ایسی خدمت ہی حقیقی خدمت
کہلانے کی مُستحق ہے۔ دِل کی پاکیزگی اُن لوگوں کے نصب العین کی وحدت
سے پیدا ہوتی ہے جو مسیح کے نظریہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ہماری مسیحی
فرمانبرداری ایسی ہے جیسے کہ بیل جوتے میں جُتنے کے لیئے اپنا سَر جُھکا
دیتا ہے یا جیسے مجرم اپنی صلیب کو اُٹھا کر مقتل تک لے جاتا ہے۔ اِن تمام
خصوصیات کا تعلق اپنے آپ کو خالی کرنے یا اپنی خودی سے انکار کرنے
سے ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیح خُداوند نے اپنے آپ کو یہاں تک
خالی کر دیا کہ وُہ اپنی کامل محبت کے تحت ہم انسانوں کی نجات کے لیئے
آسمان پر سے اُتر آیا۔

اِسی طرح ہم مقدس مرقس کے بیان میں دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ہمارے
خُداوند نے کفرنحوم میں سبت گذارا (مرقس ۱: ۲۱-۳۹)۔ یہ بھی ہمارے



لئے باعثِ تقلید ہے کہ ہمیں اتوار کا دِن کس طرح بسر کرنا ہوگا لیکن یہ ایک
ایسا نمونہ تھا جسے اُس وقت کے فریسیوں نے قطعاً پسند نہ کیا اور میرا خیال
ہے کہ اِن ایام میں بھی سبت کو ماننے والے اِسے پسند نہیں کریں گے۔ گو ہم یہ
معذرت پیش کر سکتے ہیں کہ یہ تو یہودی سبت تھا لیکن اگر ذرا غور سے
دیکھیں تو کیا ہم اس میں اتوار کے دِن کی تصویر نہیں دیکھ سکتے کہ ہم اُسے
کس طرح بسر کریں۔ یعنی یہ کہ یہ ہمارے لیئے کلیسائی عبادت کا، مسیحی رفاقت
اور ایک دوسرے کی مہمان نوازی کا اور اس سے بڑھ کر دوسروں کی مدد کا
دِن ہے، یہاں تک کہ ایسی خدمت کے لیئے ہمیں رسمی طریقوں کو بھی توڑنا
ہوگا۔

بائیبل کا ایک مُخلص ترین طالب علم اناجیل کے مطالعہ سے اُن کے ہر صفحہ
پر ایسے واقعات دیکھے گا جن میں مسیح کے نمونہ کا کوئی نہ کوئی پہلو ہماری مُختلف
زندگیوں کے مُطابق ہے لیکن ایسے نمونہ کو صحیح طور پر ڈھونڈنے کے لیئے نہ صرف
اُسے سنجیدگی اور والہانہ محبت کی ضرورت ہے بلکہ انکساری وعقل کی بھی
جو کہ مسیحی خوبیاں ہیں۔ یاد رہے کہ کسی معمولی اُستاد یا کسی عظیم راہنما سے کچھ
سیکھنے کے لیئے اُس کی غُلامانہ تقلید اعلیٰ ترین طریقہ نہیں۔ یہ ایک حقیقت
ہے کہ مسیح خُداوند دوسری قابلِ تقلید انسانی ہستیوں سے مُختلف ہے، نہ صرف
اس میں کہ وہ عیبوں سے بالکُل آزاد تھا بلکہ اُس کی زندگی کی رسائی وُسعت
میں کُچھ ایسی تعجب کُن حقیقت ہے جسے ہم صرف اُس وقت معلوم کرتے ہیں
جب ہم اُن تنگ حالات پر غور کرتے ہیں جن میں اُس نے زندگی بسر کی۔
تاہم وہ ہمارے سامنے ایک نمونہ کی حیثیت سے نہیں آتا کہ ہم محض
اُس کی تقلید کریں بلکہ ایک ہمدرد راہنما کی طرح تاکہ ہمیں قوت دے، ایک
ایسے راہنما کی طرح جس سے ہم تہِ دل سے وفاداری کا اظہار کر سکتے ہیں
ایک ایسے مالک کی طرح جس کے حُکم کی تعمیل کی ضرورت ہے اور ایک

CamScanner

نجات دہندہ کی حیثیت سے جس نے ہمارے لئے وُہ کچھ کیا جسے ہم کرنے سے قاصر تھے۔ وہ ہمارے پاس آتا ہے کہ ہم اپنے دِل کی گہرائیوں میں اُسے جگہ دیں اور اُس کے مُتعلق یہ ایک حقیقت ہے جس کا مسیحی اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے۔

## ۵۔ اناجیل میں خاص مثالیں

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مُوسوی شریعت کے اخلاقی اصُولوں کا تصوراتی عِلم ہماری موجُودہ زِندگی کی مُختلف حالتوں میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اِسی طرح مسیح کی زندگی کے واقعات جو اناجیل میں مُندرج ہیں ہماری راہنمائی کے لئے باعثِ مدد ہو سکتے ہیں۔ دورِ حاضرہ کا ایک اُستاد مسیح کے نمُونہ کی تقلید میں جب اپنے شاگردوں کے پاؤں دھونے کی کوشش کرے گا تو وُہ ضرور یہ سوچنے پر مجبُور ہو گا کہ شاید اُس کے شاگرد اُس کے اِس عمل کو معیُوب خیال کریں گے۔ ہم اُس کم عِلم افریقی کی حرکت پر ہنستے ہیں جس نے یہ اِنکار کر دیا کہ وُہ ایک مشہُور عالم ڈاکٹر شوائٹزر کی لکڑی کی گیلی اُٹھانے کی مدد نہیں کرے گا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ وُہ اِتنا



ذی فہم ہے کہ قُلی کا کام کرنا اُس کے شایاں نہیں، لیکن کیا ہم بھی بعض اَوقات یہ نہیں سوچتے کہ کچُھ ایسے گھٹیا کام ہیں جنہیں کرنا ہمیں مُناسب نہیں۔ حالانکہ یہی وُہ موقعہ ہے کہ مسیح کا وُہ نمُونہ جب اُس نے شاگردوں کے پاؤں دھوئے ہمارے لئے عملی سبق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

---

چھٹا باب

# مسیح کی شریعت

## ۱۔ مُقدّس پَولُس کا بیان

اُن تمام لوگوں کے لیئے جنہوں نے مسیح یسُوع کو اپنا مالک اور خُداوند تسلیم کیا ہے، لازمی ہے کہ اُن کے اخلاقی فیصلوں میں خُداوند کے احکام کا اوّلین اختیار ہو۔ اُس نے اپنے پہاڑی وعظ اور دیگر تعلیم میں ایسے احکام دیئے جنہیں اُس کے شاگردوں نے اُس کے نام میں جاری وساری رکھا جیسے کہ عہدِ جدید کے بُہت سے خطوُط میں اخلاقی نصیحت سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ مسیح کی اخلاقی تعلیم اُس کے شاگردوں کی زندگی میں نشو ونما پاتی گئی جیسے کہ مقدّس پَولُس اپنے خطوُط کے دو پاروں میں "مسیح کی شریعت" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گلتیوں ۶ : ۲ میں ایسے کاموں کا ایک سلسلہ ہے جنہیں ہم مسیحی عملی امُور کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ رسُول کہتا ہے کہ ان کاموں کے کرنے سے ہمیں مسیح کی شریعت کو پُورا کرنا ہے "تُم ایک دُوسرے کا بار اُٹھاؤ اور یُوں مسیح کی شریعت کو پُورا کرو۔" (گلتیوں ۶ : ۲)۔ ایک اور بحث طلب حِصّہ (۱۔ کرنتھیوں ۹ : ۲۳ - ۲۹) میں مقدّس پَولُس ایک مسیحی کی حیثیت سے اپنی کامل آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں تمام مسیحی شامل ہیں۔ تب وُہ یہودیوں کو جیتنے کے لیئے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہُوئے کہتا ہے کہ اُس نے ایسا روّیہ اختیار کیا ہے۔



جیسے کہ وُہ مُوسوی شریعت کے ماتحت ہو حالانکہ بحیثیت ایک مسیحی کے وُہ آئیندہ کے لیئے بالکُل شریعت کے ماتحت نہیں۔ ممکن ہے کہ اُس وقت اُس کے ذہن میں تیمُتھیس کے ختنہ سے مُتعلق کچُھ باتیں ہوں (اعمال ۱۶ : ۳) اور انہی باتوں کے پیشِ نظر اُس نے دو دفعہ ایسی رسُومات میں حِصّہ لیا جن کا تعلق یہوُدی عہد سے تھا (اعمال ۱۸ : ۱۸، ۲۱ : ۲۶)۔ ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ مقدّس پَولُس کے لیئے ایسے کام کرنا اپنی مرضی اور انتخاب پر مُنحصر تھا۔ لیکن وُہ ایسے کام اُس وقت کرنا چاہتا ہے جب یہ مسیحی بشارت میں فائدہ مند ثابت ہوں۔ بعدازاں اُس کا یہ بیان ہے کہ غیر قوموں سے اپنے تعلقات میں اُس کا برتاؤ ایسے تھا جیسے کہ وُہ مُوسوی شریعت کے ماتحت نہیں۔ غالباً وُہ اُس وقت غیر قوموں کے ساتھ کھانے پینے کی طرف اشارہ کر رہا تھا (گلتیوں ۲ : ۱۲) اپنی دلیل کے اِس نُقطہ پر اُسے ڈر ہے کہ کہیں اُس کے قارئین کو غلط فہمی نہ ہو، اور وُہ یہ تصوّر نہ کریں کہ پَولُس تو ایک ایسا شخص ہے، جو "بغیر شریعت" کے ہے، جس کا کوئی اصُول نہیں اور وُہ اخلاق سے بھی بالکُل آزاد ہے۔ چُنانچہ وُہ اِن الفاظ سے اپنے خیال کی وضاحت کرتا ہے کہ وُہ "خُدا کے نزدیک بے شرع نہ تھا بلکہ مسیح کی شریعت کے تابع تھا۔" اگرچہ وُہ بحیثیت مسیحی کے مُوسوی شریعت یا کسی اور قانُونی ضابطہ کے ماتحت نہیں تاہم وُہ مسیح کی شریعت کے ماتحت ضرُور ہے۔ بہت سے لوگ یہاں اِس لفظ "شریعت" کے اِستعمال میں پس وپیش کریں گے جب اُن کے ذہن میں یہ تصوّر ہوگا کہ شریعت سے مُراد قانُونی اور اخلاقی ضابطے اور سزا کی دھمکیاں ہیں لیکن پَولُس رسُول سے سب مُتفق ہوں گے کہ یُوں ایک مسیحی قطعاً بے اصُول نہیں ہے۔ جب ہم مسیحی اصُولوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا کرنا بجا ہے۔

## ۲۔ مسیح کی شریعت کا دُوسرے قوانین سے اختلاف

عہدِ جدید نہایت وضاحت سے اِس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ مسیح

CamScanner

کی تعلیم مُوسوی شریعت اَور دُوسرے اِنسانی قوانین سے کُچھ مُتفرق ہَے۔

ل۔ یاد رہے کہ 'مسیح کی شریعت' ایک ایسا قانُونی ضابطہ نہیں ہے جس میں ایک مسیحی کو زِندگی کے ہر موڑ پر مُختلف حالات میں ہر ایک مسئلہ کا حل مِل جاتا ہَے' مثلاً جائیداد کے لیئے کوئی خاص مجمُوعہ قوانین تو نہیں ہے۔ اِس کے ثبُوت میں مسیح خُداوند کا وہ جواب جب ایک شخص نے اُس سے یہ درخواست کی کہ وُہ جائیداد کی ملکیّت کے جھگڑے میں اُن کا اِنصاف کرے' یہ ہَے "میاں! کِس نے مُجھے تمہارا مُنصف یا بانٹنے والا مقرر کیا ہَے؟" (لوقا ۱۲: ۱۴)۔ پہلی نظر میں پہاڑی وعظ 'مسیح کی شریعت' کا ایک مُرتّب بیان دکھائی دیتا ہَے۔ لیکن درحقیقت وُہ دِلکش تصوّرات کا ایک ایسا مجمُوعہ ہَے جو کسی نہ کسی حد تک اِتفاقیہ معلُوم ہوتا ہَے اَور اِس میں بہ نِسبت ایک مجمُوعۂ قوانین کے وُہ رُوح دیکھتے ہیں جس کے مُطابق ہمیں اپنے کِردار کے لیئے عمل کرنا چاہیئے۔

وُہ عِلم جس سے اِخلاقی قوانین کا مُختلف حالات پر اطلاق کیا جاتا ہَے' سوفِسطائیت کہلاتا ہے اَور ایک مسیحی کی راہنمائی کے لیئے محدُود لیکن مُفید کِردار ادا کرتا ہَے۔ جب ہم کردار کے خاص مسائل پر غور کریں گے تو اِس کا ہم کِتاب کے دُوسرے حِصّہ میں استعمال کریں گے۔ تاہم سوفسطائیت پروٹسٹنٹ مسیحیوں میں دو وجُوہات کی بنا پر مقبُول عام نہیں ہَے (۱) مسیحی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی تھا جب سوفِسطائیت کا اِتنا غلط استعمال ہُوا کہ لوگوں کا یہ مشغلہ بن چُکا تھا کہ وُہ اخلاقیات کے اصُولوں کو دلائل دے کر توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ (۲) ہم اپنے تجربہ سے جانتے ہیں کہ یہ بہتر ہَے کہ کسی شخص کی توجّہ اِخلاقیات کے وسیع اصُولوں کی طرف دلائی جائے تاکہ باقی رَدِّ عمل اُس میں خُود بخُود پیدا ہو۔

(ب) مسیح کی شریعت کا تعلّق اِس سے نہیں کہ اِنسان کیا کرتا ہَے بلکہ اِنسان کیا ہے؟ اِس حقیقت کو متی کی انجیل کے پانچویں باب کے آخری حِصّہ میں



وضاحت سے بیان کیا گیا ہَے یعنی پُورے پہاڑی وعظ میں جہاں مسیح خُداوند فرماتا ہے کہ وُہ شریعت کو منسُوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہے جس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ وُہ اِسے نئے معنوں میں پُورا کرنے کے لیئے آیا ہَے۔ اُس نے چند ایک مِثالوں سے واضح بھی کیا ہَے کہ وہ کِس طرح پُورا کرتا ہَے۔ مُوسوی شریعت کا تعلق محض اِنسان کے ظاہری اعمال سے ہَے لیکن مسیح کی شریعت کا تعلق نیّت سے ہَے۔ مسیح کی شریعت میں زناکاری کا خیال اَور فِعل اَور دُوسری طرف غصّہ کا خیال اور قتل دونوں ممنُوع ہیں جس سے ہم یہ اَخذ کر سکتے ہیں کہ اِس کا تعلق اِنسان کے دِل کے خیالوں سے ہَے۔ مسیح یسُوع اپنی مُختصر لیکن دِلچسپ تمثیل میں اِس کی اَور وضاحت کرتا ہَے "اِسی طرح ہر ایک اچھّا درخت اچھّا پھل لاتا ہَے اَور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہَے" (متی ۷: ۱۷)۔ یوُں محسُوس ہوتا ہَے جیسے کہ مسیح کی شریعت کی تابعداری اِنتہائی مُشکل ہَے کیونکہ اپنے افعال پر قابُو پانا بہ نِسبت اپنے خیالوں اَور خواہشات کے اَور اپنے کردار کو تبدیل کرنا بہ نِسبت اپنے آپ کو تبدیل کرنے کے آسان ہے۔

(ج) ہمارے مسیحی فرض کے دائرے میں مسیح کی شریعت دُوسرے تمام قوانین سے مُختلف ہَے۔ یہُودیوں کی طرح ہمارا بھی کُچھ یہ رُجحان ہَے کہ ہم اپنے فرائض کی اِخلاقی ذِمہ داریوں کو صِرف اِن لوگوں تک محدُود کر دیتے ہیں جن سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں مثلاً ہم اپنے خاندان' گاؤں کے لوگوں' پڑوسیوں اَور مسیحی مُعاشرہ کو دُوسروں پر ترجیح دیتے ہیں لیکن مسیح کی شریعت اِن فرائض کے حلقہ کو تمام بنی نوعِ اِنسان تک وسیع کر دیتی ہے۔ غالباً نیک سامری کی تمثیل کا اہم ترین سبق یہ ہَے کہ وُہ شخص جسے قدرتی طور پر ہم اپنا دُشمن تصوّر کرتے ہوں (جیسے کہ یہُودی سامریوں کو اپنا دُشمن خیال کرتے تھے) ممکن ہے کہ ضرُورت کے وقت وُہ ہمارا حقیقی پڑوسی ثابت

ہو۔ چُنانچہ ایسی صُورتِ حال میں یقیناً ہماری محبّت اپنے دوستوں سے بھی ہو، اَور اُن لوگوں سے بھی جنہیں ہم اپنا دُشمن تصوّر کرتے ہیں۔

## ۳۔ کیا مسیح کی شریعت ایک قانُون ہے یا بُہت سے قوانین کا مجمُوعہ ہے۔

آج کل بُہت سے مُعلّمینِ اخلاق کا یہ نظریہ ہے کہ مسیحی شریعت صِرف "محبّت کی شریعت" ہے۔ چُنانچہ ہم مسیح کی شریعت کو محبّت کی شریعت کہہ کر پُکار سکتے ہیں۔ ہمارے خُداوند نے خُود سِکھایا کہ مُوسوی شریعت کا سب سے پہلے حکم یہ تھا "تو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دِل اَور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اَور اپنی ساری طاقت سے محبّت رکھ۔ دُوسرا یہ ہے کہ تُو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبّت رکھ" (مرقس ۱۲ : ۳۰-۳۱)۔ ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ مسیح کی تعلیم میں پڑوسی سے پہلے خُدا کی محبّت ہے جسے دورِ حاضرہ کے معلّمینِ اخلاق اکثر فراموش کردیتے ہیں۔ چُنانچہ اِس نظریہ کے مُطابق مسیحیوں کے لیئے محبّت کی "اخلاقی قُطب نما کی ساخت" ایسی ہے جو خاص ضرُوریات کے وقت پُورے طور پر اُس طرف گھُمائی جا سکتی ہے، جِس طرف اُس کی ضرُورت ہے لیکن اِس عمل میں کسی دُوسرے اخلاقی اصُول کا خیال نہ ہو۔ سوائے اِس اصُول کے کہ ہمیں ایسے کام کرنا ہیں جن سے محبّت مُنعکس ہوتی ہو۔ چُنانچہ ایسے مسیحی اصُول جِن سے ہم واقف ہیں مثلاً وُہ جو حَسد، تہمت، کینہ یا شادی میں مرد و عورت میں سے کسی ایک کو بے وفائی سے منع کرتے ہیں، اِس نظریہ کے تحت کبھی عالمگیری طور پر عائد شدُہ اصُول نہیں ہیں۔ اُن کے خیال کے مُطابق یہ قابِلِ تسلیم ہے کہ خاص صُورتِ حال میں جب ایک عورت اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیئے کسبی بن جاتی ہے تو اُس وقت محبّت کی اخلاقی قُطب نما یہ تقاضا کرتی ہے کہ اِس حال



میں پاکیزگی کا مُسلّمہ اصُول توڑا جا سکتا ہے لیکن اِس نظریہ پر دو زبردست اعتراضات ہیں۔ اگر ہم سب کو صِرف مُحبّت کے اصُول کی ضرُورت ہے تو ہمارے خُداوند اَور مُقدّس پولُس نے کیوں دیگر اخلاقی مشورے دینے کے لیئے اِتنا وقت صَرف کیا اَور مَیں خُود بھی اپنے تجربہ کے تحت اپنے آپ میں اَور دُوسرے لوگوں میں کوئی ایسی قابِلِ اعتماد اخلاقی قُطب کو نہیں پاتا ہُوں چُنانچہ مَیں اِس امر کا قائل ہُوں کہ دُوسرے لوگوں کی طرح مسیحیوں کو بھی ایسے اصُولوں کی ضرُورت ہے جو اُن کی راہنمائی کر سکیں۔ بہ نِسبت مقدّس اوگسطین کے نظریہ کے کہ "مُحبّت رکھّو اور جو چاہو کرو" جِس میں اِس نظریہ کے تحت مسیح کی ساری شریعت آتی ہے۔ یہاں اِس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ مسیحی اِخلاقیات کے کِسی اصُول کا حالات کے عِلم کے بغیر اِطلاق نہیں کیا جا سکتا مسیحی محبّت کا ہر وقت یہ تقاضا ہے کہ ایک اخلاقی اصُول کا اِطلاق کرتے ہُوئے تمام متعلّقہ اشخاص کی اِنفرادی خصُوصیّات اَور حالات کا ہمدردانہ طور پر خیال رکھّا جائے۔ "سچ بولو" بُہت سے اخلاقی ضابطوں میں ایک دُرست اصُول ہے لیکن ایک مسیحی اصُول اِس سے مُتفرق ہے "محبّت کے ساتھ سچائی پر قائم رہ" (افسیوں ۴ : ۱۵)

بُہت سے مُعلّمینِ اخلاق کا یہ نظریہ ہے کہ مسیح کی شریعت، مُحبّت کی شریعت اور دُوسرے ثانوی اصُولوں پر مُشتمل ہے لیکن اپنی معقُولیّت کے لحاظ سے اِن اصُولوں کا انحصار اِس حقیقت پر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اِن میں مُحبّت کے اصُول کا اِظہار ہے۔ اگر ہمیں اِس کا پُورا علم ہوتا کہ مسیحی محبّت دَر حقیقت ہے کیا اَور ہم یہ بھی جانتے کہ کِسی خاص صُورتِ حال میں کونسے ثانوی اصُول کا اطلاق ہوگا تو ہم یہ بھی جاننے کے قابل ہو جاتے کہ اِس ثانوی اصُول کی عالمگیر حقیقت یہ ہے جِس کا محبّت کی شریعت کو خاص حالات میں تقاضا کرنا چاہیئے۔ کبھی بھی ایسے حالات نہیں ہوتے جبکہ محبّت کا یہ تقاضا ہو کہ

ہمیں کسی شخص پر تہمت لگانے کی ضرورت ہے بعض معلّمینِ اخلاق کا یہ خیال ہے کہ یہ ثانوی اصول ہمیں صرف وہ سبق دیتے ہیں جو ہم اپنے گزشتہ تجربہ سے سیکھ چکے ہیں مثلاً یہ دیکھا گیا ہے کہ زندگی کے حالات میں سچ بولنا اچھی بات ہے چنانچہ ہم سچ بولنے کے اصول کو عالمگیر حیثیّت دے سکتے ہیں۔ بعض دوسروں کا یہ خیال ہے کہ محبت اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنے آپ کو ثانوی اصولوں سے ظاہر کرنے پر مجبور ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ محبّت کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وُہ سکھاتی ہے کہ امیر غریب کی مدد کرے۔ بعض لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ چونکہ ہماری زندگی کے تجربہ میں کئی قسم کے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں چنانچہ لازمی ہے کہ محبت کے ساتھ ساتھ ثانوی قوانین بھی ہوں جو یہ واضح کریں کہ ان حالات میں فوری طور پر کونسی بات محبّت کے اصول کے مطابق ہے۔ پھر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے انسانی ادراک میں ایسے اصول ہیں جن کا یہ تقاضا ہے کہ اکثر و بیشتر محبّت، یکساں حالات میں اپنے آپ کو ایک ہی طریقہ سے ظاہر کرتی ہے۔ اگر ہم مسیحیوں کا یہ نظریہ قبول کرلیں کہ خدا محبّت ہے اور تخلیقِ کائنات اُس کی محبت کا کام ہے تو ہمیں اس بات کا بھی یقین کرنا چاہیئے کہ اُس نے اخلاقی دستوروں کو گھر اور مُلک کی طرح خلق کیا اور قانونِ قدرت کے اصولوں کو جنہیں اُس نے ہر جگہ انسان کے عین دِل میں رکھا، اُس کی محبّت کی علامتیں ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ خدا کی یہ نعمتیں انسان کے گُناہ سے بگڑ گئی ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیئے مشکل ہے کہ ہم دُنیاوی حکمرانوں کے ظلم و استبداد کو پرکھ سکیں یا ایسے اصولوں میں جو طلاق کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اُن میں خُدا کی محبّت کا ظہور دیکھ سکیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ اخلاقی اصول جو گُناہ سے بگڑ گئے ہیں۔ اُن کا محبّت کی شریعت سے کوئی تعلّق نہیں، بلکہ تخلیق شدہ نظام کا ایک حصّہ ہیں جس میں پورے طور پر خُدا کی محبت کا



ظہور ہے۔

چند دوسرے معلّمینِ اخلاق کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی شریعت میں محبّت کی شریعت کے ساتھ ساتھ دوسرے اخلاقی اصول ہیں جنہیں ہرگز محبّت کی شریعت سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ مقدّس تھوماس اکوئیناس کا قانونِ قدرت کے متعلق تصوّر ہمارے اس نظریہ کے متضاد ہے کہ مسیحیت میں مسئلہ تخلیق میں قانونِ قدرت خُدا کی محبّت کا مظہر ہے۔ بعض دوسروں کا خیال ہے کہ ایک ایسا خود مختار اخلاقی اصول ہونا چاہیئے جس کے تحت ہمارے کام عقلی ہوں۔ چنانچہ ہمیں اخلاقی زندگی میں منطق اور محبّت دونوں کی ضرورت ہے میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ بجائے خود مختار اخلاقی اصول کے عقل مسیحی محبّت کا ایک لازمی جزو ہے مثلاً انصاف کے متعلّق یہ تصوّر ہے کہ یہ ایک خود مختار اصول ہے۔ یقیناً انصاف ایک ایسا راستہ ہے جس میں بعض حالات میں محبّت کارفرما ہوتی ہے۔

مسیحی مفکّرین میں ابھی تک اختلافِ رائے ہے کہ یہ امر بالکل غیر واضح ہے کہ ان تینوں نظریات میں سے کس کو مسیح کی شریعت تسلیم کیا جائے۔ ہم دوسرے نظریہ کو پسند کرتے ہیں کہ محبّت کے علاوہ دوسرے بھی عالمگیر اصول ہیں لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ اصول محبّت کی شریعت سے اخذ کیئے گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نظریہ کو مستند قرار دینے کے لیئے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم یہ واضح کریں کہ جب ہم خاص حالات میں دوسرے اصولوں (مثلاً دس احکام) کا اطلاق کریں تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محبت کا عظیم قانون شعور و امتیاز کا تقاضا کرتا ہے۔

## ۴۔ مسیح کی شریعت کے متعلّق نظریات

مسیح کی شریعت کے مافیہ کے لیئے لوگوں کا خواہ کوئی بھی نظریہ کیوں

نہ ہو لیکن مسیحیوں کا اپنے اِن نظریات کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ اِس شریعت کا مسیحیوں کی زندگی میں کیا کام اور مُقام ہے؟

(د) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسیح کی شریعت "کردار کے براہِ راست قوانین" پر مُشتمل ہے تاکہ کلیسیا اور کلیسیائی عدالتوں کی عائد شدہ سزاؤں اور نظم وضبط کے ذریعہ اِس پر عمل درآمد کرایا جائے۔ وُہ مسیحی جو اِس نظریہ پر قائم ہیں وُہ دَرحقیقت ایک نئی اَور مسیحی شکل میں ایسا ضابطۂ قانون بنانا چاہتے ہیں جِسے مسیح خُداوند اَور پُولس رسُول نے ردّ کر دیا۔ اُس میں یہُودی ربّیوں نے کوشش کی کہ ایک بے نقص قوانین کی ترتیب حاصل کریں جِس کی بدولت ہم ہر حالت میں خُدا کی تابعداری کریں۔ ہم پہلے ہی سوفسطائیت کے خطرات دیکھ چُکے ہیں لیکن اِس کے عِلاوہ عملی زِندگی میں مسیحی کلیسیا کے افراد پر مسیح کی شریعت کے ایسے حِصّوں پر عمل درآمد کرانے کے لیئے کوئی طریقہ نہیں مثلاً وُہ قوانین جو بُری نِگاہ سے دیکھنے سے احتراز کرنے اَور اپنے دُشمنوں سے محبّت کرنے کے لیئے کہتے ہیں۔ گو دُوسرے مُعاشروں کی طرح کلیسیا میں کچھ نظم وضبط کی ضرُورت ہے لیکن یہ بالکُل غیر مسیحی روّیہ ہوگا، اگر کلیسیا کے محدُود اختیارات کو مسیح کی شریعت کے کُچھ حِصّوں پر زور دینے کے لیئے اِستعمال کیا جائے جبکہ دُوسرے حِصّوں پر زور دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ یہ سچ ہے کہ رومن کاتولیک کلیسیا اور دُوسری کلیسیاؤں میں اعتراف کی رسم اِنسان کے پوشیدہ گُناہوں کو کلیسیائی نظام کے حلقہ میں لائے لیکن یہ ایک بحث طلب سوال ہے آیا کہ اعتراف میں ایسا کرنے کی خاصیّت موجُود ہے یا نہیں۔ مسیح کی شریعت کے عائد کردہ بیرُونی ضبط کے تمام اِقدامات پر یہ ایک بُنیادی اعتراض ہے کہ یُوں فیصلہ کے لیئے اِنفرادی آزادی چھِن جائے گی جو مقدّس پولُس کے نظریہ کے مُطابق ہماری مسیحی وراثت ہے۔ (گلتیوں ۱۵: ۱، ۱۳)



(ب) دُوسری طرف کُچھ اَور لوگ ہیں جو یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ مسیح کی شریعت ایک ناقابلِ عمل معیار ہے جِس میں ایسی ہدایات ہیں جن کی اِس مادی دُنیا میں رہتے ہُوئے اِنسان تعمیل نہیں کر سکتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک قِسم کا آسمانی نمُونہ ہے جِس پر غور کرتے ہوئے ہم اپنی گُناہ آلُود حالت کو دیکھ سکتے ہیں اَور شاید لاشعُوری طور پر اِس سے ہماری زِندگی مُتاثر ہو۔ بعض دُوسروں کا خیال ہے کہ پہاڑی وعظ ایک ایسا ضابطۂ قانُون ہے جو اُس دُنیا کے لیئے ہے جو پہلے ہی سے کامِل ہے اَور جہاں خُدا کی بادشاہت پُورے طور پر آ چُکی ہے۔ ہم وُثوق سے کہتے ہیں کہ یہ بالکُل ایک غلط نظریہ ہے کیونکہ ایک کامِل دُنیا کے نظام میں کوئی دُشمن نہیں ہوگا جِس سے محبّت کی جائے اَور کوئی بھی کِسی غریب مسیحی کو مجبُور نہیں کرے گا کہ وُہ اُس کا سامان اُٹھائے یا اپنے کپڑوں کے لیئے قانُونی عدالتوں میں نالش کرے۔ یہ بالکُل واضح ہے، کہ پہاڑی وعظ کی تمام تصاویر کا ایک عام گُناہگار دُنیا سے نہ کہ کِسی کامِل دُنیا سے تعلق ہے۔ ہمیں کبھی یہ بھی نہیں سوچنا چاہیئے کہ "مسیح کی شریعت" کی ثانوی قوانین کی سی حقیقت ہے، (قانُونِ قدرت کے ثانوی قوانین کی طرح) جو اَور مِثالی حالات میں منسُوخ کیئے جائیں گے۔ حالانکہ اُس کی کُچھ مثالیں مثلاً بیگار یا نالش رائج الوقت نہیں ہیں۔ ہمیں ضرُور خیال کرنا چاہیئے کہ یہ خُدا کی محبّت کی شریعت جو اِس خراب جہان میں جہاں کہیں موقع ہو، اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ ہر ایک اِنفرادی حُکم ایک حقیقی اِنسانی حالت میں خُدا کی محبّت کی خُوبی اَور سمت کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اِس کا ایسے گھٹیا معیاروں سے کوئی سمجھوتہ نہیں جیسے کہ قانُونِ قُدرت کے ثانوی اصُولوں میں اکثر دیکھا گیا تھا اور جیسے کہ رومن کاتولیک ماہرینِ مُعلّمینِ اِخلاق کی تعلیم ہے، اِس کی ایک وجہ ہے کہ مسیح کی تعلیم اَور خطوط کی اِخلاقی تعلیم میں مسیح کی شریعت اِتفاقیہ ہے اَور عین موقع کے مُطابق نظر آتی ہے۔ لیکن اِس خراب جہان میں مسیح کا نُور ہر جگہ اپنے آپ

کو ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسی مثالیں دینے سے جہاں کہیں سمجھوتے کی ضرورت
ہے، ایک مکمل ضابطۂ قانون دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ جیسے کہ
شریعت پسند اِس بات کا تقاضا کرتے ہیں لیکن اِس سے ہمیں صرف ایسی
تعلیم ہی مِل سکے گی جو بہت کم 'مسیح کی شریعت' کہلانے کی حقدار ہو گی۔
مسیح کی شریعت کو ہمارے مسیحی کردار میں عملی راہنما کی حیثیت سے
سنجیدگی سے اختیار کرنا چاہیئے۔ اِس تمثیل میں جو پہاڑی وعظ کا خاکہ پیش
کرتی ہے 'اِسے پورے طور پر واضح کر دیا گیا ہے' "جو کوئی میری یہ باتیں
سُنتا اور اُن پر عمل کرتا ہے وہ اُس عقلمند آدمی کی مانند ٹھہرے گا جس نے
چٹان پر اپنا گھر بنایا اور جو کوئی میری یہ باتیں سُنتا ہے اور اُن پر عمل نہیں
کرتا وہ اُس بیوقوف آدمی کی مانند ٹھہرے گا جس نے اپنا گھر ریت پر بنایا۔"
(متی ۷: ۲۴، ۲۶)۔ تاہم یہ ایک غیر معمولی اور خاص راہنما ہے۔ ٹی۔ ڈبلیو منسن
یُوں رقمطراز ہے کہ "مسیح یسوع کی تعلیم بہ نسبت ایک مذہبی فریضہ کے نقشہ
کے 'ایک قُطب نُما ہے اور جو اِسے نہایت سادگی سے اور مکمل طور سے تھام
لیتا ہے اُسے اپنی سمت کو جاننے کے لیئے کامل یقین ہے لیکن اِس کے ساتھ
ساتھ اُسے قدم اُٹھانے کی بھی ضرورت ہے۔" اگر مقدس پولس سنجیدگی
سے اِن کو اختیار کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تو وہ کبھی بھی اپنے خطوط میں اِخلاقی
اصُولوں کو اتنی جگہ نہ دیتا۔ بعض اوقات تو وہ اپنے تمہیدی جُملوں کو نہایت
مؤثر الفاظ سے شروع کرتا ہے۔ "پس اے بھائیو! میں خُدا کی رحمتیں
یاد دِلا کر تم سے اِلتماس کرتا ہوں کہ اپنے بدن ایسی قربانی ہونے کے لیئے
نذر کرو جو زندہ اور پاک اور خُدا کو پسندیدہ ہو۔ یہی تمہاری معقُول عبادت
ہے" (رُومیوں ۱۲: ۱)۔ یہ کہنا بھی بالکل غلط ہو گا کہ پہاڑی وعظ میں
دیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا ہماری پہنچ سے باہر ہے اور اُن کی تعمیل
کرنا ناممکن ہے۔ اس لیئے اُن کی تعمیل کی کوشش بھی فضُول ہے۔ یہ کسی



حد تک ایک حقیقت ہے کہ ہم بُری نگاہ سے احتراز کرنے کے قابل نہ
ہوں لیکن ہم ایسی کتابیں پڑھنے اور ایسی فلمیں دیکھنے سے تو گریز کر سکتے
ہیں جو ہمارے شہوانی خیالات کو اُبھارتی ہوں۔ ممکن ہے کہ ہم اپنے دُشمن
سے محبت نہ کر سکیں۔ تاہم ہم دُعا تو کر سکتے ہیں کہ جس شخص کو ہم پسند نہیں کرتے
اُس میں اچھی چیزیں پہچاننے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک وقت
میں صرف ایک قدم اُٹھائیں لیکن ہر شخص مسیح کی شریعت کو پُورا کرنے کے
لیئے کچھ قدم ضرور اُٹھا سکتا ہے۔

## ۵۔ شریعت سے آزادی

اگر ہم مسیحی شریعت کے ماتحت ہیں تو شریعت سے آزادی کے مُتعلق
ہمارا کیا خیال ہے جسے مُقدس پولس ہماری بُنیادی مسیحی وِراثت تصور کرتا
ہے۔

(ا) ہمیں آزادی ہے کہ ہم خود فیصلہ کریں کہ کس طرح مسیحی اصُولوں کا،
جن کی مسیح کے نمُونہ اور اُس کی تعلیم میں واضح تصویر پیش کی گئی ہے، خاص
حالات پر اِطلاق کریں۔ گو ہمارے خُداوند نے یہ اِخلاقی اصُول دیا ہے کہ اگر
کوئی ہمارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دُوسرا بھی پھیر دیں لیکن ایک غُصے سے
آگ بگولا دُشمن کے سامنے اکثر حالات میں یہ ایک بالکل غیر مسیحی رویّہ ہو گا
جس سے اُس کا غُصّہ اور بھی بڑھے گا۔

(ب) ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ محبت کی خوبی ہے کہ مسیح کی شریعت کا یہ
بُنیادی اصُول ہے کہ کس طرح اپنی ذاتی خواہشات اور دُوسروں کے
جذبات کے لیئے خوشگوار تعلق ظاہر کریں اور اُس کی روشنی میں ہم مسلسل
اپنے آپ کو حُکم کی تابعداری کے لیئے ڈھالتے رہیں۔

(ج) محبت حُکم کی تابعداری سے اس حالت میں مُختلف ہے کہ یہ ہر لمحہ

اپنے آپ کو نئے نئے طریقوں سے ظاہر کرتی رہتی ہے مثلاً اگر ایک شوہر بڑے دِن کے موقع پر اپنی بیوی کو ایک سا تحفہ دیتا رہتا ہے تو اِس سے وُہ اپنی غیر ارادی محبّت کو ظاہر نہیں کرتا۔ اِسی طرح خُدا اَور اِنسان سے بھی مسیحی محبّت کا روّیہ یہی ہے کہ یہ آزادی سے ہر روز غیر متوقع طریقوں سے اپنے آپ کو پیش کرتی رہتی ہے۔

(د) مسیحیوں کو جزا و سزا کے خوف سے بالکُل آزاد ہونا چاہیئے۔ گو مسیح کی اپنی تعلیم میں متعدد بار جزا و سزا کے متعلق اشارے ہمارے اِس بیان کے مُتضاد معلوم ہوتے ہوں گے لیکن مسیح کی تعلیم میں جزا کسی کام کا ایک قُدرتی نتیجہ ہے جب مسیح خُداوند نے کہا " مُبارک ہیں وُہ جو پاک دِل ہیں کیونکہ وُہ خُدا کو دیکھیں گے " (متی ۵ : ۸) تو دَراصل وُہ اِس حقیقت کو پیش کر رہا تھا کہ اِنسان کے دِل کی پاکیزگی کا یہ فطری اَور لازمی نتیجہ ہے کہ وُہ خُدا کو دیکھتا ہے۔ جزا و سزا 'آزادی' سے صِرف اُس وقت ہم آہنگ نہیں، جب ہمیں اعمال کے فِطری نتائج سے کچُھ زائد دیا جاتا ہے اَور جب ہم یہ کام محض اجر حاصل کرنے اَور سزا سے بچنے کی خاطر کرتے ہیں۔

(ہ) ہمیں اپنی خاص راہنمائی کے لیئے آزادی بھی ہے جسے ہم اپنے قبُول کرنے کے لیئے مُنتخب کر سکتے ہیں۔ مسیح کی شریعت کے بڑے بنیادی اصُولوں خاص کر محبّت کے اصُول سے، مُختلف مسیحی لوگ اپنی زِندگی اور کردار کے لیئے مُختلف اصُول بنا سکتے ہیں مثلاً بہُت سے مسیحی سگرِٹ نوشی کرتے ہیں، لیکن بعض اپنی مسیحی تابعداری کے تحت سگرِٹ پینے سے اِنکار کر دیتے ہیں۔ اِسی طرح بہُت سے مسیحی جائز جنگ میں حِصّہ لینے کیلئے تیار ہوں گے لیکن بعض اِس حُکم کی تعمیل کرتے ہوئے اِنکار کر دیں گے " شریر کا مُقابلہ نہ کرو "۔

سادھو سُندر سِنگھ نے ہمالیہ میں سیر و سیاحت کے دوران اپنی زِندگی کو مُختلف اصُولوں کے تحت ڈھالا بہ نسبت اُن اصُولوں کے جو بشپ عزرا یاہ نے اختیار



کیئے جیسے ڈایوسیس میں مُختلف کلیسیاؤں کی نگہبانی کرنا تھی۔ تاہم یہ دونوں شخص مسیح کی شریعت کی تابعداری میں زِندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسیحی آزادی سے یہ مُراد نہیں کہ انسان کے اپنے لئے کچُھ اصُول نہیں ہونے چاہئیں اَور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اِنسان بغیر اصُول کے پولُس کی نِگاہ میں بے اصُول اَور بے شریعت تصوّر کیا جاتا ہے۔ مسیحی آزادی کا یہ تقاضا ہے، کہ اِنسان مسیح کی شریعت کے مدِّنظر اپنے لِئے ایسے اصُولوں کے اِنتخاب کے لیئے آزاد ہے جن سے وُہ شریعت کے مُطابق اپنی زِندگی کو ڈھال سکتا ہے۔ آج کل بہُت سے مسیحی قائل ہیں کہ اُنہیں اپنے لیئے ایک اصُولِ زِندگی کو اختیار کرنے کی ضرُورت ہے جو کاتولیک کلیسیا کے راہبوں کے اصُولوں سے قابلِ موازنہ ہے لیکن یہ اصُولِ زِندگی ایسا ہونا چاہیئے جو اِس دُنیا میں زِندگی کے موافق ہو۔ شاید ایسے اصُولِ زندگی کا تعلق رُوپے کے خرچ سے ہو، یا وقت کے اِستعمال سے خاص کر دُعا کے وقت سے یا گیان دھیان اَور کلامِ مقدّس کے مُطالعہ یا مُختلف قِسم کی عیش و عشرت کے احتراز سے وغیرہ۔ ایسا اصُول بالکُل پُورے طور پر مسیحی زِندگی سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن صِرف اِس حد تک جب کہ ہم یہ اصُول اپنے لِئے بناتے ہیں اَور اِس سے دُوسروں کی نُکتہ چینی نہیں کرتے۔

## ۶۔ مسیح کی شریعت اَور کلیسیائی نظم و ضبط

کیا مسیح کی شریعت میں ایسے حِصّے نہیں ہیں جن کی تعمیل کی ضرُورت ہے اگر کوئی مسیحی مسیح یسُوع کا شاگرد اَور مسیحی کلیسیا کا ممبر رہنا چاہتا ہے؟ ہر ایک سوسائٹی کے کچُھ اصُول ہوتے ہیں جن کی اُس کے اراکین کو تابعداری کرنا ہے تاکہ وُہ اِس کے رُکن رہ سکیں۔ نباتات خور سوسائٹی کسی گوشت خور کو اپنا رُکن نہیں رکھ سکتی اَور اِسی طرح کوئی فوجی پلٹن کسی اَمن پسند گروہ کو اپنا ممبر نہیں رکھ سکتی۔ دَراصل ایسے اصُولوں کا اِنحصار زیادہ تر اُس مقصد پر ہے جس کے لیئے سوسائٹی کی تشکیل

کی گئی ہے۔ مسیحی کلیسیا کا ایک مقصد ہے کہ وہ دُنیا میں مسیح کے لئے گواہی دے مسیح خداوند نے اپنے شاگردوں سے کہا "تم دُنیا کے نُور ہو جو شہر پہاڑ پر بسا ہے وہ چھُپ نہیں سکتا" (متی ۵ : ۱۴)۔ درحقیقت اُس وقت مسیح خداوند مسیحی کردار کے بارے میں کہہ رہا تھا اور ابتداء سے ہی کلیسیا نے زندگی کے بہتر طریقوں کو پیش کیا ہے۔ مزید برآں مسیح کی شریعت مُلحد لوگوں کی اخلاقیات اور غیر مذہبی مُلک کے قوانین سے مُختلف ہے۔ کلیسیا آج بھی اپنے افراد سے اُن چیزوں کا مُطالبہ کرتی ہے جن کا حکومت اُن سے تقاضا نہیں کرتی، مثلاً قانونی عدالتوں سے باہر بھی سچ بولنا، شادی کے بغیر جنسی تعلقات سے گریز کرنا اور خیرات دینا وغیرہ۔ گو چند کلیسیائیں صرف اُن لوگوں پر سزائیں عائد کرتی ہیں جو اِس معیار پر پُورے نہیں اُترتے۔ ماضی میں ایک ایسا وقت بھی رہا ہے جبکہ رومن کاتولیک کلیسیا میں اعتراف کے ذریعہ سے یا پریسبٹرین کلیساؤں میں سیشن کے نظم وضبط کے تحت ایسی سزائیں عائد کی جاتی رہتی ہیں مگر آج کل بھی پروٹسٹنٹ کلیسیائیں اپنے افراد پر کسی قصُور کے عوض ایسی سزائیں عائد کر سکتی ہیں مثلاً جُرمانہ کرنا یا مُعاشرتی زندگی سے کسی کو خارج کر دینا وغیرہ۔ لیکن اِس میں شک ہے کہ شاید وہ ایسا کرنے کی کبھی خواہش کریں۔

موجُودہ دور میں نظم وضبط کو ترک کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ یُوں ہم اُس گواہی کی جو کلیسیا مسیح کی شریعت کے بارے میں دیتی ہے، اِس دُنیا کے معیاروں سے اُس کی مصالحت کرتے ہیں۔ کیا تمام کلیسیا کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ تمام طلاق یافتہ لوگوں کی دوبارہ شادی کرنے سے اِنکار کرے تاکہ وہ اس تعلیم کی گواہی دے جو مسیح نے شادی کے متعلق دی۔ کیا کلیسیا کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے تمام لوگوں کو کلیسیا کی رُکنیت سے علیحدہ کر دے جو شرابی، افیمی بدمعاش، بددیانت اور جھُوٹے ہیں۔ ایسی انتظامی کارروائیوں سے مسیحی معیاروں کے لئے کلیسیا کی گواہی یقیناً مؤثر ہوگی۔ تاہم ہمارے اِس موجُودہ عمل مصالحت



کی حمایت میں دو امُور قابلِ ذکر ہیں۔ (ا) اکثر کلیسیا کے سخت نظم وضبط سے اِنفرادی آزادی کھو کر رہ جائے گی جو ہماری مسیحی وراثت کا ایک حِصّہ ہے تاہم ماضی میں کلیسیائی نظم وضبط کا ایسے معاملات سے ضرُور تعلّق رہا ہے جہاں کہ آزادی کے بہتر تصوّر کی خواہش کی جاتی رہی ہے مثلاً سبت کو ماننا اور کلیسیا کے عہدہ داروں کو تنقید کرنے کا حق دینا۔ (ب) کلیسیا کا ایک اور کام بھی ہے، جو کہ کلیسیائی معیاروں کی گواہی سے بھی اہم تر ہے۔ کلیسیا اُس مسیح کا بدن ہے۔ جو راست بازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بُلانے کے لئے آیا اور یہ اُسی صُورت میں مُمکن ہے جبکہ کلیسیا پُوری کوشش کرے کہ وہ گُنہگاروں کو اپنی رفاقت میں لے چنانچہ شرابی، دغابازوں اور جھُوٹوں کو بھی ہمیں خُوش آمدید کہنا ہے اِس لئے نہیں کہ اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے بلکہ اِس لئے کہ اُنہیں مُعاف کر دیا جائے کلیسیائی معیار کی گواہی اور کلیسیا کے گُنہگاروں کو بچانے کے عمل میں کشمکش ہے، اور یہ ایک ایسی کشمکش ہے جس کا حل صِرف خُدا کا فضل ہے۔

ہم وثُوق سے کہتے ہیں کہ کلیسیا اپنے نظم وضبط کو اِس طرح نہ چلائے، جیسے کہ حکُومت اپنی قانُونی عدالتوں میں کرتی ہے۔ مسیح کی شریعت کو قانُونی ضابطہ کی شکل نہیں دینی چاہیئے اور اسی طرح کلیسیائی عدالتوں کو قانُونی عدالتوں کا رنگ دینے سے تباہ کُن نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ کلیسیا کا یہ مقصد نہیں کہ اپنے نظم وضبط کے ذریعہ سے صِرف سزائیں ہی عائد کرے بلکہ مسیح کی شریعت کی گواہی دے۔ اُس کا دُوسرا نصب العین یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تبدیل کرے لیکن یہ صِرف اُسی حال میں ہو سکتا ہے اگر وہ آزادی سے اپنے لئے مسیح کی شریعت کو قبُول کریں۔ یاد رہے کہ مسیح کی شریعت کی قبُولیّت صِرف خُدا کے فضل اور اُس کی اُس قوت سے پیدا ہوتی ہے، جب وہ مسیح خُداوند کو اپنا شخصی نجات دہندہ قبُول کرتے ہیں۔

## حِصّہ دوم

# مسیحی فیصلہ کا دائرۂ عمل



ساتواں باب

# مسیحی اَور اُس کی خواہشات

## ۱۔ خواہشات کی قُدرتی بُنیاد

ہر ایک اِنسان کی قُدرتی ضرُوریات اَور جبلّتیں ہَیں جنہیں وُہ پُورا کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ اُن میں سے کچھ تو ایسی ہیں مثلاً کھانے پینے اَور سانس لینے کے لیئے ہوا کی خواہش جو اِنسان کی زِندگی کے لیئے لازمی ہیں مگر کُچھ دُوسری خواہشات ہیں، گو وُہ ہماری قُدرتی تکمیل کا ایک حِصّہ ہَیں لیکن اِن خواہشات کو پُورا کرنے کے لیئے نہایت احتیاط اَور ضبط کی ضرُورت ہَے مثلاً اگر کوئی ہماری راہ میں حائل ہو تو لڑنے کی جبلت ہمیں تشدّد پر آمادہ کرے گی۔ لیکن مُعاشرہ میں پُرسکُون زِندگی بسر کرنے کے لیئے اِس جبلّت پر قابُو پانا ہوگا۔ اِن جبلّتوں کے لیئے ایک یہ عام غلطی کی جاتی ہَے کہ اُن میں سے بعض بُنیادی طور پر اچھّی ہَیں مثلاً مادرانہ پدرانہ جبلّت جو بچّوں کی پرورش کے لیئے تحریک دیتی ہَے یا غول پسندی کی جبلّت جِس کے تحت اِنسان دُوسروں کی رفاقت ڈُھونڈنے کا خواہاں ہے اَور کہ دُوسری جبلّتیں بُنیادی طور پر بُری ہیں مثلاً جِنسی جبلّت اپنے بُرے اَور بیجا اِستعمال سے اِنسان کو رُسوا کر دیتی ہَے اور جبلتِ ملکیت آسانی سے لالچ میں تبدیل ہو سکتی ہَے۔ مسیحی نظریہ یہ ہَے کہ یہ تمام رُحجانات اَور جبلّتیں اپنی فِطرت کے لحاظ سے اچھّی ہَیں کیونکہ جب خُدا نے دیکھا کہ اُس نے جو کُچھ بنایا بہُت اچھّا تھا (پیدائش ۱ : ۳۱) تو اِس میں قُدرتی رحجانات اَور اُس کی جبلّتیں بھی شامل تھیں۔ تاہم مسیحیوں کا یہ بھی نظریہ ہَے کہ ہماری

تمام اِنسانی فِطرت گُناہ سے بگڑ گئی ہے جس سے اُن میں سے سادہ سے سادہ جبلت بھی بگڑ سکتی ہے۔ ہماری خوراک ہمارے لیئے فِطری اور لازمی ہے۔ جیسے کہ ہمارے خداوند نے خُود ظاہر کیا جب اُس نے کہا کہ ہمیں روز کی روٹی کے لیئے دُعا کرنا چاہیئے (لوقا ۱۱ : ۳) حتیٰ کہ ساکرامنٹ کے ذریعے یہ فضل کا وسیلہ بھی ہو سکتی ہے جس میں روٹی، مسیح کے جِسم اور مے اُس کے خُون کی علامتیں ہیں۔ یاد رہے کہ یہی روٹی اور مے یہُودیوں کی روزمرّہ خوراک تھی۔ لیکن پیٹو پن یا عدم خُود ضبطی کو سات مُہلک گناہوں میں شمار کیا گیا ہے جنسی جبلت بہُت سے لوگوں کیلئے اگر وہ اسے قابُو میں نہ رکھ سکیں تو یہ اُن کے لیئے بدنامی اور رُسوائی کا باعث بن جاتی ہے لیکن بہ طرفِ دیگر یہی جبلت ازدواجی رِشتہ میں خُوشی اور مُسرّت کا باعث ہے۔ مُقدّس پولُس نے مسیح اور اُس کی کلیسیا کے تعلقات کو ظاہر کرنے کے لیئے ازدواجی تشبیہہ کا اِستعمال کیا۔ (افسیوں ۶ : ۳۲) مادرانہ جبلّت جِس کے بارے میں امریکہ میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اخلاقی نمُونہ کو پیش کرتی ہے لیکن اگر اِسے گھر کے تنگ ماحول تک ہی محدُود رکھا جائے تو نہایت آسانی سے یہ خُود غرضی میں تبدیل ہو سکتی ہے جو بالکُل ایک غیر مسیحی روّیہ ہے۔

## ۲۔ ضبطِ نفس

ضبطِ نفس کے معنی اپنی خواہشات کو قابُو میں رکھنے کے ہیں لیکن مسیحیوں کے اخلاقی تصوّر میں ضبطِ نفس کی دو مُختلف آراء کو اکثر ایک دُوسرے سے مخلُوط کر دیا جاتا ہے۔ ایک تو اعتدال پسندی کی رائے ہے یعنی درمیانی راستہ کا انتخاب کرنا جس کے ایک یُونانی ضربُ المثل میں یہ معنی لیئے جاتے ہیں۔ "حد سے زیادہ تجاوز نہ کرو۔" قدیم مُلحد یُونانیوں نے یہ محسُوس کیا کہ زندگی سے پُورے طور سے لُطف اندوز ہونے کا بھید اسی میں ہے کہ اعتدال پسندی اختیار



کی جائے۔ نہ صِرف کھانے پینے یا دُوسری جِسمانی خواہشات کی تکمیل کے لیئے بلکہ فلسفیانہ غور و فِکر، فنُون اور اخلاقیات میں بھی۔ عہدِ عتیق میں اِس نظریہ کا ایک بیان ہے جس میں غالباً یہُودی خیال کی نِسبت یُونانی تاثر جھلکتا ہے۔ "حد سے زیادہ نیکو کار نہ ہو اور حکمت میں اِعتدال سے باہر نہ جا، اِس کی کیا ضرُورت ہے کہ تُو اپنے آپ کو برباد کرے؟" (واعظ ۷ : ۱۶) لیکن یہ ہمارے خُداوند کے بیان سے بہُت مُختلف ہے۔ "مُبارک ہیں وُہ جو راستبازی کے بھُوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وُہ آسُودہ ہوں گے" (متی ۵ : ۶) عہدِ جدید میں کوئی ایسی آیات نہیں جن میں اِعتدال پسندی کا حُکم دِیا گیا ہو، اور اگر کوئی ایسا تاثر مِلتا بھی ہو تو وُہ غلط ترجمہ کی بناء پر ہے۔ "میانہ روی" ایک یُونانی نظریہ ہے نہ کہ کِتابِ مُقدّس کا۔

ضبطِ نفس کا دُوسرا نظریہ خُود ضبطی کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی اِنسانی ادراک اور ضمیر اُس کی خواہشات و جذبات کے مالک ہیں اِسی لیئے کوئی شخص اپنی کِسی خواہش کی تکمیل سے بالکُل اِنکار بھی کر سکتا ہے یا وُہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر کِسی خواہش کو جائز طریقہ سے پُورا کرے تو اُسے کِس طرح روکنا ہے۔ اِس قِسم کے ضبطِ نفس کے لیئے یُونانی لفظ "انکراطیہ" ایک عام یُونانی لفظ سے مُشتق ہے جِس کے معنی "قوّت" کے ہیں اور اِن معنوں میں ضبطِ نفس کِردار یا منشاء کی مضبُوطی اور قوّت کے بہُت قریب تر ہے۔ مُقدّس پُولس اِس خیال کو پسند کرتے ہُوئے مسیحی زندگی کا ایک پہلوان کی زِندگی سے موازنہ کرتا ہے "اور ہر پہلوان سب کا پرہیز کرتا ہے۔" (۱۔کرنتھیوں ۹ : ۲۵) اور یہاں جِس فعل کا ترجمہ "پرہیز کرتا ہے" کیا گیا ہے وُہ اُسی مصدر سے مُشتق ہے جِس سے انکراطیہ۔ اِسی قِسم کا ضبطِ نفس ایک مسیحی خُوبی ہے جِس کے تحت وقت کے تقاضے کے مُطابق ہم میں "نہ" کہنے کی جُرأت ہوتی ہے۔ ضبطِ نفس کی اِن دو اقسام میں فرق ظاہر کرنا لازمی ہے کیونکہ بہُت

سے بلند اخلاق لوگ تمباکو اور شراب سے قطعی پرہیز کرنے والوں کو بے اعتدال خیال کرتے ہیں۔ ایسے انتہا پسند لوگ اپنے اُن نقادوں کا خیال نہیں کرتے جو اعتدال پسندی کو ایک مسیحی خوبی تصوّر کرتے ہیں۔ درحقیقت ہم اسے مسیحی ضبطِ نفس نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس میں اعتدال پسندی بھی شامل ہو لیکن کبھی کبھی وہ انتہا پسندی کے لئے ہدایت کرتا ہے۔ ایک پہلوان جو اپنے جسم پر قابو پانا چاہتا ہے، اُسے اپنی زندگی میں کئی قسم کی چیزیں چھوڑنی پڑتی ہیں مثلاً بعض پہلوان بالکل شراب ترک کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک مسیحی کو بھی اسی طرح قطعی طور پر شراب کو ترک کرنا پڑے۔ یہی وہ عمل ہے جسے پولس رسول "پرہیز" کہہ کر پکارتا ہے۔

مغربی دُنیا میں نشہ آور مشروبات کا حد سے زیادہ استعمال اس قدر ایک خطرناک معاشرتی برائی بن کر رہ گیا ہے کہ لفظ ضبطِ نفس کا تعلّق شراب پینے سے پرہیز کرنے یا بالکل ترک کرنے سے ہے۔ لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ شراب پینے کی بجائے دوسری چیزوں سے پرہیز نہ کر سکیں مثلاً ایک شرابی کی نسبت وہ شخص جو سگرٹ پر سگرٹ پھونکنے والا ہو، عدم اعتدال کی عام مثال ہے اور وہ شخص جو جنسی خواہشات کا غلام ہے یا وہ جس کے ذہن پر کھیل کود سوار رہتی ہے وہ بھی اپنے آپ پر قابو رکھنے سے قاصر ہے۔ سی۔ ایس لوئیس نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ پیٹو پن کا ہمیشہ زیادہ کھانے سے ہی اظہار نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی عورت جو لذیذ کھانوں کی شائق ہے اور جو ہر وقت بڑبڑاتی رہتی ہے کہ اُس کا کھانا اچھّی طرح سے نہیں پکایا گیا، وہ بھی عدم اعتدال کی ایک مثال ہے اور یقیناً وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے سے معذور رہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سگرٹ نوشی جنسیات یا کھیل کود یا نازک طبع ہونا بذاتہ خراب ہیں بلکہ برائی اس میں ہے جب کسی شخص کی زندگی میں کوئی خواہش ایک اہم مقام حاصل کر لیتی ہے۔



اپنی قدرتی ضروریات کو پورا کرنے کے متعلّق تاریخ کلیسیا میں دو مختلف نظریات رہے ہیں۔ رومن کاتھولک کلیسیا کا اس نظریہ پر زیادہ زور رہا ہے کہ اعتدال پسندی سے اپنی خواہشات کو پورا کرنا ایک اچھّی بات ہے اور یہ خدا کی نعمتوں کو قبول کرنے کے لئے شکرگزاری کا اظہار ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو مے اس لئے دی تاکہ وہ اُس کے سرور کا باعث بنے۔ (زبور ۱۰۴ : ۱۵)۔ خود ہمارا خداوند اور اُس کے شاگرد شام کے کھانے کے ساتھ مے پیا کرتے تھے۔ اس نظریہ کے مطابق صرف خاص حالات میں کسی شخص کو خدا کی کسی ایک نعمت سے کُلّی طور پر اجتناب کے لئے بلایا گیا ہے چنانچہ یہ ممکن ہے کہ ایک خادم الدین مجرّد کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے بلایا جائے اور ایک شرابی کے لئے خدا کا یہ حکم ہو کہ وہ شراب پینا ترک کر دے۔ دوسری طرف پیوریٹین لوگ اپنے نظریہ کے مطابق اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سخت قسم کے مشروبات سے بالکل گریز کیا جائے جتنے کہ تھیئٹر اور ناچ رنگ سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ ان میں طرح طرح کی آزمائشیں پائی جاتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مسیح خداوند نے جس خود انکاری کا اپنے شاگردوں سے تقاضا کیا وہ یہی ہے (باب ۱۶)۔ مزید برآں یہی ایک مؤثر طریقہ ہے جس سے معاشرتی برائیوں یعنی شراب نوشی اور حد سے بڑھتی ہوئی جوئے بازی جیسی بری عادات سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ پولس رسول اُس وقت گوشت خوری ختم کرنے کے لئے تیار تھا جبکہ اُسے خیال تھا کہ اس کے اس فعل سے ایک ایسی غلط فہمی پیدا ہوگی جو اُس کے مسیحی بھائی کی تباہی کا باعث ہو سکتی ہے جس کے لئے مسیح خداوند نے جان دے دی (۱۔ کرنتھیوں ۸ : ۱۱) چنانچہ ہر مسیحی کو اس آرزو کے تحت شراب نوشی، تمباکو نوشی، سینما یا دوسری قسم کی عیش و عشرت سے پرہیز کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ کہیں یہ اس کے مسیحی بھائی کی تباہی کا باعث نہ ہو۔ ایسے معاملات کے فیصلہ میں مسیحیوں کو

CS CamScanner

ہمیشہ دقت درپیش رہی ہے کیونکہ انہیں حالات کا جائزہ بھی لینا ہے خواہ اُن کا محدود علم ہی کیوں نہ ہو مثلاً ایک مسیحی کو ایسے حلقہ میں تاش کھیلنا ترک کرنا ہوگا جہاں تاش کھیلنے سے جوئے بازی کی جاتی ہو حالانکہ وہ جانتا ہے کہ تاش کھیلنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔

## ۳۔ جِنسی خواہشات

ہم یہاں پر جنسی خواہش کو ضبط میں رکھنے کی مثال پیش کریں گے کیونکہ گذشتہ صدیوں میں ہمارے مسیحی معلّمینِ اخلاق کے لئے یہ 'خواہش' باعثِ تشویش رہی ہے۔ موجودہ نفسیات اس بات پر زور دیتی ہے کہ بنی نوع انسان میں یہ خواہش بہت زیادہ طاقتور ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جنسی خواہش نوجوانوں کے تصوّرات پر اس انداز سے چھا جاتی ہے کہ اُنکے طرزِ زندگی میں غیر ارادی طور پر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً اُن کے طرزِ لباس میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بعض لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ دوسرے جانوروں کی نسبت انسان میں یہ جبلّت بہت آگے بڑھ چُکی ہے۔ سی۔ ایس لوئیس اس امر کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ اس جبلّت کے تحت انسان کا طبعی مقصد بچّے پیدا کرنا ہے لیکن اُس کا جنسی میلان اور جنسی طاقت اس سے کہیں آگے بڑھ چُکی ہے مثلاً ایک واحد شخص اپنی تمام دوسری خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے گاؤں کی ہر ایک عورت کو حاملہ کر سکتا ہے۔ پھر جنسی خواہش دوسری خواہشات کی نسبت ایک قوّی محرّک ہے مثلاً بڑے سے بڑے پیٹو میں کھانے کی طشتریوں کو دیکھ کر اس قدر تحریک پیدا نہ ہوگی جیسا کہ ایک زناکار کی خواہشات اُبھرنے لگتی ہیں جب وہ عُریاں رقص میں ایک برہنہ عورت کو دیکھتا ہے۔ انسان کی دوسری جبلّتوں کی نسبت اُس کی جنسی جبلّت بہت زیادہ بگڑی ہوئی ہے مثلاً لونڈے بازی اس کی ایک نمایاں مثال ہے (رومیوں ۱: ۲۶-۲۷)



آج کل ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جنسیات میں شرمسار ہونے کی کوئی ایسی وجہ نہیں ہے اور یہ بالکل بجا ہے لیکن اُس وقت تک جبکہ ہمارے ذہن میں یہ نہ ہو کہ گرے ہوئے انسان میں غلط قسم کا جنسی استعمال ایسی باتیں ہیں جن سے ہمیں شرمسار ہونا چاہیئے۔

کتابِ مقدّس کا جنسیات کے متعلّق ایک نہایت اعتدال پسندانہ نظریہ ہے۔ کارِ تخلیق میں انسان کے لئے یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ "نر و ناری اُن کو پیدا کیا" (پیدائش ۱: ۲۷) خدا کی طرف سے انسان کے لئے یہ کتنی اچھی نعمت تھی کہ اُسے ایک ساتھی دی گئی تاکہ وہ اُس کے ساتھ ایک تن ہو (پیدائش ۲: ۱۸-۲۴)۔ کتابِ مقدّس اپنی عظیم شخصیتوں کی زندگی کیلئے جنسیات کو ایک لازمی حصّہ سمجھتی ہے۔ یہاں تک کہ خدا خود اُن میں دلچسپی لیتا ہے۔ جیسے کہ اُس نے اضحاق کے لئے بیوی ڈھونڈنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا (پیدائش ۲۴ باب)۔ لیکن یہ اپنی حقیقت پسندی کے پیشِ نظر جنسی بُرائیوں اور خطرات سے بھی دوچار ہے مثلاً تمر کی کہانی میں یہوداہ کے بیٹوں کو جنسی المیہ کی تلخی سے واسطہ پڑتا ہے اسی طرح سمسون اور داؤد کے واقعات میں جنسی خطرات کس قدر بھیانک ہیں۔ دوسری طرف غزل الغزلات کی کہانیوں میں یہی جنسی خواہش اپنے پُرسرور رومان پر ناز کرتی ہے۔ ہمارے خداوند نے خود امثال کے مصنّف کی طرح بُری نگاہ کے خطرات کی طرف اشارہ کیا لیکن اس جبلّت کے فطری نتیجہ کو اس صورت میں قبول کیا کہ اس کے تحت ایک مرد اور عورت ازدواجی رشتہ میں باندھے جاتے ہیں (مرقس $\frac{۱۰}{۶-۱۱}$) اور جنسی خواہش کے تحت گمراہ شدہ مجرموں سے نہایت ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا جیسے کہ اُس عورت کے ساتھ جو عین فعل کے وقت پکڑی گئی (یوحنا ۸: ۲-۱۱)۔ مقدّس پولُس نے ہوسیع نبی کی مانند شادی کے تعلّقات میں خدا اور اُس کے لوگوں کے تعلّقات کی نہایت موزوں تصویر دیکھی۔ (ہوسیع ۲ باب، افسیوں $\frac{۵}{۲۲-۲۵}$)

جنسی خواہش کی قوّت اور خطرناک امکانات مسیحیوں کو اِس قدر ہیبت ناک معلوم ہُوئے کہ ابتدائی کلیسیا نے اپنے گمُراہ شدُہ ردِّعمل سے تجرّدانہ زندگی کو شادی کی حالت پر ترجیح دی اَور اب بھی اکثر ایسا ہی ہوتا ہَے۔ ہم اِس کے لئے کچُھ وجُوہات دیکھ سکتے ہَیں (ا) ہمارے خُداوند نے سِکھایا کہ تمام مسیحی شادی شدُہ زِندگی بسر کرنے کے لئے نہیں بُلائے گئے (متی ۱۹ : ۱۲)۔ (ب) ازدواجی تعلقات میں اپنی محبّت کو صِرف ایک شخص تک محدُود کر دینا اُس عالمگیر محبّت میں دخل اندازی کا سبب بن سکے گی جس کا مسیحیوں سے مطالبہ کیا گیا ہَے۔ گویہ ایک خادم الدین کی تجرّدانہ زِندگی بسر کرنے کے لیئے نہایت موزُوں دلیل ہَے لیکن یہ کبھی بھی فیصلہ کُن دلیل نہیں بن سکتی، اور یہ ہمیں اُس خطرہ سے آگاہ کرتی ہے کہ ازدواجی زِندگی میں مَرد یا عورت ایک دُوسرے سے بُت پرستی کی حَد تک محبّت نہ کرنے لگیں۔ (ج) اِس سلسلہ میں ہمارے خُداوند اور اُس کی کنواری ماں کی مِثال پیش کی جا سکتی ہَے۔ (د) گو مقدّس پولُس نے مشورہ تو دیا لیکن اُس نے کرنتھس کے بِگڑے ہوُئے ماحول میں تجرّدانہ زِندگی بَسر کرنے کے لئے اِس اُمید میں کوئی حُکم نہ دیا کہ خُداوند کی آمدِ ثانی قریب ہَے جس سے شادی کا قدُرتی مقصد کالعدم قرار دیا جائے گا (۱۔ کرنتھیوں ۷ : ۱ — سے آگے)۔ (ہ) کلیسیا جلد ہی ایک یُونانی نظریہ کے زیرِ اثر آ گئی جو بالکُل عہدِ عتیق اَور مسیح خُداوند کی تعلیم کے برعکس تھا۔ یُونانیوں کے خیال کے مُطابق مادی بدن بذاتہٖ ایک بُری چیز ہَے۔ چُنانچہ جِنسی تعلّقات ایک "گھناؤنی تصویر" پیش کرتے ہیں۔ بالآخر مقدّس پولُس اِس تاثر کا خاکہ کھینچتا ہَے (فلپیوں ۳ : ۲۱، گلتیوں ۵ : ۱۷)۔ دَرحقیقت عہدِ جدید کی یہ تعلیم ہَے کہ کچُھ لوگوں کے لیئے مُمکن ہَے کہ وُہ ہمارے خُداوند کی طرح شادی کے بغیر ایک اچھّی اور پُرمسرّت زِندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر اِس پُر زور قدُرتی رجحان کے لیئے یہ ایک حقیقت ہَے تو دُوسری اِنسانی ضرُوریات جو قدُرتی اَور ضرُوری



ہَیں اُن کو پُورا کرنے کے لیئے اِس سے کہیں زیادہ اِمکانات ہیں مثلاً ملکیّت کی خواہش اور دُوسرے لوگوں کو محکُوم بنانے کی خواہشات کے لئے وغیرہ۔

## ۴۔ جِنسیات کے متعلّق چند غلط فہمیاں

آج کل ریڈیو اور جرائد کے ذریعہ سے غلط خیالات نوجوانوں کے ذِہن میں ڈالے جا رہے ہیں اَور پھر ایسے لوگوں کا کہنا ہَے کہ اُن خیالات سے اُن پر نفسیاتی اَثر ڈالا جاتا ہَے حالانکہ کوئی بھی مُستند ماہرِ نفسیات اِس نظریہ کا حامی نہ ہوگا۔

(ا) جِنسی جَذبہ کے بارے میں خاموشی کے باعث آج کل اِس کا غلط اِستعمال ہوتا ہَے۔

معزّز مسیحیوں کے لیئے جِنسیات کچُھ ایسی چیز تھی کہ وُہ اس کے متعلّق بات تک کرنا مُناسب نہ سمجھتے تھے، حتّے کہ بشارت میں سِوائے چند غیر واضح عام باتوں کے بہُت کم تذکرہ ہوتا تھا اَور اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نوجوان بالکُل اِس جبلّت کے مُتعلّق لاعِلمی کے ماحول میں پرورش پاتے۔ مزید برآں جِنسی مُعاملات کے لئے گھناؤنا سا تجسّس اَور خطرناک خیالات اُن کے ذِہن میں اُبھرتے رہتے لیکن اِس نظریہ میں بہُت کم حقیقت ہَے کیونکہ دیہات میں جو نوجوان بچپن ہی سے حیوانوں کے مُشاہدہ سے قدُرتی طور پر جِنسی حقائق کو جانتے ہیں، اُن کا بھی جِنسی روّیہ پر اتنا قابُو نہیں ہوتا بہ نِسبت اُن نوجوانوں کے جن کی شہر کے محفُوظ گھروں میں پرورش کی جاتی ہَے اَور جہاں زمانۂ حال میں ہر ایک چیز کی اِشتہار بازی میں ضرُور جِنسی تاثر ہوتا ہَے، وہاں بھی نوجوانوں کا اِخلاقی معیار اِتنا بلند نظر نہیں آتا۔ تاہم جِنسی تعلیم جو کچُھ سِکھا سکتی ہَے وُہ یہ ہَے کہ نوجوان کے دِل میں جِنسیات کے مُتعلّق جو تشویش ہوتی ہَے وُہ اُس سے تو نجات حاصل کر لیتا ہَے لیکن یہ کِسی طرح بھی کُلّی طور پر دِل کی پاکیزگی نہیں دے سکتی۔

CamScanner

(ب) جنسی جبلّت کو دبانا ایک خطرناک امر ہے۔

ماہرینِ نفسیات جسے اِنسدادِ جبلّت کے نام سے پکارتے ہیں وہ بالکل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ جِس اِنسداد کو خطرناک خیال کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے جنسی جذبات سے اِس قدر ڈرتا ہے کہ وہ اُنہیں اپنے "شعور" میں آنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اپنے "لاشعور" میں دھکیل دیتا ہے جہاں وہ تکلیف دِہ ثابت ہوتے ہیں۔ اِنسدادِ جبلّت یقیناً پُورے طور پر ایک صحیح قِسم کا ضبطِ نفس نہیں ہے (مقدّس پولُس کا انکراطیہ) بالکل قُدرتی ہے اور اِنسانی عادات کے عین مُطابق ہے۔ ایک بچّہ جو کافی بڑھ چُکا ہے وہ اپنے جسمانی کاموں پر ضبط حاصل کرنا سیکھتا ہے اور اگر ایک بالغ اپنے غُصّہ کے جذبات کو قابُو میں نہ رکھے تو یقیناً اِس کے خطرناک نتائج ہوں گے۔

(ج) جنسی عمل کبھی بھی غلط نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ فطری ہے۔

کِسی حد تک یہ اپنے محدُود معنوں میں بالکُل دُرست ہے کہ قُدرتی محرّک سے ہی گندی گُفتگُو یا شادی سے پہلے جنسی تعلقات پیدا ہوتے ہیں، جو مسیحیوں کے نزدیک بالکُل غلط ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خواہش ہمارے ضبط میں نہیں اور یُوں یہ اپنے آپ کو ایک بگڑی ہُوئی صُورت میں پیش کرتی ہے یا دُوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ یُوں اِس کا ناجائز اِستعمال ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے تو ہم جنسی خواہش کا غصّہ کی جبلّت کے ساتھ موازنہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ایک جائز قِسم کا غُصّہ بھی ہے جو ہماری اِنسانی فِطرت کا ایک اچھّا حِصّہ ہے جیسے کہ مسیح خُداوند نے بنی نوعِ اِنسان کے لئے لوگوں کی بے رُخی پر ظاہر کیا (مرقس ۳ : ۵) یا جیسے کہ ہم اُس وقت غُصّہ میں آجاتے ہیں۔ جب کوئی شخص کِسی بچّے کے ساتھ بُرا سلُوک کرے۔ لیکن ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ کِس طرح غُصّہ ہمارے لئے بُرائی اور خطرہ کا باعث ہو سکتا



ہے۔ کیونکہ اِس سے تشدّد اور فساد برپا ہوتا ہے۔ غُصّہ کی طرح جنسی جذبات کے لئے مُحتاط ضبط کی ضرُورت ہے اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ یہ بالکُل فِطری رہے۔ مسیحیوں کو چاہئیے کہ وُہ قدیم رسمِ تحریم کو کبھی بھی نہ اپنائیں۔ کیونکہ یہ بالکُل غیر فِطری اور کتابِ مُقدّس کی تعلیم کے بَرعکس تھی۔ اِس رسم کے تحت کچُھ ایسے بِدعتی نظریات پیش کئے گئے ہیں جو جنسیات کو ناپاک اور بُرا قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے تصوّرات کے مُطابق جنسیات کا تذکرہ تک کرنا مضحکہ خیز بات تھی۔ گو ہماری انسانی ساخت میں جنسی جذبہ کے کچُھ عجیب و غریب اِمکانات اور خطرات ہیں تاہم یہ ہماری فِطرت کا ایک حِصّہ ہے۔

(د) بے جا جنسی اِستعمال بدکاری کی نِسبت بیماری کی وجہ سے ہے۔

بعض واقعات میں یہ بالکُل دُرست ہے اور مسیحی ہوتے ہُوئے کِسی صُورت میں یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم کِسی پر اِلزام لگائیں یا کِسی کو مجُرم ٹھہرائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے خُداوند کی یہ خُوبی تھی کہ وُہ لوگوں کو جسمانی بیماری سے شفا دیتا اور اُن کے گُناہوں کو بھی مُعاف کر دیتا۔ ہم سب کے لئے یہ ایک مسیحی پیغام ہے کہ خواہ ہماری ناکامیوں کا کوئی بھی سبب کیوں نہ ہو ہمارے لئے نجات کی ایک اُمید ہے یعنی ہم کسی کو جو جنسی بیماری میں مُبتلا ہے، یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ مسیح خُداوند اُسے شفا دینے اور گُناہوں سے رہائی بخشنے پر قادر ہے۔

(ہ) جنسی گُناہ ہی بدترین گُناہ نہیں ہے۔

اگر ہم مُختلف گُناہوں کی مُتعلّقہ بُرائیوں کا جائزہ لیں تو غالباً یہ دُرست ہے کہ خود ہمارے خُداوند اور کلیسیا کی روایت کے مُطابق غرُور اور ریاکاری کو جسمانی گُناہوں سے بدترین ٹھہرایا گیا ہے لیکن اِس نظریہ کا یہ نتیجہ نہیں کہ وُہ بالکُل گُناہ نہیں ہیں۔ ہمارے خُداوند کی تعلیم کے مُطابق وُہ لوگ جو اپنی ازدواجی زِندگی میں ایک دُوسرے سے وفادار نہیں، وُہ گُناہ کے مُرتکب ہیں

اور وہ لوگ بھی جو کسی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ زنا کاری کے گُناہ میں مبتلا ہیں لیکن حقیقت اِس بات کی شاہد ہے کہ بہت سے لوگ اِن معیاروں سے گِر گئے ہیں۔ خُدا کی نظر میں فریسی کا اپنے دِل میں کسی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھنا ایک بڑا گُناہ ہو سکتا ہے بہ نِسبت اُس عورت کے جو زنا میں پکڑی گئی۔ (یُوحنّا ۸ : ۲-۱۱)۔ جب ہم اِس بات کو محسُوس کریں گے تو یہ ہمیں دُوسروں کی عیب جوئی کی آزمائش سے بچانے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگا اور اِس کے لئے بھی کہ ہم اپنا معیار بلند رکھیں۔

## ۵۔ موجُودہ صُورتِ حال

جنسیات کا غلط اِستعمال ایک ایسی آزمائش ہے جِس کی نسلِ اِنسانی ہمیشہ غلام رہی ہے اور اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ عصمت فروشی عورت کا ایک قدیم ترین پیشہ رہا ہے۔ آج کل یہ آزمائش قدرے سنگین ہوگئی ہے کیونکہ اِس جبلّت سے نا جائز فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے جِس سے ایک غلط قِسم کی تحریک پیدا کرنے کی صُورت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کل جذباتی ناول، سینما اور جرائد میں عُریاں تصاویر اور اخبارات کی اِطلاعات میں معنی خیز جنسی نمائش نوجوانوں کے کِردار کے لئے مُہلک ثابت ہو رہے ہیں۔ جنسیات کے موضُوع پر کتابیں جو گو فنّی لحاظ سے شاہکار کہلانے کی تو مُستحق نہیں، تاہم جنسی جبلّت کے لئے ایک قوی محرّک ضرُور ہو سکتی ہیں اور نوجوانوں کو چاہیئے کہ ایسی کتابیں پڑھنے سے اجتناب کریں۔ جبکہ مسیحی یہ جانتے ہیں کہ نہ تو نوجوانوں کو ایسی تحریک سے بالکُل محفُوظ رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایسا قدم مُناسب ہے لیکن وُہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ اِشتہار بازی کے زور پر قابُو پانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آج کل لوگ ایسی اِشتہار بازی کے غلام بن چُکے ہیں۔ موجُودہ صُورتِ حال میں ایک اور سبب یہ ہے کہ نوجوانوں کی تفریحات کے لئے فرُصت کے



اوقات میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اور اگر اِن فرُصت کے لمحات کو اچھی اور صحت مند تفریحات میں بسر نہ کیا جائے تو لازمی ہے کہ وُہ جنسی تصوّرات میں کھوئے رہیں گے اور یہ بھی عین مُمکن ہے کہ وُہ جنسی تعلقات میں اپنے وقت کو صرف کریں، حالانکہ ایسے تعلّقات کے لئے مُعاشرہ قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اِس سِلسلہ میں ہمیں یہ بھی کہنا لازمی ہے کہ عملی تعلیم کے لئے تخلیقی سَرگرمیوں اور تفریحات میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو اکٹھے شِرکت کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ وُہ اپنی بالغ زِندگی کے لئے قدرتی طور پر تیاری کریں۔ اگر تو نوجوانوں کا حقیقتاً اِن سَرگرمیوں کا تعلّق صِرف اُن کی اپنی ذات سے ہو تو معمُولی قِسم کی دکھاوے کی محبت کبھی بھی اُن کے لئے باعثِ نُقصان نہ ہو گی بلکہ یہ تعلیمی عمل کا ایک لازمی حصّہ ہو گی۔ سب سے لازمی اَمر یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے یہ تصوّر اور اُمّید پیش کی جائے کہ وُہ عنقریب خُوشگوار ازدواجی زِندگی بسر کرنے کو ہیں۔ نہ صِرف جسمانی طور پر بلکہ رُوحانی طور پر بھی۔ ایسا تصوّر اُن کی پاکیزہ زِندگی کے واسطے ممد و مُعاون ثابت ہو گا۔ کلیسیا کو اِس بات پر زور دینا چاہیئے کہ یہ ایک مسیحی معیارِ زِندگی ہے اور اُس کا فرض ہے کہ وُہ نوجوانوں کو تعلیم دے کہ شادی سے پہلے پاک دامنی کی زِندگی بسر کریں اور شادی کے بعد ایک دُوسرے سے وفادار رہیں۔ خُدا کی طرف سے اُس کے بچّوں کے لئے یہ جبلّت ایک بہترین تحفہ ہے لیکن صِرف اِس صُورت میں اگر اِس کا جائز اِستعمال کیا جائے۔ ہمیں کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ زِندگی میں یہی سب کُچھ ہے بلکہ اِس سے اہم ترین یہ ہے کہ ہم اپنے خُداوند کی تعلیم کے مُطابق پہلے خُداوند کی بادشاہی اور اُس کی راستبازی کی تلاش کریں (متی ۶ : ۳۳)

آزمائشوں کے خلاف ہر قِسم کی جدوجہد میں مسیحیوں کے لئے جنسی باتیں وُہ مقام ہے جہاں انہیں غلط یا دُرست طور پر ناکامی کا احساس ہے۔ مسیحی صلاح کار کو کبھی نہیں چاہیئے کہ وُہ کسی شخص کو جو احساسِ جُرم میں مُبتلا ہے،

اِس کی اِس طرح سے حوصلہ افزائی کرے کہ جو کچھ وُہ کر چکا ہے وُہ بالکل فطری بات ہے بلکہ وُہ یہ کرے کہ ایسے شخص کو خُدا کی محبّت، اُس کی معافی اور اس کی شخصی فکر کا یقین دلائے "کیونکہ خُدا نے بیٹے کو دُنیا میں اِس لئے نہیں بھیجا کہ دُنیا پر سزا کا حُکم کرے بلکہ اِس لئے کہ دُنیا اُس کے وسیلہ سے نجات پائے" (یُوحنّا ۳ : ۱۷)۔ مسیحیوں نے اُن لوگوں کو جو اپنی جنسی زندگی میں بھٹک گئے ہیں نکتہ چینی اور عیب جوئی کے ذریعہ سے بہُت نقصان پہنچایا ہے اور یہ فقیہوں اور فریسیوں کے اِس روّیہ کے عین مُطابق ہے جو اُنہوں نے زناکار عورت کے ساتھ ظاہر کیا (یُوحنّا ۸ : ۲-۱۱)۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کچھ لونڈے باز ایسے بھی ہیں جو بدکار ہونے کی نسبت جسمانی بیمار ہیں، اور وُہ شخص جو ہار کھانے کے بعد بھی لڑتا ہے اُسے معافی کی نسبت علاج کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا مسیحی ایمان ہے کہ اِن دونوں کا علاج مسیح خُداوند میں موجود ہے۔

---



## آٹھواں باب

# مسیحی اور اُس کا کام

## ۱۔ کام کے بارے میں کتابِ مُقدّس کا نظریہ

ہر روز کام کرنا اِنسان کی تقدیر میں شامل ہے "اِنسان اپنے کام کے لئے اور شام تک اپنی محنت کرنے کے لئے نِکلتا ہے" (زبُور ۱۰۴ : ۲۳)۔ پیدائش کی کِتاب میں اِنسان کو دُنیا کو محکُوم کرنے کا حُکم دیا گیا ہے (پیدائش ۱ : ۲۸)۔ اور ایک دیہاتی جانتا ہے کہ دُنیا کو محکُوم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ سخت محنت جس سے اُس کی خُوشی چھِن گئی ہے اور یہ اُس وقت سے ہے جب وُہ گُناہ میں گر گیا۔ آج کل ہم یہ کہتے ہیں کہ کام چیزوں کی قُدرتی ترتیب کا ایک لازمی حِصّہ ہے۔ لیکن گُناہ نے اِس قُدرتی ترتیب کو اِس طرح سے درہم برہم کر دیا ہے کہ اکثر کام اب اِنسان کے لئے سخت تکلیف دہ خیال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مقدّس مرقس کی انجیل میں مسیح خُداوند کو "بڑھئی" کا لقب دِیا گیا ہے اگر تو یہ اُس کے خاندان کی بجائے اُس کے ذاتی پیشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وُہ بھی اِنسان کے عام کام میں حِصّہ دار تھا۔ چیزوں کی قُدرتی ترتیب میں کام کی اہمیّت کا سب سے جاذِب توجہ وُہ بیان ہے جب پولُس نے اُن تھِسلنیکیوں کو لکھا جو مسیح کی آمد قریب کے مُنتظر اپنے تمام پیشوں کو چھوڑ چکے تھے۔ "اور جب ہم تمہارے پاس تھے اس وقت بھی تم کو یہ حُکم دیتے تھے کہ جِسے محنت کرنا منظور نہ ہو وُہ کھانے بھی نہ پائے۔" (۲۔ تھِسلنیکیوں ۳ : ۱۰) یوں معلُوم ہوتا ہے جیسے کہ یہ ایک ضربُ المثل ہے اور بعد ازاں چند یہُودی ربّیوں نے بھی کچھ اسی طرح سے کہا لیکن بنیادی طور پر یہ قول مُقدّس پولُس کا تھا جس نے اپنے اِس قول کے ثبوت میں اپنی مثال دی کہ وُہ بھی اپنی روزی کمانے کیلئے خیمہ دوزی

کرتا تھا۔ لیکن اِس سے یہ مطلب اَخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ اِس میں ایسی تعلیم ہے جس کے تحت بے روزگاروں کی مدد سے خواہ وُہ نجی سخاوت سے ہو خواہ حکُومت کے رفاہِ عامہ کے منصُوبہ کی طرف سے ممانعت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ مُقدّس پُولس کا موجُودہ صنعتی صُورتِ حال کے متعلق کوئی خیال نہ تھا جہاں بے روزگاری کی حالت میں لوگوں کی اپنے خُوشحال رشتہ داروں کی طرف سے زیادہ دیر تک مدد نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہاں پر مقدّس پولُس قانُونِ قدُرت کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اگر عام ہڑتال میں ہر طرف سے کام بند ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص کے لئے سوائے فاقہ کشی کے اَور کُچھ نہ ہوگا۔ یہ قول ہمیں یاد دِلاتا ہے کہ اِنسان کو اپنی روزی کمانے کے لئے بنیادی طور پر ہر روز کام کرنا ہوگا اَور کام کرنے میں کوئی عیب نہیں کیونکہ یہ ہماری زِندگی کے اچھے ضبط کا ایک حِصّہ ہے۔ اِس آیت میں کہ "مزدُور اپنی مزدوری کا حقدار ہے" اُس شخص کے لئے بھی اِتنی ہی حقیقت ہے جو غیر مذہبی کام میں مشغُول ہے جتنی کہ ایک انجیل کے مبّشر کے لیئے (لُوقا ۱۰ : ۷، ۱۔ تیمتھیس ۵ : ۱۸) ہاں البتّہ کام کیلئے ایک اَور محرّک بھی ہے جس پر ہم بعد میں غور کریں گے یعنی ہم اَدنےٰ سے اَدنےٰ ترین کام بنی نوعِ اِنسان کی خدمت کے لئے کر سکتے ہیں۔ محبّت کی راہ سے ہم ایک دُوسرے کے خادم ہیں (گلتیوں ۵ : ۱۳) اور لفظ خِدمت ہمیشہ "کام" کے معنوں میں مُستعمل ہوتا ہے۔

تاہم بائبل بعض مسیحی مُعلّمینِ اخلاق کی مانند کام کو اِتنا اہم بھی قرار نہیں دیتی۔ بائبل میں صِرف اِمثال کی کِتاب میں دستکاری کی تعریف کی گئی ہے (اِمثال ۳۱ باب)۔ لیکن اُس بیوی کے شوہر کی حقارت بھی نہیں کی گئی جو تقریباً مُلک کے بُزرگوں کے ساتھ شہر کے پھاٹک میں اپنا وقت گذارتا ہے۔ ایک انگریزی گیت جس کا ترجمہ یہ ہے "کام کر کہ رات جلد آتی" (میتھوڈسٹ عبادت کی کِتاب۔ گیت ۱۳۶) بالکُل ہمارے خُداوند کے اُس بیان پر مُشتمل ہے کہ



"ہمیں اُس کے کام دِن ہی دِن کو کرنا ضرُور ہے۔ وُہ رات آنے والی ہے جس میں کوئی شخص کام نہیں کر سکتا" (یُوحنا ۹ : ۴)۔ اِس میں کام برائے کام کو ایسا مُقام دیا گیا ہے جیسے بائبل میں کہیں اور زیادہ اہمیّت نہیں دی گئی۔ دُوسری طرف بائبل دستکاری کی حقارت بھی نہیں کرتی۔ قدیم یُونانیوں کا یہ رُجحان تھا کہ ایسے تمام کام غُلاموں کے لئے چھوڑ دیتے تھے لیکن ہم دیکھ چُکے ہیں کہ ہمارے خُداوند اَور مقدّس پولُس نے اپنے ہاتھ سے کام کئے۔

## ۲۔ پیشہ کا اِنتخاب

بعض لوگوں کو اِس بات کا شدید احساس ہے کہ کِس طرح اُن کے کِسی خاص پیشہ میں خُدا اَور اِنسان دونوں کی خِدمت کرنا اُن کی بلاہٹ میں شامل ہے اَور یہ بہُت اچھّا ہوگا اگر نوجوان دُعا کریں اَور اُن کی خواہش بھی ہو کہ وُہ خُدا سے راہنمائی حاصل کریں کہ وُہ کِس طرح اُن کی زِندگیوں کو اِستعمال کرنا چاہتا ہے۔ والدین کا بھی فرض ہے کہ وُہ اپنے بچّوں کے لئے خُداوند سے ایسی راہنمائی حاصل کریں۔ ایلگزینڈر مکائی کی والدہ جو موجُودہ یُوگنڈا کے مِشنری بانیوں میں سے ایک ہے، جب وُہ خُود ایک لڑکی تھی تو ایک مِشنری میٹنگ میں خُدا نے اُسے قائل کیا اَور اُس نے خُداوند سے وعدہ کیا کہ جب کبھی اُس کے ہاں بیٹا ہوگا تو وُہ اُسے بیرُونی مُمالک میں خُدا کی خِدمت کے لئے مخصُوص کر دے گی۔ جب خُداوند نے اُسے بیٹا عطا کیا تو اُس ماں کی کافی عرصہ تک یہی دُعا جاری رہی کہ گو اُس کا بیٹا انجینئر بن گیا تاہم وُہ خُدا کی بلاہٹ محسُوس کرے۔ لیکن بیٹے کو بلاہٹ اُس وقت ہوئی جب اُس کی ماں کا اِنتقال ہو گیا اَور اُس کی دُعاؤں کا جواب اُس وقت مِلا جب یُوگنڈا میں اُس نے بحیثیّت انجینئر کے خِدمت کی اَور مسیح کے لئے گواہی کا باعث بنا۔ ہم یہ کبھی خیال نہ کریں کہ اگر خُدا ہمیں کِسی خِدمت کے لئے بُلاتا ہے تو لازمی نہیں کہ یہ خدمت کلیسیائی حدُود

میں ہو، بلکہ یہ اِس سے باہر کسی بھی پیشہ میں ہو سکتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جن لوگوں نے دُنیا کی غیر مذہبی زندگی میں عظیم خدمات سرانجام دی ہیں وُہ حقیقتاً اپنے آپ کے لیئے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔

"تم اِس جگہ اتفاقیہ طور سے نہیں بلکہ یہی وُہ جگہ ہے
جہاں خُدا کو تمہاری ضرورت تھی۔"

مُصلحین نے دورِ وسطیٰ میں اِس تعلیم کے خلاف آواز بلند کی کہ صِرف کسی خادم الدین، راہب یا راہبہ کی مذہبی زِندگی ہی خُدا کی بلاہٹ میں شامل نہیں بلکہ تمام پیشوں میں خُدا کی خدمت ہے، اور اکثر ہمارا بھی آج کل یہی خیال ہے۔ مُصلحین کے اِس نظریہ میں ایک خطرہ بھی ہے کہ مُمکن ہے کہ ہم اِس حقیقت کو فراموش کردیں کہ بعض لوگوں کو امتیازی حیثیّت سے مذہبی کام کے لئے بُلاہٹ ہوتی ہے۔ نوجوان مَرد اَور عورتیں اَب بھی خُداوند کی آواز کو یہ کہتے ہُوئے سُن سکتے ہیں اَور سُنتے بھی ہَیں "مَیں کِس کو بھیجوں اَور ہماری طرف سے کون جائے گا" اَور وُہ خُدا کے فضل سے یہ جواب دیتے ہَیں "مَیں حاضر ہُوں۔ مجھے بھیج" (یسعیاہ ۶ : ۸)۔

تاہم تجربہ اِس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ بہُت سے لوگوں کے ذہن میں خواہ اُنہوں نے خواہش کی ہو یا نہ کی ہو بلاہٹ کا ایسا تصوّر نہیں ہے۔ کیونکہ بہُت سے لوگوں کیلئے پیشہ کا انتخاب اُن چیزوں پر ہے جن میں اُن کی کوئی دِلچسپی نہیں۔ عہدِ عتیق کے دَور میں اَور دُنیا کے بیشتر حِصّوں میں اَب تک بیٹے روایتی طور پر اپنے باپ کے پیشہ کو اختیار کرتے ہیں مثلاً یسُوع یُوسف کی مانند بڑھئی تھا اَور یعقُوب اَور یُوحنّا اپنے باپ زبدی کی طرح ماہی گیر تھے۔ آج کل لڑکے اَور لڑکیاں جب سکُول سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو مارکیٹ میں مزدُوری کی شرائط سے اُن کے پیشہ کا تعیّن ہوتا ہے اَور اِن شرائط کا یہ بھی تقاضا ہے کہ لوگ اپنی ادھیڑ عُمر میں اپنے پیشہ کو



تبدیل کریں۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص کو اُس کی صلاحیتیں اور خواہشات ایک خاص پیشہ کی طرف توجہ دلاتی ہیں تو اُس وقت بھی وُہ اِن خواہشات اور صلاحیتوں میں خُدا کی رہنمائی نہیں دیکھتا۔ لوگوں کے لئے یہ احساس ضرُوری ہے کہ وُہ پیشے جنہیں حالات نے اُن کی مرضی کے خلاف اختیار کرنے پر مجبُور کر دیا ہے، وُہ اُن میں بھی ایک مسیحی رَوّیہ سے خُدا اَور اِنسان دونوں کی خِدمت کر سکتے ہَیں۔
ہاں البتّہ کچُھ ایسے پیشے بھی ہیں جو کِسی بھی مسیحی کو اختیار نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ وُہ بذاتہٖ غیر اِخلاقی ہیں۔ مقدّس پولُس یُوں رقمطراز ہے "چوری کرنے والا پھر چوری نہ کرے بلکہ اچھّا پیشہ اختیار کر کے ہاتھوں سے محنت کرے تاکہ مُحتاج کو دینے کے لیئے اُس کے پاس کچُھ ہو" (افسیوں ۴ : ۲۸)۔ اِس سے صاف ظاہر ہَے کہ کِسی مسیحی کو چوری یا مزدُوری پر قتل کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ کچُھ اَور پیشے ہیں جو بذاتہٖ بُرے تو نہیں لیکن یہ نیکی کی نسبت زیادہ نُقصان دہ ثابت ہوتے ہیں مثلاً بعض جگہوں میں قرض خواہ، مختلف چیزوں کے ایجنٹ یا بغیر لائسنس کے منشیات کو فروخت کرنے والے وغیرہ۔ کچُھ ایسے پیشے بھی ہیں جن میں مثبتی طور پر کوئی نقصان تو نہیں لیکن مُعاشرہ کو اُن کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے مثلاً گھٹیا اور عامیانہ قِسم کی کتابیں لکھنا جو مقبُولِ عام ہیں یا سامانِ عِشرت کی اِشتہار بازی کرنے سے کوئی سُودمند نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کچُھ ایسے پیشے بھی ہَیں جو بذاتِ خُود جائز تو ہیں لیکن کسی مسیحی کو اِنہیں اختیار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اُس کے کردار میں کوئی ایسی کمزوری ہے جو وقت آنے پر بُرائی کی طرف مائل ہوگی مثلاً ایک حد سے شراب پینے والے کو کسی ایسے ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں جہاں گاہکوں کو شراب پیش کی جاتی ہے مُلازمت کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں تو اُسے ضرُور نشہ آور مشروبات سے واسطہ پڑے گا اَور کسی لونڈے باز کو فوج میں بھرتی نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ اُس کا مُعاشرہ صِرف اُس کے ہم جِنس لوگوں تک محدُود ہَے۔

CamScanner

## ۳۔ کام کے لئے شرائط

بہت سے پیشوں میں ایک مسیحی کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ بہ نسبت پیشہ کے اُس کا طریقِ کار کیا ہے۔ ایک اداکار یا موسیقار اپنے معاشرہ کی رُوحانی ضرُوریات کے تحت اُن کی خِدمت کر سکتے ہیں لیکن دُوسری طرف وُہ اپنے انہی پیشوں سے عوام کے کردار پر بُری طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اور کسان لوگوں کی پرورش کے لئے گندم بو سکتا ہے لیکن بعض ممالک میں وُہ لوگوں کی بدعنوانیوں کے لئے افیون بھی کاشت کرتا ہے۔ بہت سے دُکاندار یا تو معاشرہ کی ضرُوریات کو پُورا کرنے کے لئے اچھی خِدمت کر سکتے ہیں یا پھر زیادہ نفع کمانے کے لئے اِرادتاً عوام کو ترغیب دلاتے ہیں کہ وُہ گھٹیا اور ناکارہ چیزیں خریدیں۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روزی کمانا ہر شخص کا حق ہے لیکن مسیحیوں کو چاہیئے کہ اپنی دولت میں اضافہ کی نِسبت وُہ ہمیشہ دُوسروں کے لئے اچھی اور بہتر خِدمت کا خیال رکھیں۔ کلسیوں کے خط میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ "جو کام کرو جی سے کرو۔ یہ جان کر کہ خُداوند کے لئے کرتے ہو نہ کہ آدمیوں کے لئے" (کلسیوں ۳ : ۲۳، مُقابلہ کرو افسیوں ۶ : ۵ - ۸)۔ ہمارا کام نہ صرف ہمارے آجر کی خِدمت ہے بلکہ اِس کا یہ مُدعا ہے کہ عوام کی خِدمت کی جائے اور دیانتداری سے کام کرنے کا یہ محرّک ہے کہ ہم حاجتمندوں کی ضروریات کو رفع کریں (افسیوں ۴ : ۲۸)۔ بنی نوع انسان کی خِدمت کرنے سے ہم دَرحقیقت اپنے حقیقی مالک کی خِدمت کرتے ہیں اور اُس کے لئے جو کام بھی کریں وُہ نہایت تندہی اور جانفشانی سے کیا جائے تاکہ اِس سے یہ ظاہر ہو کہ ہم اُس سے وفادار اور اُس کے شُکرگزار ہیں۔ پاسبانی خطوط میں وفاداری سے کام کرنے کا پہلا تو یہ مقصد بیان کیا گیا ہے کہ اِس سے لوگ "ہر طرح کی دیانتداری اچھی طرح ظاہر کریں تاکہ اُن سے ہر بات میں ہمارے



منجی خدا کی تعلیم کو رونق ہو" (ططس ۲ : ۱۰)۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ "جتنے نوکر جوئے کے نیچے ہیں اپنے مالکوں کو کمال عزت کے لائق جانیں تاکہ خدا کا نام اور تعلیم بدنام نہ ہو" (۱ تیمتھیس ۶ : ۱)۔ مقدّس پولس بھی ہمارے اِس نظریہ سے بالکل متفق ہو گا کہ بے مین، تجارت یا کارخانوں میں اپنے ذاتی تعلقات اور کام کی نوعیّت سے خداوند کے گواہ ہیں۔

بائبلی ادوار میں آقا اور غلام کے آپس میں یہ تعلقات تھے کہ غلاموں کو آقا کی پوری فرمانبرداری میں رہنا ہوتا تھا۔ ایک غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مالک کی تابعداری کرے "ڈرتے اور کانپتے ہُوئے" (افسیوں ۶ : ۵) اُس کا حکم مانے "صاف دلی" سے (کلسیوں ۳ : ۲۲) "مالکوں کو کمال عزت کے لائق جانیں" (۱ تیمتھیس ۶ : ۱) اور اپنے مالکوں کے تابع رہیں اور سب باتوں میں انہیں خوش رکھیں اور اُن کے حکم سے کچھ انکار نہ کریں" (ططس ۲ : ۹)۔ مقدس پطرس اُن غلاموں کو جو اچھّے کام کرنے کے باوجود دکھ برداشت کرتے ہیں، نصیحت کرتا ہے کہ وُہ صبر سے دکھ برداشت کریں (۱ پطرس ۲ : ۲۵)۔ یہ درحقیقت اُن کی مصلحت کے لئے نصیحتیں تھیں تاکہ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھائیں اور ہر گاہ محتاط رہیں، کیونکہ رومی حکومت میں ان غلاموں کے کوئی ملکی حقوق نہ تھے۔ کتاب مقدّس میں ایسی نصیحتیں اور مشورے اس امر کی دلیل ہیں کہ موجودہ دَور میں ان کا مختلف حالات میں ہر ایک نظام پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ مالی نظام ہو، خواہ گھریلو، خواہ سرمایہ داری کا اور خواہ اشتمالی نظام ہو۔ اِن تمام نظاموں میں کچھ لوگ تو حکم دینے والے اور کچھ اِن احکام کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ مقدس پولس کی نصیحتیں اور مشورے مالکوں اور نوکروں کے متعلق، آجکل کے آجروں اور ملازموں پر لاگو ہیں۔ صنعت کاری میں جن لوگوں پر آجر ہیں وُہ انہیں بھی یاد دلائے گا کہ اُن کا بھی ایک آسمانی مالک ہے، تجارتی کاروبار میں ایسے لوگوں کے لئے ایک خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وُہ خدا کی راہنمائی کے جویاں ہوں اور راہنمائی حاصل کرنے کے بعد اس کی تابعداری کریں۔ اور کلیسیا کا بھی یہ فرض ہے کہ وُہ صنعت کاری اور

سیاست میں راہنماؤں کو یاد دلاتی رہے کہ انہیں اپنے آسمانی مالک کو جاننے اور اس کے احکام کی تعمیل کی ضرورت ہے۔

مقدّس پطرس اس معاملہ کو سلجھاتے ہوئے اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ غلاموں کی غیر واجبی تکالیف کی مذہبی لحاظ سے بہت ہی قدر و قیمت ہے کیونکہ یہ غلام مسیح کے دکھوں میں شریک ہیں "نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا۔ اور نہ دکھ پا کر کسی کو دھمکاتا تھا بلکہ اپنے آپ کو سچے انصاف کرنے والے کے سپرد کرتا تھا" (۱۔پطرس ۲۳:۲)۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دورِ حاضرہ میں ایک مسیحی کارندے کو راہنمائی کے طور پر یہ اصول اختیار کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ناروا سلوک کو بغیر احتجاج کے قبول کرے؟ کیا اسے ہمیشہ ہڑتال میں حصّہ لینے سے انکار کرنا چاہیئے۔ جو شاید ایک حقیقی ناانصافی کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے؟ قدیم غلامی اور جدید ملازمت میں نمایاں فرق ہے۔ پولُس رسُول جن غلاموں کو لکھ رہا تھا انہیں ہر حال میں دُکھ برداشت کرنے ہی پڑتے تھے اور ان کے پاس غیر منصفانہ تادیب سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایسے حالات میں صرف ایک چیز مددگار ثابت ہو سکتی ہے یعنی وہ رُوح جس سے تکلیفیں برداشت کی جاتی ہیں۔ اور اگر انہیں یہ احساس ہوتا کہ وہ مسیح کے لئے دکھ برداشت کرتے ہیں تو اُن کی اِس روح کو اور تقویت ملتی رہے۔ ہمارے اپنے زمانے کے ان مسیحیوں کے لئے جنہوں نے قید خانوں میں دکھ برداشت کئے ہیں، یہ احساس حوصلہ افزائی کا باعث ہوا ہے۔ عہدِ جدید میں کہیں بھی ایسی ترغیب نہیں دی گئی کہ مسیحی ارادتاً اپنے لئے دکھوں کی تلاش کریں۔ خود مسیح خداوند نے اپنے لئے دکھوں کی جستجو نہیں کی (مرقس ۳۶:۱۶)۔ اور ہمارے لئے یہ بھی واجب نہیں کہ ہم بیجا اطاعت سے ان ناانصافیوں میں اضافہ کریں جو ہمارے اور ہمارے ساتھیوں کے ساتھ کی گئی ہیں۔

ایک آزاد معاشرہ کی نسبت مسیحیوں کی اپنے ساتھی کارکنوں کے لئے یہ ذمہ داری ہے اور اُن کا یہ فرض ہے کہ اس بات کو دیکھیں کہ آیا انصاف



ہوا ہے یا نہیں؟ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ ایسے حالات بھی ہوں گے۔ جہاں انصاف کی محافظت کے لئے ہڑتال ہی واحد ذریعہ ہو۔ حالانکہ مغربی ممالک کے اعلیٰ ترین منظم صنعتی نظاموں میں ہڑتال ایک غیر مروجہ آلۂ کار ہوگا۔ ان ممالک میں جہاں صنعت و حرفت اس رفتار سے ترقی کر رہی ہے (جیسے کہ انیسویں صدی میں برطانیہ میں ہو رہی تھی)، وہاں کارکنوں کے حقوق کی محافظت کے لئے ٹریڈ یونینوں کی تشکیل، حتیٰ کہ ہڑتالوں میں شرکت کرنا تک ایک مسیحی کا فرض ہے۔

عہدِ جدید میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کسی پیچیدہ صورتِ حال میں (صنعتی جھگڑے اکثر پیچیدہ حالات ہوتے ہیں) ایک مسیحی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہٹ دھرمی کی نسبت صُلح کا آرزومند ہو خواہ اِس صُلح کا مطلب کسی نہ کسی حد تک ناانصافی کے سامنے جھک جانے کے کیوں نہ ہوں (متی ۳۹:۵)۔ کسی صنعت یا حکومت کے مقابلہ کیلئے دورِ حاضرہ کے کارکنوں کی قوت کا یہ بھی مطلب ہے کہ اُن کے پاس ایسی قوت ہے جس سے وہ امن قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طاقت سے پہلی صدی کے غلام بالکل محروم تھے۔ پھر بھی ایک مسیحی کا یہی فرض ہے کہ وہ ہر حال میں صلح کن ہو (متی ۹:۵)۔ موجودہ پیچیدہ صنعتی حالات میں پیشہ ورانہ مُعاملات کچھ اس طرح سے اُلجھے ہوئے ہیں جن سے ایک اجنبی بالکل لاعلم ہے۔ ان حالات کے لئے مسیحی معلّمینِ اخلاق اُسے سرسری طور پر مشورہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ایک مسیحی کو چاہیئے کہ اِن پیچیدہ حالات میں اس آزادی کو بروئے کار لائے جو اسے مسیح میں حاصل ہے اور اپنے لئے خود فیصلہ کرے۔ اور اُسے کبھی بھی یہ رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ دُوسرے ساتھیوں کی اندھا دھند تقلید کرے۔ کارندوں کے اجلاس میں ایک مسیحی کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے ووٹ کا استعمال نہ کرے اور دوسروں کا بھی خیال رکھے۔ نہ صرف اپنے ساتھی کارندوں کا جو اس کے ہم پیشہ لوگ ہیں بلکہ دوسرے پیشہ ور لوگوں کا بھی جن کا اس کی ٹریڈ یونین کی کارروائی سے ملازمت سے برخاست کئے جانے کا احتمال ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے آجروں

اُور عوام کا بھی جو اُس کے پیشہ سے مُستفید ہوتے ہیں، خیال رکھنا چاہیئے۔ اِن مختلف گروہوں کے لوگ اپنے ذاتی مفادات کے پیشِ نظر فیصلہ کریںگے۔ لیکن ایک حقیقی مسیحی ہر ایک خاص معاملہ کے لئے بہت غور و فکر اور دُعا کے بعد فیصلہ کریگا۔

آجکل مسیحی مفکّرین، مالکوں اُور ملازموں کے تعلقات کے لئے ایک یہ مسیحی تصوّر پیش کرتے ہیں کہ عام خدمت کے پیشِ نظر سب ایک دوسرے سے مُلحق ہیں۔ اِس تصوّر کے لیئے یہ بُنیادی امر ہے کہ صنعت کاری کے مختلف درجہ کے لوگوں میں حقیقی اور شخصی تعلقات ہوں۔ موجُودہ دور میں بڑی بڑی تجارتوں اور کارخانوں میں آجروں اور ملازموں کی نسبت رُومی حکومت میں کم از کم گھروں میں مالکوں اور غلاموں کے آپس میں زیادہ گہرے تعلقات، تھے۔ انتظامیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کارکنوں کے تفکرات، بے روزگاری اور بڑھاپے کی غرُبت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے اور کارکنوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اچھی طرح سے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کام کریں، غیر مصدقہ ہڑتالوں سے گریز کریں جن کا کسی شخص کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور ٹریڈ یونین کے کام میں پوُری طرح سے حِصّہ لیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی یونین کسی سیاسی پارٹی کے ہاتھوں میں آجائے۔ کیونکہ سیاسی کارکن عموُماً اپنے ذاتی مفاد یا سیاسی مقصد کیلئے کام کرتے ہیں۔

ہاں البتہ ایک مسیحی کو چاہیئے کہ وہ اپنے کام یا اپنی یونین میں کوئی ایسا کام نہ کرے جو اخلاقی لحاظ سے غلط ہو۔ ٹیکس سے بچنے کے لئے اسے حساب میں کسی قسم کا ردّو بدل نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی گاہکوں سے جھوٹ بولنا چاہیئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایسے کاموں سے انکار کے باعث ملازم کو برطرف کر دیا جائے لیکن یہی وہ کام ہیں جن سے ہم حقیقتاً مسیح کے ساتھ دکھوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک مسیحی کو چاہیئے کہ وہ مسلّمہ دستوروں اور معیاروں کو جو صریحاً غیر اخلاقی ہیں، تسلیم کرنے سے انکار کرے اور ہمیشہ ایسے معیاروں کو بلند کرنے کے لئے کام کرے اور اچھّی قسم کا مال تیار کر کے عوام کے لئے اپنی بہترین خدمات پیش کرے۔



## ۴۔ کام میں اوّلیت

کتابِ مقدّس کا یہ نظریہ بہت سے موجودہ معلمینِ اخلاق سے مختلف ہے کہ انسان کے روزمرّہ کام کی نسبت اور بہت سے کام ہیں جو اس سے اہم ہیں۔ "فانی خوراک کے لیے محنت نہ کرو۔ بلکہ اس خوراک کے لئے جو ہمیشہ کی زندگی تک باقی رہتی ہے" (یوحنا ۶: ۲۷)۔ ہمارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ ہمیں روٹی اَور کپڑے کی ضرورت ہے جو ہم اپنی کمائی سے حاصل کرتے ہیں اور وہ خود یہ چیزیں مہیّا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اگر ہم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کریں (متی ۶-۳۳)۔

اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اوّلین کام خُدا کی عبادت ہے "خدا نے انسان کو خاص کر اِس مراد سے پیدا کیا کہ وہ اسکا جلال ظاہر کرے۔" اگر اِس اوّلیت کو قبول کر لیں تو ہمیں ان دو نیم حقائق پر تنقیدی فیصلہ دینا ہوگا کہ "کام کرنا دعا کرنا ہے"۔ یہ ایک لاطینی ضرب المثل کا ترجمہ ہے جو غالباً ابُو کر لیا گئے اِس قول پر مبنی ہے۔ "ان کی دعاؤں کا مقصد اُن کے پیشہ کی ترقی ہے" (یشوع بن سیراخ ۳۸: ۳۹) جس امیر آدمی نے یہ لکھا اس کا غالباً یہ خیال تھا کہ ان کی دستکاری ہی واحد مذہبی خدمت تھی۔ لیکن اگر وہ دستکاری کے ساتھ دعا کو بھی شامل کرتے تو بہت بہتر ہوتا۔ تاہم کام خواہ کتنی اچھّی طرح سے خدا کے جلال کے لئے کیوں نہ کیا جائے یہ کبھی بھی عبادت کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک سچّے پرستار کے روزمرّہ کام میں یقیناً عبادت کی رُوح ہوگی اور یوں ان معنوں میں اس کا کام اس کی دُعا کا ایک حِصّہ بن سکتا ہے۔ موجودہ دور میں مسیحی مبشر اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ "عبادت اور کام دونوں ہم آہنگ ہونے چاہئیں"۔ لیکن اس سے کچھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کام اِن دونوں سے اہم تر ہے۔ اگر ہم یہ قبول کر لیں کہ مسیح نے کس طرح اپنے کاموں کو اولین جگہ دی تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہمارا کام ہماری عبادت سے ضرور ہم آہنگ ہو۔ یعنی جو کچھ ہم نے عبادت میں سیکھا ہے وہ

اپنے کام میں خدا کا جلال ظاہر کرنے کے لئے عمل میں لائیں۔

عہدِ جدید ہماری توجہ اس طرف بھی مبذول کرواتا ہے کہ ہمیں اپنے روزمرّہ کاموں میں مسیحی خدمت یا "نیک کاموں" کو ترجیح دینی چاہیئے یاد رہے کہ اس میں مسیحی گواہی اور خدمت دونوں شامل ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ مسیح کے نام میں اور مسیح کی خاطر کیا جائے اور اس میں اپنے ذاتی مفاد اور خود نمائی کا کوئی عنصر نہ ہو۔ اس میں ہمارے لئے مسیح میں خدا کا سیکھنا بھی شامل ہے "خدا کا کام یہ ہے کہ جسے اس نے بھیجا ہے اس پر ایمان لاؤ" (یوحنّا ۶ : ۲۹) ہمیں ایسے اعمال میں صرف بشارتی اور تعلیمی کام، بیمار پرسی اور گرجا گھر کی کوائر میں گانے کی مسلمّہ سرگرمیوں کو ہی شامل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ادنےٰ سے ادنےٰ خدمات بھی بھی مثلاً بھوکوں کو کھانا کھلانا یا تھکے ماندے مسافر کے پاؤں دھونا مسیح کے نام میں سرانجام دی جائیں (یوحنّا ۱۳ : ۱۵)۔ "جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ساتھ ہی کیا۔" (متی ۲۵ : ۴۰)۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنے روزمرّہ کام میں بمشکل ہی یہ اندازہ کرتے ہیں کہ ان سے بھی خدا کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ ہم اگلے باب میں یہ پیش کریں گے کہ ایسے لوگوں اپنے تفریحی اوقات کا کچھ حصّہ مسیح اور اس کی کلیسیا کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہیئے۔

مسیحیت میں کام کی اوّلیت کے لئے روزمرّہ کام کے ماحصل کی نسبت زیادہ تر انسان کے طرزِ زندگی سے تعلق ہے۔ جب کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم مسیح کے ساتھ ہمخدمت ہونے کے لئے بلائے گئے ہیں۔ تو ہمیں ہمیشہ یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ سب مزدوروں پر ہمارا نہیں بلکہ خداوند کا اعلےٰ اختیار ہے۔ جدید دَور میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پانچ سالہ منصوبہ سے زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم اس خیال کو قبول کر لیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یوں ہر ایک چیز کا انحصار ہمارے انسانی کام یعنی مزدور اور منصوبہ بنانے والے کی کوششوں



پر ہوگا۔ وہ لوگ جن کے ذہن میں ایسے منصوبہ کا تصوّر ہے انہیں شاید یہ احساس نہیں کہ کامل شہر "آسمان پر سے خدا کے پاس سے اترے گا" (مکاشفہ ۲۱ : ۲)۔ نئے آسمان اور نئی زمین میں تبھی ہمارا کوئی مقام ہوگا اگر ہم خاکساری سے خدمت کریں۔

## ۵۔ انسان کا تخلیقی کام

دورِ حاضرہ کا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہماری تخلیقی قوت یعنی چیزوں میں خوبصورتی پیدا کرنا اور انہیں بیش قیمت بنانا ایک ایسی خوبی ہے جس سے ہم یہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ انسان خدا کی شبیہ پر بنایا گیا ہے۔ لیکن کتابِ مقدّس میں ایسا کوئی اشارہ نہیں جو اس بات پر زور دیتا ہو کہ انسان میں خدا کی مخلوق ہونے کے علاوہ تخلیق کرنے کی قوت بھی ہے۔ پیدائش کے پہلے باب میں جو عبرانی لفظ خدا کے تخلیقی کام کے لئے استعمال ہوا ہے وہ کبھی بھی انسان کے کسی کام کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ ایک عبرانی شخص فنِ سنگ تراشی اور نقّاشی کو بُت پرستی کے مترادف خیال کرتا تھا۔ لیکن اسے فنِ موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ عہدِ عتیق میں فنکاری کے سلسلہ میں ایک قابلِ غور مستثنےٰ ہے کہ خیمہ اجتماع کے لئے خوب صورت سامان بنانے اور لباس تیار کرنے کے لئے کاریگر "روح اللہ سے معمور" تھے (خروج ۳۱ : ۲۶)۔ تمثیل نگاروں نے ہمارے خداوند کی بیان کردہ توڑوں کی تمثیل کو بہت سراہا ہے (متی ۲۵ : ۱۴۔۳۰) جس میں لفظی طور پر توڑوں کا تذکرہ ہے لیکن یہ ہماری انسانی صلاحیتوں اور خداداد فنکارانہ قابلیتوں کو پیش کرتی ہے۔ جب مقدس پولُس فلپی کے مسیحیوں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ وہ ان باتوں کا خیال رکھیں جو پسندیدہ، دلکش اور تعریف کی باتیں ہیں تو عہدِ جدید میں فنونِ لطیفہ کی قدرشناسی کے لئے یہ قریب ترین خیال ہے (فلپیوں ۴ : ۸) گو اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکاشفہ کی کتاب کی رنگین علامتوں کی طرف اشارہ ہے ہمارے موجودہ دور میں فنونِ لطیفہ کو بڑھتی ہوئی دولت اور تفریحی اوقات میں بائبلی دور کی نسبت

زیادہ اہمیّت حاصل ہے اور یہ نظریہ نہایت معقول ہے کہ ہمارا تخلیقی سرگرمیوں پر زور دینا اس تمام سچائی کی راہ کا ایک حصّہ ہے جو دنیا میں روح القدس کا کام ہے (یوحنّا ۱۶: ۱۳)۔

جب بائبل میں لفظ "کام" "خدا کی تخلیقی سرگرمی کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا کام بھی خدا کے کام کی علامت ہے تخلیقِ کائنات کی کہانی میں انسان کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو محکوم کرے۔ (پیدائش ۱: ۲۸) اور موجودہ سائنس اور تکنیکی کام کے کمالات اس حقیقت کا نتیجہ ہیں کہ انسان خدا کی شبیہ پر بنایا گیا ہے۔ انسان کی اپنے روزمرہ کام میں ایک دوسرے سے باہمی رفاقت جو کہ تقسیمِ کار کا مسیحی نتیجہ ہونی چاہیئے، وہ مقدسین کی رفاقت اور تیاری کی علامت ہے۔

پھر روٹی اور مے جو خُدا کی قدرتی نعمتوں یعنی گیہوں اور مے سے انسان اپنی محنت سے تیار کرتا ہے۔ انہیں مسیح خداوند نے خود علامتی طور پر استعمال کیا یعنی روٹی کو اپنے بدن کے لئے جو انسان کے لئے توڑا گیا اور مے کو خون کیلئے جو صلیب پر بہایا گیا۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہمارا روزمرّہ کام، کثرت کی زندگی میں ضرور اپنے مقام کو حاصل کرے گا۔



# نواں باب

# مسیحی اور اس کے اوقاتِ فرصت

## ۱- اوقاتِ فرصت کی ضرورت

گذشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کام انسان کی تقدیر میں شامل ہے۔ تاہم کام ہی زندگی میں سب کچھ نہیں ہے۔ پیدائش کی کتاب میں تخلیقِ کائنات کی کہانی میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ "خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا۔ ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا۔ ساتویں دن فارغ ہوا۔" (پیدائش ۲: ۲)۔ اور خروج کی کتاب میں خدا کے چوتھے حکم میں بتایا گیا ہے۔ کہ سبّت کے دن کام سے فراغت حاصل کی جائے (خروج ۲۰: ۱۱)۔ ہم آج کل یہ کہتے ہیں کہ ایک عقلمند زندگی کے لئے باقاعدہ کام اور آرام کی ضرورت ہے۔ استثنا کی کتاب میں شرعیتی قوانین کے تحت سبّت کے دن بیل، گدھے اور نوکروں کو بھی آرام کے لئے کہا گیا ہے (استثناہ ۵: ۱۴)۔ جدید صنعت کاری کی شرائط میں جب کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معاشی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مشینیں انسان کے لئے چوبیس گھنٹے کام کریں۔ لیکن مشینوں کو چلانے والا انسان اتنی دیر تک کام کرنے سے معذور ہے۔ اور اسی احساس کے پیشِ نظر صنعتی قوانین میں دن بدن یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے کہ اوقاتِ کار کم سے کم ہونے چاہئیں۔ جیسے کہ مغرب میں صرف پانچ دن کام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلد از جلد دوسرے ممالک میں بھی یہ قانون رائج ہو جائے گا۔

جن دنوں انسان کا کام زیادہ تر اپنے ہاتھوں کی مشقت پر مبنی تھا۔ اس وقت اس کے لئے زیادہ آرام اور نیند کی ضرورت بھی تھی۔ عہدِ عتیق میں سبّت کی پابندی کا اولین یہی مقصد تھا کہ اس دن کام سے فراغت حاصل کی جائے۔ آج کل جب کہ دن بدن مشینوں کے استعمال سے انسانی محنت کم ہو رہی ہیں تو اس کے لئے کام سے اجتناب ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس شخص کے لئے جو اپنے کام میں ہر وقت کرسی پر بیٹھے فائلوں پر جھکا رہتا ہے لازمی ہے کہ وہ اپنی تفریح طبع کے لئے کھلی ہوا میں ورزش کرے، اپنے باغیچہ میں کھدائی کرے یا گھر میں کوئی اور فالتو کام کرے "خود کام کرو" کی تحریک جس سے مغربی لوگ اپنے گھروں میں خود رنگ روغن کرتے۔ یا بجلی اور نل سازی کا کام کرتے ہیں۔ تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے ان کاموں کو اختیار کرتے ہیں بلکہ اس کا اولین مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے روزمرّہ کام سے بالکل مختلف کاموں کو تفریحِ طبع کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے کریں معلّمینِ اخلاق یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ کونسے کام میں روحانی تازگی اور سکون ملتا ہے۔ تاہم وہ صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ ہر انسان کو کام اور آرام کی ضرورت ہے۔

بائبل کے لوگ دوسرے زمانوں اور ملکوں کے مذہبی لوگوں کی طرح خدا کی عبادت میں سب سے زیادہ تازگی محسوس کرتے ہیں۔ مزامیر اس رُوح سے بھرپور ہیں کہ عبادت باعثِ فرحت اور باعثِ برکت ہے۔ ہم میں سے اکثر مسیحی کلیسیا کے مقدّس دنوں کو موجودہ ایّام میں محض ایک غیر مذہبی چھٹی سمجھ کر گذار دیتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان ایّام میں جب کہ یہ دن نہایت جوش و خروش سے مذہبی مقصد کے تحت منائے جاتے تھے تو اکثر یہ موسیقی، رقص اور خوشی کے دن ہوتے تھے۔ یہودیوں کے لئے سبّت اور پیوریٹن مسیحیوں کے لئے اتوار ایسے دن ہیں جب کہ مذہبی پابندی صرف کام سے فراغت اور انفرادی اور عبادتِ عامہ تک محدود تھی اور ان مسیحیوں کے لئے دوسرے مقدّس دن یعنی کرسمس اور ایسٹر بنیادی



طور پر خوشی منانے اور رفاقت کے دن تھے تاکہ ان سے خدا کا جلال ظاہر کیا جائے۔

دورِ حاضرہ میں فرصت کے اوقات کے لئے ایک قسم کی کشمکش ہے کہ آیا اسے مذہبی سرگرمیوں یا محض تفریحِ طبع کے لئے استعمال کیا جائے اور یہ کشمکش ان لوگوں کے درمیان باعثِ بحث و تمحیص بن گئی ہے جو اتوار کی پابندی کے سختی سے قائل ہیں اور وہ جن کا یہ نظریہ ہے کہ یہودی سبت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسے موجودہ حالات میں ورزش کرنے، کھیلنے یا تخلیقی فنون کی مشق کرنے کے لئے بسر کیا جائے نہ کہ صرف خدا کی عبادت کے لئے۔ یقیناً ایسی سرگرمیاں انسان کے فرصت کے لمحات کے لئے خدا کی اچھی نعمتیں ہیں۔ اس بحث و تمحیص سے دونوں نظریات کے لوگوں کو ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنا چاہیئے۔ وہ لوگ جو اتوار اور دوسری تعطیلات کو مذہبی پابندی کے تحت نہیں گذارتے انہیں یہ سیکھنا ہے کہ ان ایّام میں خدا کی عبادت کرنا بھی لازمی ہے (لیکن یہ محض رسمی طور پر نہ ہو) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مذہبیات میں عملی جستجو کی نسبت خاموش گیان دھیان ہی تفریحِ طبع کا باعث ہو ——— وہ جو سبّت کی نہایت سختی سے پابندی کرتے ہیں انہیں یہ سیکھنے کی ضرورت ہے کہ نہ صرف سبت کا دن بلکہ پوری زندگی خدا کے لئے مخصوص ہے۔ سبّت کی پابندی کرنے والے کی نسبت ایک دوسرا شخص انہی تفریحات اور روزمرّہ کام میں بھی مذہبی زندگی بسر کرتا ہے۔

## ۲۔ اوقاتِ فرصت کے خطرات

ایک ضرب المثل میں یہ کہا گیا ہے "خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہے" اور بہت سے مسیحی معلّمینِ اخلاق اِس وجہ سے کام کی ترغیب پر زور دیتے ہیں کیونکہ اس طرح مشغول رہنے سے لوگوں کے پاس بُرائی کے لئے کوئی وقت نہ ہوگا۔ لیکن یوں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ زیادہ تھکاوٹ

سے کچھ ایسی آزمائشیں بھی ہیں جو انسان کو تن پروری کی طرف مائل کریں گی۔ تاہم تجربہ شاہد ہے کہ کاہلی میں بہت سے خطرات ہیں۔ ہم نے ساتویں باب میں ذکر کیا ہے کہ اگر نوجوانوں کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی کام نہ ہوگا تو جنسی خیالات ان کے ذہن پر مسلط ہو جائیں گے۔ اور یوں جنسی تصورات میں اپنا بہت سا وقت صرف کر دیں گے اور اگر وہ کسی صحبت میں بیٹھے ہوں تو فحش قسم کی گفتگو سے ان کے کردار میں خطرناک نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ سُست اور کاہل لوگ خواہ وہ مغربی عورتیں ہوں جو چسکیاں لے لے کر چائے یا کافی پی رہی ہوں، خواہ وہ مشرقی کسان جو گاؤں کے کنوئیں پر بیٹھے حقّے کے کش لگا رہے ہوں لازماً کینہ پرور گفتگو کی طرف مائل ہوں گے جس سے سوائے دشمنی اور تکلیف کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر نوجوان لڑکوں کے پاس کوئی کام نہ ہو تو وہ چیزوں کی توڑ پھوڑ یا جانوروں کو ظلم کا نشانہ بنانے میں اپنا وقت صرف کریں گے۔ اور بچے لاشعوری طور پر ایسے کام کریں گے۔

جب تک کہ لوگ سوائے کھانے اور سونے کے تمام وقت اپنے آپ کو مصروف نہ رکھیں تو لازمی ہے کہ وہ کچھ دوسری قسم کی سرگرمیوں کی طرف مائل ہوں گے۔ ان میں سے چند ایک کا ہم دوسرے حصّہ میں بیان کریں گے۔ دورِ حاضرہ میں فرصت کے لمحات میں ایسی تفریحی سرگرمیوں سے ایک اور نیا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جیسے کہ ہم نے گذشتہ باب میں دیکھا کہ اپنی روزی کمانے اور روزمرّہ کام کے علاوہ زندگی میں اور بھی بہت سے اہم کام ہیں۔ جدید دور میں انسان اِسے تسلیم تو کرتا ہے لیکن وہ اپنی تفریحی سرگرمیوں کو اوّلین مقام دینا چاہتا ہے۔

ایک مسیحی کو اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ایسی دلچسپیوں مثلاً کھیلوں میں حصّہ لینے، ٹیلی ویژن یا رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کو ثانوی مقام دینا چاہیئے۔ ایک اچھا ذہن جب ان چیزوں کا جائز استعمال کرتا ہے



تو اس میں خدا کی خوشی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تفریحات کسی شخص کی زندگی میں وہ مقام حاصل کریں جو انسان کو اپنے خدا اور دوسرے پڑوسیوں کو دینا چاہیئے۔ ہمارے لئے بت پرستی میں عبادتی طور پر کوئی جاذبیت نہیں۔ لیکن اپنے دلوں میں اپنی تفریحات مثلاً کرکٹ، موسیقی یا ادب کو اہم مقام دینا بھی بت پرستی کے عین مترادف ہے حالانکہ یہ تمام چیزیں خدا کے لئے مخصوص ہونی چاہئیں۔

## ۳۔ اوقاتِ فرُصت کا استعمال

محض آرام طلبی کی نسبت ہمارے اوقاتِ فرصت کا بہترین استعمال کھیلوں سے ہے۔ کھیل کی سرگرمیاں کاروباری سرگرمیوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کیونکہ وہ بذاتہ دلچسپ ہیں۔ حالانکہ ہم یہ بھی جانتے کہ ان سے آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو کھیل سے پیسہ کماتا ہے اُسے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کھیل کام کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جیسے کہ ایک بچہ اپنی کھیلوں میں بڑے لوگوں کے کاموں کی نقل کرتا ہے۔ بعینہٖ ایک بالغ کی کھیلوں میں ایک بچّے کی سرگرمیوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ گو تفریحات ضرور کٹھن سے کٹھن زندگی میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں لیکن وہ لوگ جو سخت جسمانی محنت کرتے ہیں انہیں کھیل کود کی نسبت آرام کی زیادہ ضرورت ہے بائبل کے مصنفین نے کھیل کے معاملہ میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی ہے حالانکہ مصر اور اسوُر کی ترقی یافتہ تہذیبوں میں کھیلوں کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے عالمگیر قسم کی تفریحات یعنی موسیقی اور رقص کو ترجیح دی۔ جسے خدا کی عبادت میں بھی ایک اہم مقام حاصل تھا اور جس سے مصنفین کا خاص تعلق تھا۔ آج کل کلیسیا کو اس سے خاص دلچسپی ظاہر کرنی چاہیئے کہ وہ نہ صرف موسیقی کا محض مذہبی زندگی کے لئے انتظام

کرے بلکہ عوام کی تفریحِ طبع کے لئے مسیحی ڈراموں کو سٹیج کرنے کا بھی اہتمام کرے جبکہ فرصت کے لمحات میں منظم کھیلوں کو دیکھنے کے لئے اہم مقام ہے تو یہ بہتر ہوگا اگر نوجوان کھیل دیکھنے کی بجائے کھیل میں حصّہ لیں اور وہ نہ صرف چیزوں کو دیکھنے والے ہوں بلکہ کام کرنے والے ہوں۔

جرمن ماہر علم الہیات برُونر نے لکھا "محنت و مشقت کی زندگی میں فن سب سے بہترین تفریحِ طبع کا ذریعہ ہے اور بہت سے لوگوں کے لئے ان کے فرصت کے لمحات میں فن، موسیقی یا ادب سے لطف اندوز ہونے کا واحد موقع ہے۔اس طرح فرصت کے لمحات کے استعمال کے لئے ہمارے پاس مقدّس پولُس کی یہ شہادت ہے جتنی باتیں سچ ہیں اور جتنی باتیں شرافت کی ہیں اور جتنی باتیں واجب ہیں اور جتنی باتیں پسندیدہ ہیں اور جتنی باتیں دلکش ہیں غرض جو نیکی اور تعریف کی باتیں ہیں۔ ان پر غور کیا کرو" (فلپیوں ۴ : ۸)۔ بدقسمتی سے ایسی موسیقی، عامیانہ اور جذباتی نقاشی اور لِٹریچر کتابیں بھی ہیں جو شہوت انگیز ہونے کے باعث انسان کے اخلاق پر بُری طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ مقدس پولُس کے الفاظ میں یہ نصیحت پوشیدہ ہے کہ ایسی تمام چیزوں سے اجتناب کیا جائے۔ کیونکہ وہ بیکاری کی طرح ذلّت آمیز ہیں۔ خاص کر مسیحیوں کو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سینما، ریڈیو یا ٹیلیویژن پر جو کچھ ان کی تفریحِ طبع کے لئے پیش کیا جائے، اس میں احتیاط کریں۔ اور اچھّی باتوں کو اپنے لئے پسند کریں اور خاص کر وہ اِس بات کا بھی خیال رکھیں کہ اُن کے بچّوں اور نوجوانوں کے لئے ایسے مواقع مہیّا کئے جائیں جن سے وہ صرف اچھی باتیں سن سکیں اور اچھّی چیزیں دیکھ سکیں۔ فرصت کے لمحات کا ایک اور سُود مند طریقہ یہ ہے کہ اس وقت ہم فنونِ لطیفہ کی طرف اپنا دھیان لگائیں۔ اس کا اطلاق نہ صرف تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں پر ہوتا ہے بلکہ ہمارے مشاہدہ میں آیا ہے کہ داستان گوؤں، موسیقاروں اور گاؤں کے دستکاروں نے نہایت احسن طریقہ سے اپنے فنون کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایسی صلاحیتیں براہ راست خدا کے جلال کے لئے استعمال



کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً گرجا گھر میں موسیقی کا پروگرام مرتب کرنا اور اسے عبادت کیلئے آراستہ کرنے سے ہم خدا کا جلال ظاہر کر سکتے ہیں۔ ایسی باتوں کو عہد عتیق کے خیمہ اجتماع اور ہیکل میں جو مقام دیا گیا ہے۔ مسیحیوں کو اس سے نمونہ حاصل کرتے ہوئے اس تحریک کو اپنانا چاہیئے۔

یہ درست ہے کہ مسیحیوں کو مسیح خداوند اور کلیسیا کی خدمت کے لئے اپنے فرصت کے لمحات کا کچھ حصّہ دینا چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ دور میں بہت سے لوگ اپنے اکتا دینے والے روزمرّہ کام میں بمشکل یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس سے اپنے ہم جنس انسانوں اور مسیح خداوند کی خدمت کر رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا یہ احساس ہے کہ ان کا کام ایسی خدمت کے لئے بے معنی ہے تو اس احساس سے بچنے کے لئے وُہ اپنے فالتو اوقات میں ایسی مسیحی خدمت کریں مثلاً وہ بیماروں کی بیمار پرُسی کریں اور اچھے مقاصد کیلئے روپیہ جمع کر سکتے ہیں لیکن کبھی ایسا نہ ہو کہ ایسی سرگرمیوں سے ان کا یہ احساس چھن جائے کہ ان کا عام کام بھی مسیحی خدمت میں شمار ہے۔

## ۴۔ یہودی سبّت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہد عتیق میں فرصت کے لمحات کے لئے ہفتہ وار سبّت کا دستور تھا۔ یعنی ہفتہ کے دن ان کا آرام کا دن تھا۔ اس کی پابندی کے لئے بہت سی وجوہات دی گئی ہیں (ا) تخلیق کائنات کے ساتویں دن خدا نے آرام کر کے ایک نمونہ پیش کیا (پیدائش ۲ : ۲، ۳ ؛ خروج ۲۰ : ۱۱) اور یہ آیات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ ہفتہ وار آرام کا دن نظامِ قدرت کا ایک حصّہ ہے (ب) اسرائیلیوں کو مصر کی غلامی سے مخلصی کے لئے اس طور سے شکر گزاری پیش کرنا تھی کہ وہ اپنے غلاموں اور جانوروں کو ہفتہ میں آرام کے لئے ایک دن دیں۔ (استثنا ۵ : ۱۵)، (ج) سبّت اس عہد کا نشان تصوّر کیا جاتا تھا۔ جو خدا نے اپنے لوگوں سے باندھا اور بنی اسرائیل اپنے غیر مذہبی کاموں سے اجتناب کرتے ہوئے خدا کے لئے ایک

مقدس دن منانے سے یہ گواہی پیش کرتے تھے کہ وہ خدا کے عہد سے وابستہ ہیں (حزقی ایل ۲۰: ۱۲، ۲۰)۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ یہودی سبّت پر کام سے فراغت کی نسبت عبادت کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم سبت کے دن قربانیاں ضرور پیش کی جاتی تھیں جو کہ عبادت کا ایک حصّہ ہے (احبار ۲۴: ۸، گنتی ۲۸: ۹-۱۰) اور بعد میں سبّت کے دن عبادت خانوں میں باقاعدگی سے عبادت کا دستور رائج ہو گیا۔

گو ہمارا خداوند دستور کے مطابق سبّت کے روز عبادت خانہ میں عبادت کے لئے جاتا (لوقا ۴: ۱۶) تاہم مذہبی راہنماؤں کی نظر میں وہ کھٹکتا تھا کیونکہ انکے خیال کے مطابق وہ ایک ایسا شخص تھا جو سبت کے قانون کو توڑنے والا تھا۔ اس نے سبت کے دن اپنے آسمانی باپ کی تخلیقی سرگرمیوں میں اس طرح سے حصّہ لیا کہ اس نے اس خاص دن پر لوگوں کو زندگی اور صحت بخشی لیکن اس حقیقت کو اسکے مخالفین بالکل نہ سمجھ سکے (یوحنا ۵: ۱۶-۱۸) اس کا یہ نظریہ تھا کہ سبّت کی پابندی بذاتِ خود ایک حصول مقصد نہیں بلکہ انسان کی اپنی بہتری کے لئے ایک خداداد نعمت تھی (مرقس ۲/۲۷) بحیثیت ابنِ آدم کے یسوع نے سبت پر اپنا پورا اختیار ظاہر کیا (مرقس ۲/۲۸) اور یہودی روایات میں سبّت کی پابندی کے لئے جو متعدد دبے معنی قوانین تھے انہیں رد کر دیا۔ مثلاً فصل کٹائی کے کام جتنے کہ گندم کی بالیں مروڑنا اور سبّت کے روز چیزوں کو اٹھانا تک ممنوع تھا (لوقا ۶: ۱-۱۰، یوحنا ۵: ۱۰-۱۱)

ایسے ہی مقدس پولُس نے اپنے غیر قوم سے نومریدوں کے لئے دعوے کیا کہ وہ سبّت کی پابندی سے آزاد ہیں اور خاص دنوں کو منانے کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے (گلتیوں ۴/۱۰، رومیوں ۱۴/۵، کلسیوں ۲/۱۶)۔

## ۵ مسیحی یہودی سبّت کو چھوڑ کر اتوار کے دن کو کیوں اور کس طرح منانے لگے۔

ابتدائی مسیحی شاید ایسی تعلیم سے متاثر تھے کیونکہ جلد ہی انہوں نے



خداوند کے دن کو منانے کے لئے یہودی سبّت کو ترک کر دیا۔ یعنی وہ دن جسے ہم آج کل اتوار کہتے ہیں۔ عہدِ جدید میں کہیں بھی ایسی تعلیم نہیں کہ یہودی سبّت کی طرح اتوار کی پابندی کی جائے۔ لیکن کلیسیا نے دس احکام کو جب اخلاقی ضابطہ کے خلاصہ کے طور پر قبول کیا ہے تو اس میں چوتھا حکم بھی شامل ہے جس میں سبّت کو ماننے کے متعلق کہا گیا ہے۔ ہفتہ میں آرام کے لئے ایک دن مخصوص کرنا اور جن اشخاص کو کم مراعات ملی ہیں انہیں ہفتہ کے بعد ایک چھٹی دینا اور خدا کی عزت میں دنیا کے سامنے گواہی پیش کرنے کے لئے ایک دن کو مقدّس ٹھہرانا یقیناً عہدِ عتیق کی وراثت ہے۔ سبت کی اس قسم کی پابندی مسیح خداوند کے عین تصوّر کے مطابق تھی اور ہمیں بھی چاہیے کہ انہی باتوں کے پیش نظر اتوار کی پابندی کریں کیونکہ جلد ہی یہ تمام عناصر مسیحی اتوار کا جزو بن گئے تھے لیکن بدقسمتی سے اتوار کی پابندی کیلئے کچھ ایسے قانون بنا دیئے گئے جنہیں خود ہمارے خداوند نے ردّ کر دیا تھا۔

ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کن وجوہات کی بنا پر مسیحیوں نے ہفتہ کی بجائے اتوار کو چھٹی کا دن چنا (ا) اتوار مسیح کا یومِ قیامت تھا۔ چنانچہ اس کے احترام میں یہ دن منانا نہایت موزوں تھا۔ اور اب بھی سب سے پہلے ایسٹر کے دن کی مانند لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس دن قوّت و تازگی اور زندگی کی جستجو کریں۔ (ب) اتوار پنیکوست کا دن تھا۔ جب خدا نے انسان کو نیا بنانے کے لئے اس پر رُوح القدس نازل کیا (ج) یہ اس بات کی بھی یادگاری ہے کہ پیدائش کی کتاب میں تخلیقِ کائنات کی کہانی میں اتوار کے دن روشنی کو خلق کیا گیا (پیدائش ۱: ۳) ان سب حقائق سے اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اتوار بہ نسبت کام سے اجتناب کے روشنی، قوتِ حیات اور قوت و تازگی کا دن تھا۔ عہدِ جدید میں اس کی پابندی سے متعلق حوالہ جات میں یہ مذکور ہے کہ یہ روٹی توڑنے (غالباً عشائے ربانی)، بشارت دینے (اعمال ۲۰: ۷) اور چندہ جمع کرنے (۱۔ کرنتھیوں ۱۶: ۲) کا دن ہے۔ یاد رہے کہ یہی وہ دن تھا جب یوحنا پتمُس کے جزیرہ میں رُوح میں

آ گیا (مکاشفہ ۱ : ۱۰)۔ یہاں ان حوالہ جات میں یقیناً عبادت پر زور دیا گیا ہے اور شروع ہی سے اتوار بجائے کام سے فراغت کے عبادت کا دن ہے۔

## ۶۔ اتوار کی پابندی کے اصُول

جب کہ ایک مسیحی کو آزادی ہے کہ وہ اتوار کے بہترین استعمال کے لئے خود فیصلہ کرے۔ لیکن تجربہ ہماری راہنمائی کے لئے کچھ امور پیش کرتا ہے کہ یہ کس طرح سود مند طریقہ سے گذارا جا سکتا ہے۔ اور اس کی اہمیّت سے مرقس کے پہلے باب کے آخری حصّہ کے بیان سے تصدیق ہو جاتی ہے جس طرح ہمارے خداوند نے خود کفرنحوم میں یہودی سبّت بسر کیا۔

۱۔ اتوار عبادت کا دن ہے۔

یہ ہمارے خداوند کے یہودی سبّت کے استعمال سے ظاہر ہے اور عہد جدید کے حوالہ جات سے بھی کہ خداوند کے دن کو عبادت کا دن منایا جائے۔ اس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ مزید برآں اپنے دعوے کے مطابق وہ سبّت کا بھی مالک ہے اور اگر وہ مسیحی اتوار کا مالک ہے تو ہمیں ضرور اُس کے اس خاص دن پر اُس کی عبادت کرنا چاہیئے۔ اور ہماری عبادت کا ایک بڑا حصّہ ہونا چاہیئے کہ یہ مسیحی کلیسیا کی عبادت کے لئے مخصوص ہو۔ کیونکہ ہمارا خداوند خود اپنے دستور کے مطابق سبّت کے دن عبادت خانہ میں جاتا۔ حالانکہ اسے عبادت خانہ میں عبادت کے رسم و رواج کی پابندی اور پھیکا پن اُسے ناگوار گذرتا تھا۔ عہد جدید میں عبرانیوں کا مصنف ان لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ جو عبادت کے لئے اکٹھے ہونے کو فراموش کرتے ہیں (عبرانیوں ۱۰ : ۲۵-۲۶) ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کلیسیا "مسیح کا بدن" ہے جو کہ ایک کامل اتحاد کی مثال ہے اور بدن کے اعضاء کی آپس میں گہری رفاقت ہے اور یہ کیسی عجیب قسم کی رفاقت ہو گی جس بدن کے اراکین اپنے بانی اور سر کی عزت کیلئے آپس میں نہ ملتے ہوں۔ جماعتی عبادت کے



ساتھ ساتھ شخصی دعائیں اور گیان دھیان بھی ہونا چاہیئے کیونکہ خود ہمارا خداوند سبّت سے پہلے رات کی تنہائی میں بہت سا وقت دعا میں گذارتا تھا، (مرقس ۱ : ۳۵)۔ اور اسی دستور کے مطابق اتوار کے دن خاموشی اور سکون کو برقرار رکھنے کی کوشش کے لئے یہ ایک زبردست دلیل ہے جس سے خاموشی اور خدا کی حقیقت کو معلوم کرنے کا ایسا موقع ہو گا جو موجودہ دور کی مصروف زندگی اور شور و شغب میں بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو مذہبی مطالعہ اور بائیبل پڑھنے کیلئے صرف اتوار کو موقع ملتا ہے جس سے وہ فہم و ادراک سے اپنے خدا کی عبادت کر سکتے ہیں۔

۲۔ اتوار آرام اور تفریح طبع کا دن ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قدیم دور میں آرام کا یہی مطلب ہوتا تھا کہ کام سے اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ ایک محنتی شخص کے لئے اتوار کو کافی صبح تک اور سہ پہر کو سونا ہفتہ وار آرام کے دن پر خدا کی طرف سے اچھی نعمت ہے۔ ہم یہ بھی تجویز کر چکے ہیں کہ موجودہ دور میں جن لوگوں کو جسمانی تگ و دو نہیں کرنا پڑتی بلکہ بیٹھے بیٹھے اپنا کام کرتے ہیں ان کے لیے جسمانی ورزش اور تفریح طبع نہایت موزوں ہے۔ اسمیں کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ لوگ جو ایسا کرتے ہیں وہ کیوں نہ اتوار کے دن کا کچھ حصّہ کھیل کود اور فرصت کے لمحات کو مناسب کاموں میں گزاریں۔ بشرطیکہ وہ دوسرے لوگوں کے کام میں مُخل نہ ہوں۔ اتوار کے دن تفریح طبع اور آرام کے طریقوں کے انتخاب کے لئے ہم مسیحی نظریۂ آزادی کے تحت دو پابندیاں تجویز کرتے ہیں (ا) ہفتہ کے عام کو جاری رکھنا۔ خواہ یہ تجارت ہو، خواہ مطالعہ اور خواہ خانہ داری ہو کبھی بھی پر سکون نہیں اور جہاں تک ممکن ہوں اِن سے فراغت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہاں البتہ کچھ ایسے کام ہیں جو اتوار کے دن بھی لازمی طور پر کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً نرسیں اور پولیس کے سپاہی اتوار کے دن اپنے کام سے فراغت حاصل نہیں کر سکتے۔ اور یہ مسیحی معاشرہ کا فرض

ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے فرصت اور عبادت کے مواقع مہیّا کرے (ب) ہم اپنی مسیحی آزادی میں ایسے کاموں کی طرف نہ مائل ہوں جو کہ دوسروں کیلئے غیر اہم ہوں۔ یہ منظم کھیلوں، عوامی تفریحات اور دکان کو کھولنے وغیرہ کے لئے ایک بنیادی اعتراض ہے۔ حتیٰ کہ اتوار کے دن شادی یا جنازہ کے لئے بھی، کیونکہ ان رسومات میں بہت سا کام کرنا پڑتا ہے۔ تاہم ایک ایسے ملک میں جہاں آب و ہوا گرم ہے، تجہیز و تکفین جلد از جلد لازمی ہے۔ دوسروں کا خیال رکھنے کے لئے ہمارے پاس عہد عتیق کی یہ بہت اچھّی مثال ہے کہ یہودی سبت پر غلاموں، بیلوں اور گدھوں کے لئے بھی آرام کا دِن ہوتا تھا۔

۳۔ اتوار نیکی کرنے اور مسیحی خدمت کا دن ہے۔

گو ہم میں سے اکثر ہمارے خداوند کی طرح سبّت کے دِن بیماروں کو شفا دینے کے نمونہ پہ چلنے سے قاصر ہیں تاہم، ہم اتوار کے دن کسی نہ کسی حد تک دوسروں کی مدد ضرور کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کلیسیائی سرگرمیوں یعنی سنڈے سکول میں تعلیم دینے یا کلیسیا کی کوائر میں گانے کے ذریعے سے مدد کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جن کے پاس ہفتہ کے دنوں میں کافی فرصت کا وقت ہوتا ہے یہ ایک خاص حکم ہے کہ اتوار کے دِن اِس قسم کا کام کریں، خواہ ان کے لئے ایسے کام میں سخت محنت کیوں ہی نہ کرنا پڑے۔ پھر ہمارے خداوند کا یہ بھی دستور تھا کہ وہ سبّت کے دن دوستوں کی ملاقات کے لئے جاتا (مرقس ۱: ۲۹-۳۱)۔ اتوار کی سرگرمیوں میں سے ہسپتال میں مریضوں کی بیمار پرسی کیلئے جانا ایک امرِ مسلّمہ ہے اور اتوار کے دن اپنے دوستوں کی مہمان نوازی کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے بشرطیکہ گھر میں بیوی یا نوکروں کو زیادہ تیاری نہ کرنی پڑے کیونکہ ان کے لئے بھی یہ آرام کا دن ہے لیکن یاد رہے کہ ہر ایک مسیحی آزادی سے جس طرح چاہے وہ دوسروں کی خدمت کرے اور ہمیں



دوسروں کی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیئے اگر ان کے طریقے ہمارے طریقوں سے مختلف ہوں۔ ایک امریکی مبشر ڈاکٹر سٹینلے جونز کے زیرِ اہتمام ہمالیہ پہ موسم گرما میں منعقدہ آشرم میں ایک بہت اچھی روایت تھی کہ جماعت کے افراد اتوار کے دن نوکروں کی جگہ ضروری کام خود کرتے اور ان سب کو چھٹی دیتے جن میں سے اکثر غیر مسیحی بھی ہوتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان میں اکثر گھریلو نوکروں کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ ایک بوڑھی اور نیک دل مشنری عورت کا یہ دستور تھا کہ وہ اتوار کی سہ پہر کو خط لکھتی تھی لیکن یہ خطوط نہ تو وہ اپنی سہیلیوں کو لکھتی اور نہ ہی یہ کاروباری خطوط تھے۔ بلکہ یہ ایسے اشخاص کو لکھے جاتے جنہیں وہ بے یار و مددگار خیال کرتی۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ اس بوڑھی عورت کے اتوار کے دن لکھے ہوئے خطوط موصول کنندگان کے لئے کس قدر سکون اور برکت کا باعث ہوتے تھے اور ہم سب کو نئے نئے طریقے سوچنے چاہئیں کہ کس طرح اتوار کے دن دوسروں کی مدد کر سکیں۔ ہم اپنے خداوند سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ گو اس کا بیماروں کو سبّت کے دن شفا دینا اس کے عام معمول مثلاً عبادت خانہ میں عبادت کرنے، احباب کی رفاقت اور اس کے آرام میں مخل ہوا۔ تاہم آپ سے دوسروں کی مدد کا ضرور خیال تھا اسی طرح ہمیں بھی دوسروں کی خدمت کے لئے نئے نئے موقعوں کی تلاش میں رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ ہمارے اتوار کے عام معمول میں مخل ہی کیوں نہ ہو۔

گذشتہ ایّام میں مغربی ممالک میں کلیسیا اور ریاست کا یہ دستور تھا کہ اتوار کی پابندی کے لئے قوانین عائد کئے جاتے لیکن یہ کبھی بھی مؤثر نہ ہوتے تھے اور پھر سے اس دستور کو رائج کرنے کی کوشش کرنا بالکل ناممکن ہے یہ بھی ایک غلط طریقہ ہوگا اگر دوسرے لوگوں سے زبردستی اتوار کی پابندی کروائیں۔ لیکن مسیحیوں کو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ سبّت کی پابندی کے لئے ایک ایسی مثال قائم کریں جس سے دوسروں اور خاص کر نوجوانوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ اتوار کا دن، ہفتہ کے سب سے دنوں سے بڑھ کر خوشی اور خدا کی پُرسرور نعمتوں کا دن ہے۔

# دسواں باب

# مسیحی اور اس کی دولت

## ۱۔ عہدِ عتیق کی تعلیم

عہدِ عتیق میں مال و دولت خدا کی بخشش اور اُسکی رحمت کی علامت تھی۔ صادق جو کچھ کرتا ہے۔ بھلدار ہوتا ہے (زبور ۱: ۳) راستباز ایوب خدا کی طرف سے اپنی راستبازی کے ثبوت میں از سرِ نو سرفرازی حاصل کرتا ہے۔ وہ لوگ جو دولت کے روحانی خطرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا فرانسسکی کی طرح غربت کو ایک مذہبی رسم بنانا چاہتے ہیں انہیں اس کا دوسرا پہلو بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ درحقیقت دولت کا یہ مقصد ہے کہ انسان کی جسمانی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ چنانچہ مادی دھن دولت حاصل کرنے میں بذاتہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن اس کی خواہش اور طمع سے ہم بُرائی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور جب حاصل ہو جائے تو اس کے ناجائز استعمال کے کئی قسم کے امکانات ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ دولت بذاتِ خود بُری ہے یہ غنوسطی بدعت کا ایک پہلو ہے۔ جسے کلیسیا نے ہمیشہ اس نظریہ کے تحت رد کیا ہے کہ اگر یہ خیال قابلِ قبول ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مادی دنیا بذاتِ خود بُری ہے تاہم عہدِ عتیق کے مصنفین نے دولت کے دو بڑے خدشات محسوس کئے ہیں۔

(۱) غریب، دولتمندوں کے ہاتھ میں آلۂ کار بنے ہوتے ہیں اور اس کیلئے



دولت ہی اُن کے پاس واحد ذریعہ ہے (یسعیاہ ۳: ۱۳-۱۵، عاموس ۵: ۱۱-۱۲)۔ یہ آیات اِس امر کی بھی وضاحت کرتی ہیں کہ عہدِ عتیق میں سُودخوری کی کیوں مذمت کی گئی ہے۔ جس کے تحت ہر ایک سے اور خاص کر اپنے اسرائیلی بھائیوں سے سود لینا منع ہے۔ (استثنا ۲۳: ۱۹-۲۰) عہدِ عتیق کے دَور میں فلسطین میں آج کل کے بہت سے تنگ دست لوگوں کی طرح وہ غریب کسان قرض لیتے تھے جن کی فصلیں خراب ہو جاتی تھیں اور جنہیں اگلی فصل کے موسم تک اپنے خاندان کو زندہ رکھنے اور آئندہ فصل کے لئے بیج خریدنے کی ضرورت تھی اور پھر شادی بیاہ اور جنازہ جیسی معاشرتی رسومات پر بہت سا روپیہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ اس طرح ادھار لئے ہوئے روپیہ سے (سوائے بیج کے استعمال کے) کچھ حاصل نہ ہوتا تھا بلکہ اس کے یہ نتائج ہوتے کہ کِسان کو اپنی زمین، اپنے آپ اور اپنے سارے خاندان کو ساہوکار کے ہاتھوں میں غلام کی حیثیت سے دیدینا پڑتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کم سے کم قرض لیا جاتے اور اس پر کسی قسم کا سُود لینا ناپسند کیا جاتا تھا۔ تاہم یہ آج کل کی کم از کم شہری زندگی کے عام حالات سے بالکل مختلف ہے جہاں کفایت شعاری سے روپیہ بچا کر ان لوگوں کو ادھار دیا جاتا ہے جنہیں یہ علم ہے کہ اس سے کس طرح کاروباری دنیا میں منافع حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہ بالکل بجا ہے کہ جس شخص نے اپنا یہ روپیہ بچایا ہے اسے اس نفع کا کچھ حصّہ دیا جائے جو ان لوگوں نے اپنی تجارت کے ذریعہ سے کمایا ہے۔ عہدِ جدید کے زمانے تک اس قسم کا قرض لینا ایک عام دستور بن چکا تھا۔ اور خود ہمارے خداوند نے کہا تیہ" اپنی توڑوں کی تمثیل میں اس کی تصدیق کر دی۔ لیکن اس تمثیل کا یہ مقصد نہیں کہ روپیہ لگانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ عہدِ جدید کے مصنفین میں سے صرف یعقوب اس بات پر زور دیتا ہے کہ امیر، غریبوں پر جبر و تشدد کرتے ہیں (یعقوب ۲: ۶، ۶: ۴) اس کے اِس مشاہدہ اور احساسات سے

صاف ظاہر ہے کہ فلسطین کے کسان طبقہ سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ آج کل ہم
اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امیروں کو چاہیئے کہ وہ غریبوں کو ان کی ضروریات
کے لئے قرض دینے کی بجائے ویسے ان کی مدد کریں جیسے کہ خود ہمارے خداوند
نے سکھایا (لوقا ۶: ۳۲-۳۵)۔ اور ایک عقلمند شخص کو سوائے انتہائی ضرورت
کے قرض لینے سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔

(ب) عہد عتیق کے مصنفین نے دولت کا دوسرا خدشہ یہ محسوس کیا کہ امیر
لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں (یسعیاہ ۵: ۱۱-۱۲، عاموس ۶: ۴-۶)۔
عہد جدید میں بھی یہ محسوس کیا گیا ہے مگر یہ ایک اور دوسرے خطرہ پر زور دیتا
ہے یعنی "زر کی دوستی ہر قسم کی برائی کی جڑ ہے" (۱۔ تیمتھیس ۶: ۱۰)۔ اس اہمیت
کی تشریح گذشتہ آیت میں پائی جاتی ہے "لیکن جو دولتمند ہونے کی خواہش کرتے
ہیں وہ آزمائش میں پڑ کر کئی قسم کی بے حس اور نقصان دہ خواہشات میں
پھنس جاتے ہیں جو انہیں تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ انبیاء نے اس بات کا جائزہ
لیا کہ غریبوں کی نسبت زیادہ تر دولتمند مہلک گناہوں مثلاً شہوت پرستی، پیٹو پن
اور کاہلی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس بڑھتی ہوئی بدکاری کے علاوہ انبیاء نے یہ بھی
محسوس کیا کہ اس میں ایک قسم کی معاشرتی برائی اور ناانصافی بھی ہے کہ ایک
طرف تو امیر بہت سی فضول عیش و عشرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور دوسری
طرف غریب لوگ ضروریاتِ زندگی سے بھی محتاج ہیں۔ یہ برائی تو ہم موجودہ دور
میں بھی دیکھتے ہیں جہاں کہ نصف سے زیادہ لوگ فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے
پر مجبور ہیں جب کہ مغربی ممالک میں ایک چھوٹا سا گروہ زیادہ دولتمند ہے اور
روحانی بہتری کی نسبت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ بالکل درست
ہے کہ مسیحی مدبرین اور ماہرینِ علم معاشیات کو دنیاوی دولت کی جائز تقسیم کیلئے
منصوبے بناتے رہنا چاہیئے۔ خواہ متعصب سیاستدان اس کے مخالف کچھ
بھی کیوں نہ کہیں۔ اس مقصد کے لئے انفرادی سخاوت اور ایسی بہترین تحریک



"وار آن وانٹ" بھی بالکل مناسب ہے۔ تاہم یہ تحریک مفلس لوگوں کی تکلیف
کو کم تو کر سکتی ہے لیکن کبھی بھی دنیا کے لاکھوں پس ماندہ لوگوں کی ضروریات کو
رفع نہیں کر سکتی۔

## ۲۔ مسیح کی تعلیم

دوسرے معاملات کی طرح جہاں تک دولت کا تعلق ہے اس کے لئے بھی
مسیح کی تعلیم میں عملی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ انسان کو خوراک اور پوشاک کی
ضرورت ہے اور ہمارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی میں
اس کی بادشاہت اور راستبازی کو اوّل مقام دیا ہے انہیں ضروریاتِ زندگی
کے لئے کوئی کمی نہ ہوگی (متی ۶: ۳۲-۳۳)۔ بعض منہ پھٹ لوگ خواہ کچھ بھی
کیوں نہ کہیں۔ لیکن بہت سے ایماندار مسیحیوں نے اس وعدہ کو اپنی زندگی کے
تجربہ میں پورا ہوتے دیکھا ہے۔ مسیح خداوند نے یہ جانتے ہوئے کہ لوگ اپنے
غیر یقینی مستقبل کے لئے ذخیرہ اندوزی کی فکر میں لگے رہتے ہیں جس سے مستفید
ہونے کا شاید انہیں موقع بھی نہ مل سکے یہ تجویز کیا کہ انہیں عقلمندی سے اپنا
روپیہ استعمال کرنا چاہیئے تاکہ وہ آسمان کی بادشاہت میں داخل ہو سکیں
(لوقا ۱۶: ۹)۔ اسی سبب سے لعزر اور دولتمند کی تمثیل میں وہ دولتمند آسمان
کی بادشاہت میں داخل ہونے سے قاصر رہا (لوقا ۱۶: ۱۹-۳۱)۔ یقیناً دولت
کے استعمال کے لئے ایک فیض بخش اور درست طریقہ بھی ہے کہ مسیحی اپنے بھائیوں
کے فائدہ اور ابدی بہتری کے لئے اسے استعمال کریں۔

تاہم مسیح یسوع نے عہدِ عتیق کے انبیاء کی نسبت زیادہ وضاحت سے
دولت کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن اس کے نظریہ کے مطابق سب سے بدترین
خطرہ یہ تھا کہ دولت انسان کی زندگی میں خدا کی جگہ لے لیتی ہے۔ اپنے ایک
واضح بیان میں اس نے اس بات کا اظہار کیا "بچو! جو لوگ دولت پر بھروسا

رکھتے ہیں ان کے لئے خدا کی بادشاہی میں داخل ہونا کیا ہی مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند آسمان کی بادشاہی میں داخل ہو" (مرقس ۱۰: ۲۵-۲۶)۔ شاگرد رائے عامہ اور عہدِ عتیق کی تعلیم کے اس تضاد سے اس قدر ڈر گئے کہ انہوں نے تعجب سے کہا "پھر کون نجات پا سکتا ہے؟" یسوع نے جواب دیا "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا سے ہو سکتا ہے کیونکہ خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے"۔ یہ فضل کا کرشمہ ہے کہ ارمتیاہ کے یوسف اور زکائی جیسے محصول لینے والے دولتمند لوگ بچ گئے۔

یسوع کے اس قول کا محرک ایک نوجوان تھا جو ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہونا چاہتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ اپنی کوشش سے اس نے خدا کے سب حکموں پہ عمل کیا ہے۔ تاہم وہ مسیح خداوند کے اس چلینج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اپنی ساری دولت کو چھوڑ کر نہ دل سے مسیح خداوند کی پیروی کرے۔ ہمارے خداوند کے نزدیک دولت کے لئے یہ سب سے خطرناک بات ہے کہ یہ انسان کی زندگی میں خدا کی نسبت اوّل مقام لے لیتی ہے۔ یہاں تک کہ دولت کی کشمکش کے باعث انسان کے دل میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یسوع نے ایک دولتمند کی تمثیل بیان کی جس کے یہ تصوّرات تھے کہ بڑی کوٹھیاں ہی اس کی تمام ضروریات اور خواہشات کو پورا کر سکیں گی (لوقا ۱۲: ۱۶-۲۱) اور دوسری تمثیل اس شخص کے متعلق ہے جو دولت میں اس قدر مگن تھا کہ اُسے اپنے در پہ لعزر بھکاری کا کچھ خیال نہ تھا (لوقا ۱۶: ۱۹-۳۱)۔

دولت کی زیادہ سے زیادہ خواہش میں لالچ کا گناہ پوشیدہ ہے جس کی عہدِ جدید میں واضح طور پہ مذمت کی گئی ہے (لوقا ۱۲: ۱۵)۔ لیکن موجودہ دور میں لالچ کو مشکل ہی گناہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سکول میں استاد اور گھر میں والدین نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ دنیا میں ترقی کریں جس سے عموماً زیادہ روپیہ کمانے کا مطلب اخذ کیا جاتا ہے۔ عہدِ جدید میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ زیادہ دولت حاصل کرنے سے لالچ بڑھتا



ہے۔ وہ امیر آدمی جو خُدا کے فضل کو فراموش کئے ہوئے ہے، ایک لالچی شخص ہے جسے بڑی کوٹھیاں بنانے کا خیال رہتا ہے۔ لیکن یہ امر بھی باعث تعجب ہے کہ ہر ایک شخص خواہ اس کے پاس کم ہے یا زیادہ، وہ اپنی آمدنی کو بڑھانے کا خواہاں ہے۔ دولت کے متعلق مسیح کی تعلیم کے لئے تجربہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انسان کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوگی، اتنی ہی اس کی اور زیادہ خواہش ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائے۔ یسوع نے کہا "کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت۔ یا ایک سے ملا رہے گا۔ اور دوسرے کو ناچیز جانیگا تم خدا اور دولت دونوں کو پیار نہیں کر سکتے" (متی ۶: ۲۴)۔ اور اس سلسلہ میں اس نے جس خدمت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ایک غلام کی سی خدمت ہے جو کہ قدیم دَور میں ایک عام خدمت تھی۔ جیسا کہ دولت کا تقاضا ہے ویسے ہی خدا کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان کی تمام جدوجہد اور وفاداری اس کے ساتھ ہو۔

دولت کی خدمت کرنے سے یہ مراد ہے کہ ہم خدا کی بجائے دولت میں اپنی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اور یہی بیوقوف دولتمند کی غلطی تھی۔ جس طرح ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق سکھانے کی کوشش کی وہ یہ ہے کہ وہ دولت کے فریب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دولت کو کیڑا کھا جاتا ہے، زنگ لگ جاتا ہے اور چور چرا لے جاتا ہے (متی ۶: ۱۹-۲۱)۔ اسی طرح۔ ۱تیمتھیس ۶: ۱۷ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان بجائے خدا کے ناپائیدار دولت پہ امید رکھتا ہے اور یعقوب کی تحریر سے بھی ہمارے خداوند کے قول کے معنی مترشح ہو رہے ہیں۔ "تمہارا مال بگڑ گیا اور تمہاری پوشاکوں کو کیڑا کھا گیا۔ تمہارے سونے چاندی کو زنگ لگ گیا۔ اور وہ زنگ تم پہ گواہی دے گا۔ اور آگ کی طرح تمہارا گوشت کھائے گا۔" (یعقوب ۵: ۲-۳) پھر مکاشفہ کی کتاب میں زوال پذیر روم میں بہت بڑی دولت کی کوئی وقعت نہیں (مکاشفہ ۱۸: ۱۷)۔ ہمیں چاہیئے کہ روپیہ کی گرتی ہوئی قدر سے سبق سیکھیں کیونکہ آج سے چالیس سال قبل ایک روپیہ کا آٹھ سیر آٹا ملتا تھا۔ لیکن اب ایک روپیہ کا صرف دو سیر ملتا ہے ہمیں

CamScanner

چاہیئے کہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے فقط خداوند پر بھروسہ رکھیں۔ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم مستقبل کی فکر کریں بلکہ فکر کی بجائے خداوند پر اعتماد رکھیں۔

ہم عہدِ عتیق میں دیکھ چکے ہیں کہ دولت کس طرح بہت سے گناہوں کی طرف مائل کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ عہد جدید بھی اس سے متفق ہے لیکن وہ ایک اور بڑے خطرہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک امیر آدمی کے لئے بہت ممکن ہے کہ وہ خدا کی عبادت اور خدمت کی بجائے دوسری دلچسپیوں میں کھو کر رہ جائے "کسی کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں" (لوقا ۱۲: ۱۵) اکثر ایک امیر آدمی کے ذہن پر دولت کے تصورات کچھ اس طرح سے چھا جاتے ہیں کہ وہ اپنی دولت میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیوں کو عالمِ بالا کی چیزوں پر نہ کہ زمین پر کی چیزوں پر دل لگانا چاہیئے (کلسیوں ۳: ۲)۔ مادی چیزوں کو روحانی چیزوں کی جگہ دینا، ایک کنجوس کی دولت کے لئے تگ و دو کرنے یا مستقبل کے لئے صرف دولت پر اعتماد رکھنے سے متفرق ہے۔ یاد رہے کہ ان کاوشوں میں لالچ کا گناہ پوشیدہ ہے آج کل بہت سی دلچسپ اور مفید چیزیں ہیں جنہیں روپیہ سے خریدا جا سکتا ہے۔ مثلاً موٹر کاریں ریڈیو اور گھریلو مشینیں وغیرہ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اندیکھی اور روحانی اقدار کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسان کے ذہن پر پورے طور پر غالب پا لینا دولت کی ایک ایسی طاقت ہے جس سے دولت ایک "ناجائز نفع" کی صورت میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ عہد جدید میں تین مقامات پر ایسا محاورہ استعمال ہوا ہے جو کلیسیائی حکام کی غلطی یا آزمائشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے (ططس ۱: ۷، ۱۱، ۱ پطرس ۵: ۲)۔ دوسرے لوگوں کی مانند بشپوں اور دوسرے خادمانِ دین کے ذہنوں پر دولت اس قدر سوار ہو جاتی ہے کہ وہ دوسری اہم باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ دولت ان کے عہدہ کے لئے باعثِ ذلت ثابت ہوتی ہے اور اگر دولت قابلِ اعتراض ذرائع سے حاصل کی جائے تو یہ اس سے زیادہ قابل مذمت ہے۔



مسیح یسوع نے اُس امیر نوجوان کو جو ابدی زندگی کا متلاشی تھا۔ یہ حکم دیا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے بیچ کر غریبوں میں بانٹ دے (مرقس ۱۰: ۱۷-۲۲)۔ اب یہاں پر دولت ہی تھی جس کے باعث وہ نوجوان مسیح کی تابعداری سے قاصر رہا۔ اور مفسرین نے نہایت درستی سے اس کی تشریح کی ہے کہ مسیح خداوند کا یہ حکم اِس خاص شخص کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تھا نہ کہ یہ تمام مسیحیوں کے لئے ایک عام حکم تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں میں ابدی زندگی حاصل کرنے میں دولت کی رکاوٹ کے علاوہ شاید بالکل مختلف رکاوٹیں ہوں۔ مثلاً عیش و عشرت اور اقتدار کی خواہشات رکاوٹیں وغیرہ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا کچھ لوگوں سے اس کہانی کے ذریعہ سے ہمکلام ہو جیسے کہ تیرھویں صدی میں وہ مقدس فرانسس سے ہمکلام ہُوا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوئے۔

اگر مسیح خداوند نے یہ کہا کہ "اپنا سب کچھ بیچ دے" تو اس کو ایک عام اصول نہیں بنانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور عالمگیر حکم دیا۔ جو اپنی جائیداد کو چھوڑنے کی نسبت اور بہت سی چیزوں کا تقاضا کر رہا ہے۔ ہمارے خداوند نے اکثر یہ کہا "جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں"۔ (متی ۱۰: ۳۸، ۱۶: ۲۴، مرقس ۸: ۳۴، لوقا ۹: ۲۳، ۱۴: ۲۷، یوحنا ۱۲: ۳۵)۔ خودی سے انکار کرنے کا مطلب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، اس کا یقینی طور پر یہ مطلب ہے کہ انسان اپنی دولت سے کم پیار کرے۔

## ۳۔ جوئے بازی

کتاب مقدس میں جوئے بازی کے لئے براہ راست کوئی ممانعت نہیں۔ تاہم تمام مسیحی اس پر متفق ہیں کہ جب جوئے بازی سے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں کہ انسان تجارت میں بد دیانتی کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنے خاندان کو نظر انداز کرتا ہے یا اس کا اپنا کردار بگڑ جاتا ہے تو لازماً ہمیں جوئے بازی کو گناہ قرار دینا ہو گا۔ اور

وہ لوگ جو گھوڑ دوڑ میں قلیل سے قلیل رقم بھی شرط میں لگا دیتے ہیں، انہیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ بڑے پیمانے پر جوئے بازی ایک معاشرتی برائی ہے۔ جہاں پر مسیحیوں میں اختلاف رائے ہے وہ یہ ہے کہ آیا جوئے بازی اپنے بُرے نتائج کے علاوہ بذاتہٖ بُری ہے۔ رومن کاتھولیک اور بعض دوسروں کا یہ نظریہ ہے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں لیکن ہماری دلیل اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

جوئے بازی میں اس لئے بھی برائی ہے کیونکہ یہ لالچ کا نتیجہ ہے جسے کتاب مقدّس میں صریحًا منع کیا گیا ہے (لوقا ۱۲: ۱۵، ۱۶:۱۳) حتّٰی کہ اسے سات مہلک گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ جوئے بازی لالچ کے لئے ایک طاقتور اور غیر ضروری محّرک ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کسی نہ کسی حد تک دولت کی محبت میں پھنسے ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں بہت کم لوگ ایک جوئے باز پر انگلی اٹھا سکیں گے۔ لیکن ایک جوئے باز دوسرے لوگوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ مصنوعی طور پر جذباتی ہوتے اور جوئے بازی کی دوسری سرگرمیوں سے جن گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے ہم بھی اکثر ان گناہوں کے سامنے سرِخم تسلیم کر دیتے ہیں۔

ہمارا نظریہ یہ ہے کہ جوئے بازی اس لحاظ سے بھی بُری ہے کیونکہ یہ قانونِ قدرت کے مناسب معاوضہ کے اصول کے خلاف ہے اس کے مطابق "مناسب اور جائز قیمت سے زیادہ وصول کرنا بُرا ہے۔ خواہ خریدار اسے ادا کرنا ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔" اسی قانون کے تحت قحط کے ایّام میں بلیک مارکیٹ کے ذریعے گراں قیمتیں وصول کرنا منع ہے اور آجروں کے لئے بے روزگاری کے ایام میں لوگوں کو نہایت قلیل معاوضہ پر ملازمت دینا ممنوع ہے (یعقوب ۵: ۴) اور اس قانون کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مزدور پورے وقت کے لئے دیانتداری سے کام کرے (۲ تھسلنیکوں ۳ : ۱۰)۔ دوسرے کاروباروں کی طرح یہ بھی ایک غیر منصفانہ



کاروبار ہے جس کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ کم ادائیگی سے بہت زیادہ منافع حاصل کیا جائے۔ جس طرح کسی جوئے باز کے روپیہ ہارنے کی رضامندی سے جوئے بازی جائز نہیں ہو جاتی اِسی طرح جب کسی آجر کے پاس ایک بے روزگار کم سے کم تنخواہ پر کام کرنے کے لئے رضامند بھی ہو۔ تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق جیتنے والے جوئے باز کے لگائے ہوئے روپے اور جیتے ہوئے روپیہ میں جتنا زیادہ فرق ہوگا اسی قدر اس معاملہ میں زیادہ برائی ہوگی۔ یہ نظریہ ہمارے ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے قیمتوں کی شرح میں کمی کرنے لئے قانون نافذ کیا جائے تو اس طرح سے جوئے بازی کی معاشرتی برائی کم ہو جائے گی۔

وہ لوگ جو جوئے بازی کو دُرست ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی حمایت میں ظاہراً بہت سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جوئے بازی کے ذریعہ سے کمایا ہوا روپیہ بہت سے اچھے مقاصد کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً کلیسیا میں چھوٹے پیمانے پر یا بڑی تنظیموں میں بڑے پیمانے پر قرعہ اندازی کے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا روپیہ ہسپتالوں کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ اچھے مقاصد کے لئے چوری کرنا اور فریب دینا درست ہے۔ یہ دلیل بھی غلط ہے کہ پریمیم بانڈز جن پر کوئی سود تو نہیں لیا جاتا بلکہ اس کے مالک کو بڑا انعام حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے، حقیقتًا جوئے بازی نہیں۔ کیونکہ بانڈ والے شخص کا سرمایہ ضائع نہیں ہوتا۔ اِس میں گو سرمایہ تو ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی باقاعدہ سود کا نقصان ہوتا ہے۔ جوئے بازی کی حمایت میں ایک اور دلیل ہے کہ جدید تجارت کی شرائط کے تحت ساہوکارے اور دوسری قسم کی خرید و فروخت میں خطرات کا ہونا لازمی ہے۔ خاص کر اُس وقت جب کہ مستقبل کے وقت کے لئے کاروبار کیا جاتا ہے لیکن دیانتدار تاجر نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہیں نہ کہ ایک جوئے باز کی طرح محض

قسمت پر تکیہ کرتے ہیں۔ حقیقت تمام دوسرے کاروباروں اور معاہدوں کو جوئے بازی قرار نہیں دیتی اور جوئے بازی کو درست بھی نہیں ٹھہراتی۔ بہرحال ایک عام جوئے باز، جوئے بازی کے خطرات کیلئے عذر نہیں پیش کر سکتا۔

## ۶۔ کفایت شعاری اور مختاری

بعض مسیحیوں نے درست طریقہ سے عہدِ جدید کی خود ضبطی اور خود انکاری کی تعلیم کو سنجیدگی سے اختیار کیا ہے اور اپنی ذات پہ بہت کم روپیہ خرچ کرنے سے اس کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ ان کا دور اندیشی سے روپیہ بچانا مارکس ویبر کے اس نظریہ کی حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ سرمایہ داری کا نظام کیلونی مسیحیت کی پیداوار ہے۔ کیلون اور کہ ٹیکر دونوں نے کفایت شعاری پر اس قدر زور دیا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے مسیح خداوند کی اس نصیحت کو کہ کل کے لئے فکر نہ کریں نظر انداز کر دیا (متی ۶ : ۳۴) بدقسمتی سے اس نظریہ کے نتائج اس قدر ہولناک بن جاتے ہیں کہ انسان زندگی میں دولت کو بہت اہم مقام دینے لگتا ہے۔ بہت سے کوئیکر اچھے مقاصد کے لئے اپنی دولت کو وقف کرنے سے اس خطرہ سے بچ گئے۔ لیکن کیلون کی تعلیم کو ماننے والے اہلِ سکاٹ لینڈ کی زندگیوں میں اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ کفایت شعاری سے مادی ترقی کو ایک مسیحی خوبی تصور کرنے لگے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ کفایت شعاری معاشرتی طور پر تو اچھی ہے۔ لیکن ایک مسیحی کی یہ امتیازی خصوصیت نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی ہیں یا جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ خدا کی طرف سے ہمارے پاس امانت کے طور پر ہے اور اس کے لئے ہم ذمہ دار ہیں اور مسیحی مختاری کے عمل میں دولت کا پُر فیض اور محتاط



استعمال ہمیشہ ایک ثانوی کردار ادا کرتا ہے۔ مسیح خداوند کا اپنے شاگردوں سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم پورے دل سے محبت رکھتے ہوئے اور اس کی خدمت کرتے ہوئے اُس کی پیروی کریں اور اپنے آپ کو کلّی طور پر اس کے ہاتھوں میں دیدیں۔ دولت کی نسبت اپنے آپ کو دے دینا زیادہ اہم ہے۔ دوسری طرف مقدّس پولُس دولت کے لئے ہماری ذمہ داری کی نسبت ایک دوسرے سے ہمارے شخصی تعلقات پر زور دیتا ہے (مثلاً کلسیوں ۳ : ۱۸ - ۴ : ۱) میں بے ایمان مختار کی طرح دولت کے پُرفیض اور محتاط استعمال کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن یہ دھن دولت کو مقدّس امانت بنانے کے اخلاقی خطرات سے بھی باخبر ہے جیسے کہ مسیحی مختاری پر بعض مبشّر اور کلیسیائی مالیات کے منتظمین اُسے پیش کرتے ہیں۔ "ناراستی کی دولت" کلیسیا کے منتظمین کے ہاتھوں میں "گھناؤنی دولت" اور تمام "برائیوں کی جڑ بن سکتی ہے"۔

ہاں البتہ مسیحی زندگی میں باقاعدگی سے ہدیہ پیش کرنے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اسرائیلی کسانوں کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنی پیداوار کا دسواں حصّہ خدا کے حضور میں لائیں (احبار ۲۷ : ۳۰ - ۳۲) - اور مسیحیوں کے لئے بھی یہ ایک اچھا دستور ہوگا، اگر وہ اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصّہ خدا کی خدمت کے لئے علیحدہ کر دیں۔ خواہ وہ پانچواں، دسواں یا بیسواں حصّہ ہو۔ ہمارے خداوند نے بھی یہودیوں کے خیرات دینے کی روایت کو پسند کرتے ہوئے خیرات دینے کی تلقین کی۔ (متی ۶ : ۲ - ۴) مقدّس پولُس نے ایک خاص اپیل کے لئے یہ تجویز کیا کہ باقاعدہ آمدنی سے ہفتہ وار حصّہ نکالا جائے (۱ - کرنتھیوں ۱۶ : ۲) اس نے مسیحی ہدیہ کو اتنا اہم قرار دیا کہ اس نے اپنے قارئین کو زیادہ خندہ دینے کی ترغیب کے لئے خدا کی مثال پیش کی کہ وہ اپنے آپ کو خالی کرتے اور اپنے تجسّم سے ہمارے لئے غریب بن گیا۔

ہماری موجودہ کلیسیائی زندگی میں اعلیٰ پیمانے پر باقاعدہ منظم ہدیوں

کے لئے یہ ایک خطرہ ہے جس سے ہمارے سخاوتی محرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس سے بعض اوقات انسان انتہائی محبت کے اظہار کے لئے قربانی دینے تک تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن ماہوار چرچ فنڈ اس جذبۂ ایثار سے محروم ہے۔ ہم اُس واقعہ سے اچھی طرح واقف ہیں جب بیت عنیاہ کی مریم نے بیش بہا عطر کا تحفہ پیش کیا تو مسیح خداوند نے اس کی اس محبت کو بہت سراہا (مرقس ۱۴ : ۳-۹)۔ اور خداوند کی کلیسیا میں بھی ہمیشہ ایسے ہی بیش بہا قیمت کے سخاوتی کاموں کے لئے گنجائش ہونی چاہیئے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ کام باضابطہ ذمہ داری کے اصولوں کو توڑنے والے ہوں۔ لیکن مسیح کی شریعت کو یقیناً یہ پورا کرتے ہیں اور خداوند کو یہ پسند ہے۔

## ۵۔ دولت اور اشتمالیت

جب کہ مسیحی پورے طور پر کارل مارکس کی ملحدانہ مادی اشتمالیت کے مخالف ہیں کیونکہ یہ انفرادی آزادی اور اہمیت کی منکر ہے۔ تاہم وہ مجبور نہیں کہ مالی تقسیم کے بارے میں اشتمالیت کے اصولوں کی خلاف ورزی کریں۔ یروشلیم کی ابتدائی کلیسیا میں اشتمالیت کے ایک تجربہ کی کوشش کی گئی (اعمال ۴ : ۳۲-۳۷)۔ "ان کی سب چیزیں مشترک تھیں۔ جو لوگ زمینوں یا گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے موافق بانٹ دیا جاتا تھا" کارل مارکس کے نظام اشتمالیت سے یہ تجربہ اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ بالکل رضاکارانہ تھا اور جو مسیحی اسے پسند نہیں کرتے تھے انہیں مجبور نہیں کیا جاتا تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ یہ شخصی تعلقات میں مکمل طور پر دیانتداری اور صاف دلی نہ کہ حکومت کے جبر و تشدد پر مبنی تھا۔ لیکن یہ باہمی دیانتداری گے کا نعدم ہونا کام ہو کر رہ گیا۔ تاہم ہمارے پاس یہ ایک ثبوت ہے کہ مسیح



کے ہم خیالوں کے لئے نظام اشتمالیت ممکن ہے۔ ہم اس سے یہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ اسی خاص تجربہ کے لئے آجکل ہمیں کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ مسیح میں اپنے برادرانہ تعلقات کو ظاہر کرنے کے لئے نئے معاشی طریقوں کو اپنائیں۔ چین میں ایک ایسا ہی تجربہ کیا گیا۔ جب تمام ملک میں اشتمالیت کا زور ہو گیا تو "یسوع کے خاندان" میں دو ہزار دو سو پچاس مختلف خاندان شامل تھے۔ اس کے بانی نے اِسے شیطانی رضاکار کے خلاف "آسمان کی بادشاہت" کے نام سے پکارا۔ وہ لوگ جنہوں نے اِس خاندان میں شرکت کی انہوں نے اپنا سب کچھ بیچ کر غریبوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

اِن دنوں رُوس اور چین جیسے ممالک میں اشتمالی معاشروں کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ "ہر ایک سے اس کی لیاقت کے مطابق لو اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دو" زیادہ تر یہ تقسیم زر کے مسیحی طریقہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہ نسبت ان ممالک کے جہاں مزدوری کی شرح اور قیمتیں اکثر و بیشتر ضرورت اور بہم رسانی سے مقرر کی جاتی ہیں۔ تاہم اشتمالی ممالک میں یہ مقصد عملی طور پر ابھی تک حاصل نہیں کیا گیا۔ اور یہی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ایک کو اسی قدر دو جتنا کہ وہ مستحق ہے یعنی جتنا کہ معاشرہ میں وہ حصہ ڈالتا ہے۔ شاید یہ نظام سرمایہ دار ممالک کے لوگوں کی آمدنی میں عدم مساوات کو دُور کر سکے۔ تاہم انفرادی طور پر لوگوں کے لئے مواقع ضرور مہیا کر دیتا ہے خاص کر انتظامی طبقہ کے لئے جنہیں دوسروں کا زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اور ہم اس سے کبھی بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ہر ایک مالی نظام میں انسانی فطرت کی خود غرضی ضرور کارفرما ہو گی۔ موجودہ نظام اشتمالیت مسیحیوں کے لئے دو طرح سے ایک چیلنج ہے۔ (ا) مسیحیوں کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اشتمالیت جس مالی نظام کی حمایت میں ہے وہ بذاتہ بُرا ہے بلکہ اس کے تحت یہ کوشش کی جاتی ہے کہ دولت کی ناجائز تقسیم اور غریبوں کو آلۂ کار بنانے کا مقابلہ کیا جائے۔ اس کی تو عہد عتیق کے مصنفین نے بھی مذمت کی ہے۔ (ب) مسیحی مفکرین جنہیں کچھ

CamScanner

نہ کچھ مالیات کا علم ہے انہیں چاہیئے کہ وہ معاشرہ کے لئے تجویزیں بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں محو رہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سرمایہ داری یا اشتمالی نظام کے تحت کام کریں بلکہ ایک ایسے نظام کے لئے جہاں دولت کی تقسیم کیلئے زیادہ انصاف ہوگا۔ تاہم مسیحیوں کے نزدیک اس کو ثانوی اہمیّت حاصل ہے۔ مالی معاملات میں انصاف ہی ایک ایسی چیز نہیں جو انسانی بہبودی کے مسیحی پروگرام میں مقدم ہے "کیونکہ خدا کی بادشاہی کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے" (رومیوں ۱۴: ۱۷)۔

---



# گیارہواں باب

# مسیحی اور حیاتِ انسانی

## ۱۔ بائبل کی تعلیم

لفظ "زندگی" کا بائبل کے عظیم الفاظ میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اکثر وبیشتر یہ روحانی اور ہمیشہ کی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسمانی زندگی بذاتہٖ انسان کے لئے خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ لیکن پھر بھی مسیحی جسمانی زندگی کو اتنی اہمیّت نہیں دیتے جتنا کہ بدھ مت یا جین مت کے پیروکار جنہیں زندگی کا اس قدر احساس ہے کہ وہ اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانپے رکھتے ہیں تاکہ وہ کسی مکھی وغیرہ کو نگل کر کسی جان کو ضائع نہ کریں۔ ایک عظیم مشنری ربرٹ شوائٹزر کا بھی جسمانی زندگی کے بارے میں کچھ ایسا ہی نظریہ تھا۔ کیونکہ وہ جدید سائنس کی جراثیم کش ادویات کو استعمال کرنے سے انکار کرتا تھا تاکہ اس عمل سے جراثیم کی زندگی ضائع نہ ہو۔ لیکن بہت کم مسیحی اس کے اس نظریہ سے متفق ہوں گے۔ پیدائش کے پہلے باب میں نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ دوسری تمام جاندار مخلوق پر انسان حکومت کرے گا (پیدائش ۱: ۲۸) اور طوفانِ نوح کے بعد خدا نے انسان کے ساتھ ایک عہد باندھا کہ وہ چند شرائط کے تحت دوسرے جانداروں کو ذبح کر کے اپنی

عوض کے طور پر استعمال کر سکتا ہے (پیدائش ۹ : ۳) خدا کی شبیہ پر بنے ہوتے انسان کی شخصیت میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا سے ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے جس کی بائبل میں جسمانی زندگی کی نسبت بہت زیادہ وقعت ہے۔

تاہم جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے، قدیم سے قدیم ترین اخلاقی ضابطوں میں قتل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن عہد عتیق میں کسی کی جان لینے کے لئے کوئی خاص ممانعت نہیں۔ موسوی شریعت میں جنگ میں قتل کرنا (استثنا ۲۰ : ۱۳) اور سزائے موت جو قتل کے علاوہ دوسرے جرائم کے سبب سے بھی دی جاتی تھی۔ ایک عام بات تھی (استثنا ۲۱ : ۲۱ - ۲۲) اور چند ایک حالات میں دوسروں کو قتل کرنے کا خدا کی طرف سے حکم ہوتا تھا حالانکہ آج کل کے اخلاقی معیار کے مطابق یہ بالکل ناقابل قبول ہے (۱۔سموئیل ۱۵ : ۳)۔ بر طرف دیگر عہد جدید دوسروں کی جان لینے کے لئے بالکل خاموش ہے۔ لیکن یہ تو تسلیم کیا گیا ہے کہ حاکم "بے فائدہ تلوار لئے ہوئے نہیں" (رومیوں ۱۳ : ۴) یہ ایک تنبیہی محاورہ ہے لیکن اس سے غالباً یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے سزائے موت دینے کا حق ہے۔

تاہم جہاں تک کسی کی اپنی زندگی کا سوال ہے تو اس کے لئے عہد جدید میں ایک نیا پہلو رونما ہوتا ہے۔ مسیح خداوند نے یہ محسوس کرتے ہوئے بقائے نفس کی انسانی جبلّت کو قبول کیا۔ "آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کا نقصان اٹھائے تو اسے کیا فائدہ ہوگا" (مرقس ۸ : ۳۶) اُس نے خود اس نظریہ کے تحت اپنی قریب الوقوع موت کے لئے دعا کی کہ یہ پیالہ اس سے ٹل جائے اور اس پیالہ میں خواہ اور کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں ایک نوجوان کے زندہ رہنے کی آرزو ضرور موجود تھی (مرقس ۱۴ : ۳۶)۔ تاہم دوسروں کے لئے اپنی جان دینے کی مسیح کی اپنی مثال اور تعلیم میں تعریف کی گئی ہے "اس سے زیادہ محبّت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان



اپنے دوستوں کے لئے دیدے" (یوحنا ۱۵ : ۱۳)، اور صلیب جو اس میں جانثاری کی نمایاں مثال ہے وہ ہمارے مسیحی ایمان کا مرکزی نشان ہے۔ بانہوئیفر مسیحی نظریہ کا خلاصہ اِن الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ جسمانی زندگی "خدا کی طرف سے ایک ایسی نعمت ہے جس کی حفاظت کی جائے اور پیش کرنے کے لئے ایک قربانی ہے"۔ اپنی زندگی کو قربانی کے طور پر پیش کرنے کا صرف یہی مطلب نہیں کہ شہادت کے لئے فیصلہ کیا جائے بلکہ بہت کم موقعوں پر ایسا فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن روزمرّہ زندگی میں اکثر ہم اس گومگو میں ہوتے ہیں کہ آیا ہم دوسروں کی خاطر جسمانی خطرات مول لیں یا ان سے گریز کریں۔ بیشک ایسی صورتِ حال میں فیصلہ کرنا انسان کے لئے مشکل ہے لیکن مسیح خداوند کا یہ مشورہ تھا کہ ہم اس کی اور انجیل کی خاطر اپنی جان دینے تک تیار رہیں۔

## ۲۔ کسی کی جان لینے کے خلاف مسیحی دلائل

بہت سے مسیحیوں کا یہ نظریہ ہے کہ جب کہ ہر ایک مسیحی کو متعدد حالات میں اپنی جان دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ لیکن بر طرف دیگر کسی قسم کے حالات میں بھی کسی کی جان لینے کے خلاف بہت سی مسیحی دلائل ہیں (۱)۔ یہ حکم کہ "تو خون نہ کرنا" جیسا کہ عہد عتیق میں پایا جاتا ہے معنوی لحاظ سے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "تو کسی انسان یا حیوان کی کسی قسم کے حالات میں جان نہ لینا" بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ تو حسد میں آکر اراداتاً غیر قانونی طور پر کسی کا خون نہ کرنا" جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سزائے موت اور جنگ میں قتل ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ تاہم ہمارا یہ خیال ہے کہ مسیح خداوند نے اپنے احکام کو عالمگیر حیثیت دیتے ہوئے اس حقیقت کو پیش کیا کہ کسی بھی حالت میں قتل کرنا خدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ اپنے پہاڑی

وعظ میں جب اس نے مثالیں دیں کہ مسیحیوں کیلئے اس کے احکام کا کیا مفہوم ہے اس نے کوئی ایسا نتیجہ نہیں پیش کیا کہ جنگ یا سزائے موت میں کسی کی جان لینے کی ممانعت ہے۔ گو چند ایک مسیحیوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ضرور اس کی وضاحت کرتا چھٹے حکم کی تشریح کی نسبت ایسے قتل کا غلط یا درست ہونا دوسری دلائل پر مبنی ہے۔ آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں کو قتل نہ کیا جائے۔

(ب) انسان کے بارے میں مسیحی نظریہ کہ وہ بحیثیت مخلوق کے خدا کی مرضی کے تابع ہے۔ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ انسان کی موت کا معاملہ خدا کے فیصلہ کے مطابق ہے نہ کہ انسان کے اپنے فیصلہ پر مبنی ہے۔ کسی آدمی کے لئے اپنی یا کسی اور کی موت کا وقت مقرر کرنا یونانی محاورہ میں "ہبرس" کہلاتا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ انسان تکبر سے ایک ایسا اختیار جتاتا ہے جو صرف خدا کا حق ہے۔ دوسروں کی خاطر ارادتاً موت کے مقابلہ میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے مطابق اس کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا جائے کہ مسیحی زندگی میں شہادت کی ارادتاً جستجو نہ کی جائے۔ "ہبرس" سے احتراز میرے نزدیک کسی حالت میں بھی کسی کی زندگی لینے کے خلاف زبردست ترین دلیل ہے۔

(ج) اس معاملہ کے لئے آجکل یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کسی کو طویل مصائب سے رہائی دلانے کے لئے اسے مار دینا، اس پر رحم کرنا ہے، خواہ وہ مصیبت زدہ شخص کسی جرم میں تاحیات قید ہو اور خواہ وہ کوئی مریض ہو جو کسی تکلیف دہ اور لاعلاج مرض میں مبتلا ہو۔ ہم اس سے بالکل متفق ہیں کہ کسی انسان کو اس کی مصیبتوں سے آرام دلانا مسیح کے خیال سے بالکل ہم آہنگ ہے کیونکہ مسیح کی خدمت کے بیشتر حصہ میں ذہنی اور جسمانی



تکلیفوں میں مبتلا لوگوں کو شفا دینا شامل تھا۔ تاہم بائبل کی تعلیم میں انسان کی انفرادی زندگی میں اور بنی نوع انسان کی نجات کے لئے خدا کی تدبیر کو پورا کرنے میں دکھ سہنے کا ایک حقیقی گو ایک پُر اسرار حصہ ہے۔ "جس سے خداوند محبت رکھتا ہے۔ اُسے تنبیہ بھی کرتا ہے" (عبرانیوں ۱۲: ۶) اور مقدس پولُس کو اپنے تلخ تجربہ سے یہ سیکھنا تھا کہ اس کے جسمانی دکھ کوئی ایسی چیز نہ تھے جو دعا سے دور کئے جاتے بلکہ انہیں مسیح کی قوت کی گواہی کے طور پر استعمال کرنا تھے (۲۔ کرنتھیوں ۱۲: ۷-۱۰)۔ پھر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے دکھوں کا یہ مطلب تھا۔ کہ "وہ مسیح کی مصیبتوں کی کمی اس کے بدن یعنی کلیسیا کی خاطر اپنے جسم میں پوری کئے دیتا ہے" (کلسیوں ۱: ۲۴)۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یقیناً ہمارا ہمیشہ یہی رجحان ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی اور دوسروں کی تکلیفوں کو دور کریں۔ لیکن اس میں بھی ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ہمیں نتائج کے لئے سب کچھ خدا کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا چاہیئے۔

(د) ہمارے خداوند نے خود اس حقیقت کو ظاہر کیا کہ زندگی عطا کرنا اس کے باپ کا کام ہے جس میں وہ خود بھی شریک ہے۔ مردوں کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفا دینے سے اس نے ظاہر کیا کہ اس کے نزدیک زندگی اور صحت کی کتنی قدر و قیمت تھی۔ مسیحیوں کا ہمیشہ یہی نظریہ ہونا چاہیئے کہ کوئی بھی ایسا فعل جو زندگی کو کم کرتا یا صحت کو ضائع کرتا ہے وہ ہمارے خداوند کی کثرت کی زندگی کے مقصد کے بالکل برعکس ہے (یوحنا ۱۰: ۱۰)۔ آج تک بہت سے مسیحیوں کا یہ خیال تھا کہ سگرٹ نوشی صرف ایک بے ضرر عشرت کا سامان ہے اور وہ جو اس کا استعمال کرتے ہیں، وہ دوسروں کا خیال رکھتے ہوئے اور اعتدال سے اسے استعمال میں لائیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا ہے کیونکہ جب

سگرٹ نوشی سرطان جیسے موذی مرض کو جنم دیتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ سگرٹ نوش زندگی جیسی خدا کی نعمت کی حقارت کرتا ہے اور اسے خود اپنے ہاتھوں سے ضائع کرنے کی کوشش میں ہے۔ مسیحی کبھی بھی اس دنیاوی نظریہ سے متفق نہیں ہوں گے کہ انسان جو کچھ چاہے اپنی زندگی سے کر سکتا ہے کیونکہ زندگی خدا کی طرف سے ہمارے پاس امانت کے طور پر ہے اور ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔

## ۳۔ سزائے موت

قتل کے لئے سزائے موت نہ صرف طوفانِ نوح کے بعد ایک عہد میں (پیدائش ۹: ۵-۶) بلکہ بعد ازاں ایک اور عدالتی اصول "جان کے بدلے جان" (خروج ۲۱: ۲۳) میں عاید کی گئی۔ ہمیں اس دستور کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قبائلی علاقوں میں ایک جان کے بدلے سات گنا اور لمک کے سلسلہ میں ستر گنا تک جانوں کا تقاضا تھا۔ لیکن مندرجہ بالا قانون اس ہولناک سزا کی تخفیف کے پیش نظر تھا۔ (پیدائش ۵: ۲۴-۱۲)۔ بہرحال یہ قدیم آئین کا ایک اصول تھا جس سے مسیح خداوند نے انکار کرتے ہوئے اپنی عملی زندگی سے پورا کیا۔ ہمارے خداوند کے اس قول "شریر کا مقابلہ نہ کرو" (متی ۵: ۳۹) کا خواہ اور کوئی مطلب کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے کہ یہ عہد عتیق کی اس تعلیم کہ "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کے متضاد ہے۔ ایک شریعت پسند اس قول سے یہ اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ کہ مسیح خداوند نے خاص طور پر "جان کے بدلے جان" کے لئے یہ نہیں کہا۔ لیکن اگر ہم مسیح کی تعلیم کی روح میں اس کا جائزہ لیں تو شریعت پسند کی اس تشریح کی یقیناً تردید ہو گی۔ مسیحی رحم ایک بدسے



بدترین مجرم کے لئے بھی یہ تقاضا کرتا ہے کہ "اس کی توبہ اور اصلاح تک نوبت پہنچے"۔ گو ہمیں اس میں شک ہے کہ قید کی زندگی کے موجودہ حالات میں ایسی توبہ اور اصلاح کا خیال کیا جاتا ہے یا نہیں۔ تاہم یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا موجودہ قید خانوں کے نگرانوں سے گہرا تعلق ہے۔ ان میں سے بعض اصلاح پسند کئی قسم کی مشکلات کے باوجود بھی ایسے قیدیوں کی ضرور مدد کرتے ہیں جو طویل عرصہ کے لئے قید میں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ سزا کے متعلق مسلمہ نظریات میں سزائے موت کو بالکل پسند نہیں کیا گیا۔ اصلاحی نظریہ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سزا کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مجرم کے کردار کی اصلاح ہو۔ اس میں سزائے موت کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ لوگ جو سزائے موت کے حامی رہے ہیں اور جو اس قسم کی سزا کو عمل میں لائے ہیں۔ انہوں نے عموماً محسوس کیا ہے کہ وہ مجرم کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں۔ جس کے لئے ہماری یہ امید بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں موت کے بعد ایک تادیبی کام بھی شمار ہے۔ مجرم کے بارے میں سزا کا نظریہ جو اس بات کا حامی ہے کہ سزا کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دوسروں کو ایسے ہی جرم کے ارتکاب سے روکا جائے۔ اس کے لئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ دوسروں کو سبق سکھانے کے لئے تاحیات قید کی نسبت سزائے موت ہی موثر ثابت ہو گی۔ لیکن ہمیں شک ہے کہ سزائے موت کبھی بھی مانع جرم ہو سکتی ہے۔ سزائے موت ایک قدیم انتقامی نظریۂ سزا پر مبنی ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ "جو آدمی کا خون کرے۔ اس کا خون آدمی سے ہو گا۔" (پیدائش ۹: ۶) اور جو اس نظریہ کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسانی انصاف کے لئے یہ بنیادی اور خدا کا مقرر کردہ اصول ہے۔ لیکن مسیحی کبھی بھی سزا کے انتقامی نظریہ کی

حمایت نہیں کریں گے۔ کیونکہ بائبل کی تعلیم کے مطابق بدلہ لینا خدا کا کام ہے (رومیوں ۱۲ : ۱۹)۔

سزائے موت کے خلاف یہ ایک زبردست دلیل ہے کہ اس کا دوسروں پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا۔ کیا یہ اخلاقی طور پر درست ہے کہ ہم جلاد سے ایک ایسے کام کی توقع کریں جو ہماری اپنی طبیعت کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جلاد کے کردار میں کون سے اثرات نمایاں ہوں گے؟ وہ لوگ جو قید خانہ کے ارد گرد میں پھانسی کے اوقات میں ان کا اظہار افسردگی اور اخبارات میں پھانسی کی تفصیلات غالباً اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ اس سے معاشرہ کے لوگوں کا کردار پست ہوتا ہے۔ لیکن اس سے اسی صورت میں گریز کیا جا سکتا ہے کہ سزائے موت کے طریقوں کو مشتہر کرنے کی بجائے صیغہ راز میں رکھا جائے۔ بر طرف دیگر یہ بھی دلیل ہے کہ یہ معاشرہ کی بہتری کے لئے ہے تاکہ لوگ جانیں کہ مجرم کو اس کے جرم کی مناسب سزا دی گئی ہے ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ ہر ایک مہذب ملک میں سزائے موت کو موقوف کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجرم کو سزا دینا ہی اس کی برائی کا حقیقی معاوضہ ہے۔

## ۴۔ خودکشی

گو خودکشی کو مسیحی روایت کے مطابق بہت سے ممالک میں ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن چند حالات میں خودکشی ایک ایسا عمل ہے۔ جس کی بعض دوسری روایات میں اخلاقی لحاظ سے بہت حمایت کی گئی ہے۔ سٹوئیکی داناؤں اور جاپانی سمرائیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اپنی بے عزتی کی حالت میں اپنی جان کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے اور ایسا قدم اٹھانا بلند حوصلگی، قوت فیصلہ اور



عزت نفس جیسی اعلیٰ خوبیوں کا ثبوت ہے۔ رومی خاتون لُوکریشیا جس نے عصمت دری کی ذلت برداشت کرنے کی بجائے اپنے آپ کو ختم کر لیا۔ آج تک نسوانی خوبیوں کی ایک مسلمہ مثال ہے۔ حتیٰ کہ بائیو تھیقر جیسا مسیحی اس شخص کو جو خودکشی کرتا ہے۔ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ فی زمانہ لوگ مرن برت اور بھوک ہڑتال کے ذریعہ اعلانیہ خودکشی سے حکومت کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کے مطالبات منظور کئے جائیں۔ ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک نیک کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ "یہ ایک ایسی زندگی کے لئے جو تا کام ہو چکی ہے۔ خود ہی سرانجام دیا ہوا کفارہ ہے۔" چنانچہ خودکشی کرنے والے کے ساتھ مسیحی نظریہ کے مطابق ہمیشہ ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا جائے۔ ہمارے مسیحی معاشرہ کے لئے یہ باعثِ شرم ہے اگر ہم اپنے بھائی کی مدد کئے بغیر اس کو زندگی کی صعوبتوں میں مرنے کے لئے چھوڑ دیں۔ اس حقیقت کو یورپ کے بہت سے شہروں میں "ٹیلیفون سمیرٹن" جیسی انجمن میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جہاں کہ ایک شخص جو خودکشی کی آزمائش سے دوچار ہے۔ ہمیشہ ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر ایک ایسے دوست کو پا سکتا ہے جو اس کی مصائب کو سمجھتے ہوئے مایوسی کے ان تاریک لمحات سے مخلصی دلانے کے لئے اس کی مدد کرے گا۔

تاہم اس ہمدردی کے باوجود بھی ایک مسیحی کو اِس امر کی پُر زور حمایت کرتا ہے کہ خودکشی کا فعل مسیح کے خیال کے متضاد اور اخلاقی طور پر غلط ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زندگی خدا کی طرف سے ہمارے پاس امانت کے طور پر ہے۔ چنانچہ یہ ہماری مسیحی مختاری میں شامل ہے کہ ہم اسکے لئے ذمہ داری کا اظہار کریں۔ زندگی کے کٹھن ترین لمحات میں بھی ہمیں اس ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہستی جس نے ہماری پیدائش

کے وقت ہمیں زندگی دی۔ صرف اسی کا حق ہے کہ وہ موت کے وقت اسے ہم سے واپس لے۔ مایوسیوں میں خودکشی کا فعل اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا میں ہمیں بچانے کی قوت نہیں ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہوداہ اسکریوتی نے مسیح خداوند کو پکڑوانے کے بعد اپنے اس خوفناک جرم کے لئے خود کفارہ دینے کے لئے اپنے آپ کو پھانسی دے دیا۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کے لئے یہ بہتر تھا کہ وہ توبہ کر کے خداوند کے پاس آتا کیونکہ وہ معافی دینے اور بحال کرنے میں قادر ہے۔ اکثر اوقات عدالتوں میں فیصلہ یوں ہوتا ہے کہ خودکشی غیر صحت مند ذہن کے باعث ہوتی ہے لیکن یہ صرف اس حال میں درست ہے اگر ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ صرف وہی ایک صحت مند ذہن ہے جس میں خدا کی نیکی کا ناکافی ایمان ہے۔

کچھ ایسے معاملات بھی ہیں۔ جنہیں خودکشی نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ وہ دوسروں کی خاطر ارادتاً قربانی کے طور پر ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ایک مثال پیش خدمت ہے کہ جب کیپٹن اوٹس ۱۹۱۲ میں قطب شمالی سے کیپٹن سکاٹ کے ساتھ آ رہا تھا۔ ایک دن وہ ارادتاً برفانی طوفان میں چل پڑا اور موت کے پنجوں میں آ گیا تاکہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے بچاؤ کے لئے اچھے مواقع مل سکیں۔ یاد رہے کہ اس وقت وہ اپنے آپ کو ایک عظیم شخصیت جتانے کی کوشش میں نہیں تھا (جیسے کہ اہل سکاٹ لینڈ نے اُسے بیان کیا ہے) بلکہ وہ مسیح خداوند کے نمونہ پر چل رہا تھا جس نے اپنے دوستوں کے لئے جان دی۔

## ۵۔ بے ایذا موت

ہم عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ مصیبت زدہ حیوان کو اس کی تکلیف سے بچانے



کے لئے مار دینا اس پر رحم کرنے کے مترادف ہے اور آج کل بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان میں سے جو لوگ لاعلاج امراض میں مبتلا ہیں۔ ان کو بھی بے ایذا موت سے ان کی تکلیفوں سے رہائی دلائی جا سکتی ہے تاہم سب اس پر متفق ہوں گے کہ کسی شخص کو بیمار کی جان لینے کا کوئی حق نہیں۔ جب تک متعلقہ شخص کی اجازت نہ ہو۔ لیکن یہ اجازت دینا بھی خودکشی میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ مسیحی اصولوں کے بالکل برعکس ہے۔ اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مصیبت زدہ لوگ خواہ کتنے ہی دکھ میں کیوں نہ ہوں وہ زندگی سے پیار کرتے ہیں اور اپنے دکھ سے رہائی پانے کے خواہاں ہیں۔ پھر ہم یہ بھی کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ لوگ جو اس طرح اپنے دکھ سے رہائی پانے کے خواہاں ہیں، یقیناً وہ صحتمند ذہن کے مالک ہیں۔ اور وہ لوگ جو بے ایذا موت کے حامی ہیں، عموماً وہ اِسے صرف ان حالات تک محدود کر دیتے ہیں جب کہ صحت یابی کی کوئی امید نہ ہو۔ لیکن کبھی کبھار ایسے مواقع بھی ہوتے ہیں جب ایسے لاعلاج مریض شفایاب بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں جو پیدائشی طور پر جسمانی محرومیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کہنا کہ وہ کبھی بھی پُر مسرت اور مفید زندگی نہ گذار سکیں گے غلط ہے ہرمان از ریخنتو جس کی پیدائش سے ہی کچھ ایسی محرومیاں تھیں کہ وہ بمشکل ہی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا اور کروٹ بدلتے ہوئے اُسے درد محسوس ہوتا تھا لیکن اِن تمام دکھوں کے باوجود وہ اسطرلاب جیسا سائنسی آلہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ اُس نے بہت پیارے لاطینی گیت لکھے اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ اپنے راہب ساتھیوں کو خوش رکھنے کے لئے وہ ہر دلعزیز تھا۔ ہیلن کیلر بہرے پن اور اندھے پن کے باوجود امریکی تہذیب پر بہت حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ بے ایذا موت کیلئے یہ بھی خطرہ ہے کہ رحم و ترس کی روح میں کسی کو مار ڈالنے کی اگر اجازت

بھی دی جائے تو یہ مصیبت زدہ کے آرام کی نسبت مار ڈالنے والے کے آرام کے لئے ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی کے اجتماعی کیمپوں میں بوڑھے یہودیوں کے ساتھ واقع ہوا۔

اس سلسلہ میں جب کہ ڈاکٹر جس نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ اپنے پیشہ کو زندگی بچانے کے لئے استعمال کریگا۔ اُسے ایسے موقع پر فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک مریض کا اپریشن کرنا جب کہ اس کی صحتیابی کے امکانات ہیں۔ یا اسے اسی وقت مار دینا ایک برابر ہے؟ اور کیا یہ مناسب ہے کہ ایک مریض کی تکلیف کو دُور کرنے کیلئے ایسی دوائیاں دینا بہتر ہے جن کے استعمال سے مریض کی زندگی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ بیشک ڈاکٹر پر ایسے فیصلے کرنے کی ذمہ داری عائد ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اس قسم کے فیصلوں میں ضرور شریک ہوں، موجودہ حالات میں ایک موٹر ڈرائیور کے لئے خواہ وہ کتنا ہی محتاط ڈرائیور کیوں نہ ہو، بہت سے امکانات ہیں کہ وہ کسی کو کار کے نیچے کچل دے۔ کیونکہ انسانی کمزوری کے تحت خود ڈرائیور اور راہگیروں کی توجہ دھوکہ دے سکتی ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسے حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ کسی بھی ڈرائیور کو نہیں چاہیئے کہ وہ تھوڑی سے تھوڑی مقدار میں کسی نشیلی چیز کے استعمال کے بعد اور مقررہ رفتار سے تیز گاڑی نہ چلائے۔ اور اعصابی لحاظ سے کمزور اور عمر رسیدہ لوگوں کو کبھی بھی گاڑی چلانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم نے انتہا پسندی کے تحت ایسے واقعات اور معاملات پیش کر دیئے ہیں جہانکہ فیصلہ کرنا بالکل آسان ہے۔ لیکن بہت سے حالات میں مثلاً ایک موٹر ڈرائیور کے لئے کہر آلود سڑک پر موٹر چلانے کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ جیسے کہ ایک ڈاکٹر کو واجبی طور پر خطرات مول نہ لینے میں فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔



# ۶- اسقاطِ حمل

عام طور پر مسیحیوں کا یہی نظریہ رہا ہے کہ ایک نازائیدہ بچے کی جان لینا، بالکل غلط ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یاد دلایا جاتا ہے کہ رومی حکومت میں ایک بہت بُری رسم تھی کہ ناپسند نوزائیدہ بچوں کو باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ابتدائی مسیحیوں کا کمال تھا کہ انہوں نے اس رسم کو بالکل ختم کر دیا۔ اسی طرح افریقہ میں بہت سے وحشی افریقی اپنے ناپسندیدہ جڑواں بچوں کو باہر پھینک دیتے۔ لیکن مسیحیوں نے اس رسم کو بھی روک دیا۔ اس مثال کے پیشِ نظر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ناپسندیدہ بچوں کو ماں کے رحم میں ہی مار دینا بالکل اسی حقارت اور نفرت کو ظاہر کرتا ہے جو افریقی اور رومی اپنے بچوں سے دکھاتے تھے۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ زندگی کے لئے ہمارا مسیحی رویّہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم نہ صرف جسمانی زندگی کی بلکہ انسان کی پوری شخصیت کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا ایک نازائیدہ بچے کو ایک خود مختار شخصیت تصوّر کیا جائے؟ لیکن یہ ایک بحث طلب سوال ہے۔ اس موجودہ لاعلمی کو مدّنظر رکھتے ہوئے حمل کو گرا دینا، سوائے اس سبب کے جب کہ ماں کی جان بچانے کی آرزو ہو۔ بالکل غلط ہے۔ وہ عورت جو عصمت دری کا شکار ہو چکی ہے یا ایک غیر شادی شدہ عورت کو حمل کے دوران اس بات کا ضرور احساس ہوگا۔ کہ پیدا ہونے والا بچّہ اس کے اور خاندان کے لئے باعثِ ذلّت ہوگا۔ تاہم تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ خدا کے فضل سے ایک ایسا بچّہ ماں اور سماج کے لئے عظیم برکتوں کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ لوگ جو ایسے حالات میں حمل گرانے کو درست خیال کرتے ہیں وہ "ہبرِس" کے خطرہ میں مبتلا ہیں جو خدا کی حکمران قوت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نا زائیدہ بچّہ کی زندگی اور ماں کی زندگی دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ایک اچھا خاصہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ رومن کاتھولیک معلّمینِ اخلاق کا خیال ہے کہ ماں کے دل میں ایک ایسا مسیحی جذبۂ ایثار ہو کہ وہ اپنے بچّے کے لئے جان دینے کے لئے بھی تیار رہے۔ تاہم، ہم میں سے اکثر لوگوں کا اندازِ فکر یہ ہے کہ ماں کو ایسے فیصلہ کے لئے چھوڑنا بالکل نامناسب ہے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ ایسے فیصلہ کے لئے تیار نہ ہو۔ بچے کی زندگی کو قربان کر دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ دوسرے بچوّں کو ماں کی نگہداشت کی ضرورت ہے اور ایک ایسی زندگی کو بچانے کی کوشش میں جس کی اقدار اپنے معاشرہ کے لئے بالکل غیر یقینی اور نامعلوم ہیں، ایک ایسی ہستی کو قربان کر دینا بالکل غلط ہے جس کی قدر و قیمت سے ہم پہلے سے واقف ہیں۔ تاہم ہمیشہ ایسا فیصلہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ دعائیہ غور و خوض کے لئے بہت کم وقت ہوتا ہے اور جو فیصلہ بھی ہو وہ بالکل جذباتی اور شدّید بے چینی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔

## ۷۔ حیاتِ حیوانات

مسیحی دردمندی کے لئے یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ انسان کسی بھی جاندار کو بے سبب دکھ نہ دے اور گذشتہ چند صدیوں میں اخلاقی ترقی کی طرف ایک اہم قدم ہے کہ جانوروں پر ظلم کرنے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ بیٹروں اور مرغوں کو لڑانے اور کئی قسم کے شکار سے جانوروں کو دکھ دینے کی مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں مسیحی معاشرہ کے بالکل متضاد ہیں۔ ایسی کوششوں کو درست ثابت کرنے کے لئے فضول بہانے تراشنا اس امر کی دلیل ہے کہ



وہ لوگ جو ایسی تفریحات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، انہیں اس کے راست ہونے پر شک ہے۔

مسیحیوں کا یہ بھی نظریہ ہے کہ انسان کو یہ قوّت دی گئی ہے کہ وہ تمام مخلوقات کو محکوم کرے اور وہ احتیاط اور دردمندی سے انہیں اپنے آرام اور ضرورت کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ نبّات خوروں کی طبّی اور منطقیانہ دلائل خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اُن کے اس خیال کے لئے مسیحی اخلاقیات میں کوئی جگہ نہیں۔ تاہم ایسے معاملات میں مسیحیوں کو چاہیئے کہ ان لوگوں کو جو ان سے مختلف نظریات کے مالک ہیں۔ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں "کھانے والا اس کو جو نہیں کھاتا حقیر نہ جانے اور جو نہیں کھاتا وہ کھانے والے پر الزام نہ لگائے" (رومیوں ۱۴: ۳)۔ نبات خوروں کے لئے پولس کا یہ مشورہ تھا کیونکہ اسے خیال تھا کہ وہ "ایمان میں کمزور" ہیں۔ اور اُن کی اولتیں مسیحی عقیدہ کے مطابق نہیں۔ مسیحیوں کو چاہیئے کہ بدھ مت کے اہنسا کے اصول کی طرح اپنی انتہا پسندی سے زندگی کی اتنی تعظیم بھی نہ کریں۔

دوسری طرف مسیحیوں کو جانوروں سے اس حد تک پیار نہیں کرنا چاہیئے جیسا کہ موجودہ دور میں جانوروں کے بچّوں کی پرستش تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور ان پر اتنی فضول خرچی کی جاتی ہے جب کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں انسان کے بچّے نانِ شبینہ سے بھی محروم ہیں۔ دورِ حاضرہ کا ایک ادیب یہ سن کر تڑپ اٹھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بہت سال ہوئے کہ یورپ کے لوگوں نے کشمیر میں جانوروں کی فلاح و بہبود کے لئے تو بہت کچھ کیا۔ لیکن اُن اُن دکھی کشمیری بچوں کو بالکل فراموش کر دیا جو ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی تکلیفوں میں کراہ رہے تھے۔ حیوانوں کی صحبت میں لوگ کچھ سکون پا سکتے ہیں

لیکن انہیں انسان پر ترجیح دینا مسیحیت کے بنیادی اصولِ تخلیق کے منافی ہے۔ کیونکہ صرف انسان ہی خدا کی شبیہ پر بنایا گیا ہے۔



# بارھواں باب

# مسیحی اور اُس کا خاندان

## ۱۔ شادی کا دستور

ہر ایک مسیحی خاندان کی ابتدا شادی سے ہے۔ اور مسیحی شادی ایک ایسا دستور ہے جس میں ایک مرد اور عورت ایک دُوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور خاص کر جنسی صحبت کے لئے عہد باندھتے ہیں۔ ہمیں اِس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ جنسی جبلّت خدا کی طرف سے ایک نعمت ہے جس کے نتیجہ میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ مسیحیت میں اِس عہد میں کسی اور دُوسرے کو شرکت کا حق حاصل نہیں اور مرد اور عورت دونوں میں سے کسی کو بھی اجازت نہیں کہ وُہ کسی غیر سے جنسی تعلقات رکھیں۔ یاد رہے کہ یہ عہد اُن کو ایک تاحیات تعلق میں منسلک کرتا ہے "جب تک کہ موت اُن کو جُدا نہ کرے"۔ ازدواجی رشتہ کی دُوسری اقسام گو ایک سے زائد بیویاں اور شاید ایک سے زیادہ خاوند رکھنے اور دونوں میں سے کسی ایک کی خواہش کے تحت شادی کو توڑ دینے کی اجازت دی سکتی ہیں۔ تاہم ایسی شادیوں میں عہد کے عناصر ضرور موجُود ہوتے ہیں۔

شادی کا عہد دُوسرے معاہدوں سے کم از کم دو صورتوں میں

مختلف ہے (ا) یہ ایک ایسا عہد ہے جس کی قانونِ قدرت خود تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ تخلیقِ کائنات میں شادی ایک قدرتی نظام ہے۔ قانونِ قدرت کا یہ تقاضا ہے کہ ازدواجی اتحاد کم از کم اُس وقت تک رہنا چاہیئے جب تک بچے پوری طرح پرورش نہ پا جائیں۔ اور جنسی تعلقات کے لئے جنس کی تعداد اِس بات کی شاہد ہے کہ یک زوجگی ہی شادی کی ایک قدرتی صورت ہے۔ یعنی رشتۂ ازدواج میں ایک مرد اور ایک عورت کا اتحاد ہی جائز اور درست نظر آتا ہے (یہ چند قسم کے پرندوں میں ایک قدرتی نظام ظاہر ہوتا ہے جب کہ دوسرے جانور بلا امتیاز جنسی جبلت کو پورا کرتے ہیں) مقدس اوگسطین نے عہدِ عتیق کے بزرگوں کی عزت و تعظیم کے پیشِ نظر یہ دلیل پیش کی کہ قانونِ قدرت کے تحت کثرتِ ازدواج ہی جائز ہے۔ ہمارے خداوند نے خود ظاہر کیا کہ شادی کو نظامِ قدرت میں ایک خاص مقام حاصل ہے جب اُس نے یہ کہا "کیا تم نے نہیں پڑھا کہ جس نے اُنہیں بنایا۔ اُس نے ابتدا ہی سے اُنہیں مرد اور عورت بنایا" (متی ۱۹: ۴) (ب) یہ عہد دوسرے معاہدوں سے اِس لحاظ سے بھی متفرق ہے کہ دو شخصیتیں ایک دوسرے پر اپنا پورا حق جتاتی ہیں۔ یہ حقیقت مقدس پولُس کے اِس بیان سے صاف ظاہر ہے، "بیوی اپنے بدن کی مختار نہیں بلکہ شوہر ہے۔ اِسی طرح شوہر بھی اپنے بدن کا مختار نہیں بلکہ بیوی" (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۴)۔ انیگلیکن کلیسیا کی نکاح کی عبادت میں یہ الفاظ "اپنے ساری دنیاوی مال میں تجھے حصہ دار بناتا ہوں۔" اِس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ شوہر اور بیوی ایک باہمی معاہدہ میں اپنا سب کچھ ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ (ج) ازدواجی عہد دوسرے معاہدوں سے یوں بھی مختلف ہے کہ اِس کے نتیجہ میں نئی شخصیتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بچے اپنے والدین سے اپنے تعلقات کے پیشِ نظر اپنی ضروریات



کو پورا کرنے کے لئے اُن سے تقاضا کرتے ہیں۔ اِسی لئے ملکی قوانین میں بچوں کو نظر انداز کرنا جرم ہے۔ چنانچہ کلیسیا کو تو بچوں کے لئے اور بھی زیادہ فکر مند ہونا چاہیئے "کیونکہ خدا کی بادشاہی ایسوں ہی کی ہے"۔

مسیحی شادی دوسری تمام قسم کی شادیوں سے اِس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ اِس عہد میں ایک تیسری شخصیت بھی شامل ہے یعنی یہ "شادی مسیح میں ہوتی ہے" (ا کرنتھیوں ۷: ۳۹)۔ اِس سے یہ مراد ہے کہ یہ ایک ایسا عہد ہے جس میں خدا کا فضل دیا جاتا ہے۔ تاکہ اِسے مسیحی معیار کے مطابق نبھایا جائے۔ خدا کے فضل کی اِس لئے ضرورت ہے کہ جب جنسی خواہشات کم ہو جاتی ہیں۔ اُس وقت بھی میاں بیوی کو ایک دائمی محبت اور وفاداری کا یقین دلایا جائے۔ لیکن گذشتہ ایام میں شادی کے رشتہ کو استوار رکھنے کے لئے معاشی ضروریات اور رائے عامہ جیسے اجزاء ضروری خیال کئے جاتے تھے۔ آج کل مغربی ممالک میں طلاق کے متعدد واقعات شاہد ہیں کہ خدا کے فضل کے بغیر موجودہ معاشی اور معاشرتی صورتِ حال میں شادی کے ناکام ہونے کے عظیم خطرات ہیں۔

مسیحی لوگوں کا یہ رجحان ہے کہ وہ مسیحی شادی کی عظمت کو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ اِن دو بیانات کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یعنی "شادی ایک ساکرامنٹ ہے" اور "شادی ایک ناقابلِ تنسیخ رشتہ ہے۔ ریفارمڈ کلیسیاؤں کے ماہرینِ علمِ الٰہیات لفظ "ساکرامنٹ" کے معنوں کو "فضل کے عہد کی علامتوں اور مہروں تک محدود کر دیتے ہیں۔ اُن کا یہ نظریہ درست ہے کہ بپتسمہ اور عشائے ربانی ہی وہ علامتیں ہیں جو مسیح میں خدا کے نجات بخش کام کو پیش کرتی ہیں۔ اور اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اِن ساکرامنٹوں کی پابندی کا براہِ راست مسیح خداوند کی طرف سے حکم دیا گیا ہے۔

CamScanner

لیکن اُس نے شادی کے لئے کبھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ وہ لوگ جو شادی کو ایک "ساکرامنٹ" قرار دیتے ہیں۔ وہ اِن مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیتے ہیں حق بجانب ہیں۔

(ا) مسیحی شادی میں ایک بھید کی بات یہ ہے کہ اُس وقت خُداوند خود موجود ہوتا ہے۔ اور "شادی مسیح میں" ہوتی ہے۔ ابتدائی کلیسیا میں جیسے کہ عشائے ربانی اور بپتسمہ کے لئے کوئی خاص تحریری عبادتیں نہیں تھیں، اسی طرح شادی کے لئے بھی کوئی خاص رسُومات نہیں تھیں۔ لیکن جلد ہی یہ دستور رائج ہو گیا کہ شادی کے موقع پر عشائے ربانی بھی دی جائے۔ اِس رسم کو پھر سے شروع کرنے کا یہ یقیناً یہ مطلب ہو گا کہ شادی شدہ جوڑے کا اتحاد کلیسیا کے وسیع اتحاد یعنی مسیح کے بدن میں ہو گیا ہے۔

(ب) شادی کسی حد تک ضرور فضل کا ایک وسیلہ ہے۔ جیسے کہ ایک انگریز رچرڈ ہوکر نے ساکرامنٹ کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ یہ "ہمیشہ کی زندگی کے لئے خدا کا ایک طاقتور ذریعہ" ہے۔ اِس سلسلہ میں پُرانے ماہرینِ علم اِلٰہیات کا شادی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ "گناہ کا علاج اور حرامکاری سے اجتناب کا ایک ذریعہ ہے"۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ خاوند اور بیوی کی رفاقت کو خدا "روحوں کی تربیت" کے لئے ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں خوشگوار تعلقات میاں بیوی کی ابدیت کے لئے تیاری کا باعث بن سکتے ہیں۔

یہ لفظ "ناقابلِ تنسیخ" کچھ غیر واضح سا لفظ ہے۔ اِس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے "جو منسُوخ نہ کیا جانا چاہیئے"۔ اور اِس صُورت میں تو تمام مسیحی متفق ہوں گے۔ کہ شادی ناقابلِ تنسیخ ہے۔ تاہم بہت سے لوگ اِس سے یہ معنی بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ "جو منسوخ نہیں کیا جا سکتا"۔ اِس صُورت میں شادی کا معاہدہ جب انہیں ایک تبدیل شدہ حیثیت دیتا ہے، تو خاوند



اور بیوی کے تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہو سکتے جیسے کہ باپ اور بیٹے کے تعلقات جو ہر حالت میں قائم رہتے ہیں خواہ دونوں اس کی تردید بھی کیوں نہ کریں۔ اِن معنوں میں شادی کے ناقابلِ تنسیخ ہونے کے خلاف کافی دلائل ہیں (ا) یہ کتابِ مقدس کی تعلیم کے متضاد ہے جس میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ موت سے شادی کے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں (مرقس ۱۲ : ۲۵) (ب) یہ کلیسیائی دستور کے بھی متضاد ہے کیونکہ مرد یا عورت میں سے کسی ایک کے انتقال سے دوسرے ساتھی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دی جاتی رہی ہے (ج) مقدس پولس کی یہ تعلیم ، کہ شادی مسیح اور کلیسیا کی رفاقت کی علامت ہے، اِس امر کی دلیل نہیں کہ شادی کے تعلقات کا منقطع ہونا ناممکن ہے، جیسے کہ کلیسیا سے برگشتگی کے کئی امکانات ہیں (افسیوں ۵ : ۳۲)۔ خدا کی یہ مرضی ہے کہ شادی ایک تاحیات رشتہ ہے اور جنہیں خُدا نے جوڑا، اُنہیں کسی شخص کو بھی جُدا نہیں کرنا چاہیئے۔ تاہم مرد اور عورت دونوں خدا کی طرف سے دی ہوئی اپنی آزاد مرضی کے تحت ایک دُوسرے سے جُدا ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کہیں کہ ایک مرد اور عورت جب اُن کی شادی ہو جائے اور اب وہ اپنے پہلے ازدواجی تعلقات کو منقطع کر کے کسی دُوسرے کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اُن سے بچّے بھی پیدا ہو جائیں اور پھر بھی کہتے رہیں کہ وہ اب بھی شادی کے ناقابلِ تنسیخ رشتہ میں منسلک ہیں، تو یہ بالکل غلط ہے۔

## ۲۔ طلاق

طلاق سے متعلق ہمارے خُداوند کی مرقس ۱۰ : ۲-۹ میں تعلیم بالکل واضح اور فیصلہ کُن ہے۔ مقابلتاً یہودیت کے مسلمہ اصول کے جس کے تحت ایک شخص کو پُوری آزادی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے

مسیح خداوند نے صریحاً طلاق کو ممنوع قرار دیا۔ علاوہ اِس ممانعت کی بنیاد قانونِ قدرت پر رکھتا ہے جو کہ "خلقت کے شروع سے" اور توریت کے دو پاروں "نر اور ناری اُن کو پیدا کیا (پیدائش ۱ : ۲۷) اور" دونوں ایک تن ہوں گے"۔ (پیدائش ۲ : ۲۴) پر مشتمل ہے۔ اور اُس نے نہایت واضح طور پر یہ نظریہ پیش کیا کہ شادی ایک مرد اور ایک عورت کا اتحاد ہے۔ جو ایک اور واضح فیصلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ "جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جُدا نہ کرے"۔

اپنے اِس بیان میں مسیح خداوند مختلف آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہر ایک طلاق دینے والا خاوند (مرقس ۱۰ : ۱۱) طلاق دینے والی بیوی (مرقس ۱۰ : ۱۲) ایک طلاق یافتہ بیوی کا نیا شوہر (لوقا ۱۶ : ۱۸) اور ایک مطلوقہ بیوی دوبارہ شادی کرنے سے زناکاری کے فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور یُوں خُدا کے ایک بنیادی حُکم کو توڑتے ہیں۔ ایک بیوی کا اپنے خاوند کو چھوڑ دینا گو کہ یہودی دستور کے متضاد معلوم ہوتا ہے لیکن ہیرودیاس کا واقعہ اِس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ کہ بیوی بھی اپنے خاوند کو چھوڑ سکتی تھی۔ یاد رہے کہ ہیرودیاس نے یہودی شریعت کے مطابق نہیں بلکہ رُومی آئین کے تحت ایسا قدم اٹھایا۔ یہ عین ممکن ہے کہ مسیحی کی شریعت میں بھی یہ اعتراف کیا جائے کہ مرد اور عورت دونوں کی یکساں اہمیت ہے (مقدس پولُس بھی شادی میں مرد اور عورت دونوں کی برابر ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن مغربی ممالک میں طلاق کے لئے موجودہ آزادی میں یہ برائی ہے کہ کتنے ہی معصوم لوگوں کو اخلاقی طور پر مشکوک صُورتِ حال میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مطلوقہ یا مطلوقہ سے شادی کرنے والے پھر ضرور لوگ انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں۔

اس میں شک ہے کہ آیا ہمارے خداوند کی کبھی بھی یہ خواہش تھی۔



کہ طلاق کی ممانعت جو کہ مسیحیوں کے لئے ایک الگ معیار پیش کرتی ہے۔ اُسے مُلک یا کلیسیا کے قانونی ضابطوں میں شامل کیا جائے۔ (ہمارے پاس ایسے تحریری قوانین نہیں جو شریر کا مقابلہ کرتے یا کِسی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں)۔ ہمارے خداوند کا یہ نظریہ تھا کہ مسیحیوں کو طلاق کے متعلق اپنا ایک الگ معیار رکھنا چاہیئے۔ گو یہودی شریعت اور رُومی آئین میں طلاق کی اجازت تھی لیکن عہد عتیق میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ طلاق گو الٰہی قانون کے متضاد تھی، تاہم "انسان کی سخت دلی کے سبب" سے یہ رعایت دی گئی۔ بعینہٖ مسیحی خداوند نے متی کی انجیل (۵ : ۳۲، ۹:۱۹) میں "حرامکاری کے سوا" کسی اور سبب سے طلاق کو جائز قرار نہیں دیا۔ اِسی قسم کی اجازت یہودی ربّی شامائی کے پیروکاروں نے دی جن کا یہ نظریہ تھا کہ ہر ایک یہودی کو بغیر کِسی وجہ کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت ہے، لیکن اخلاقی طور پر یہ صرف اسی صورت میں جائز ہے جب حرامکاری کے باعث یہ قدم اُٹھایا جائے (اس کے مدِمقابل ہیلی کے شاگردوں کا یہ نظریہ تھا کہ اگر بیوی نے کھانا پکاتے ہوئے کوئی پلیٹ ضائع کر دی ہو یا خاوند نے اُس سے زیادہ خوب صورت بیوی ڈھونڈ لی ہو۔ تو وُہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں درست ہے) بعد ازاں پولُس نے صرف اِس صُورت میں دُوسری شادی کی اجازت دی۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک بے ایمان ہے۔ اور وُہ اپنے ایماندار مسیحی ساتھی کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ چھوڑا ہوا مسیحی ساتھی دوبارہ شادی کر سکتا ہے۔ یہ رعایت پولُس نے (۱۔ کرنتھیوں ۷ : ۱۵) میں دی ہے۔ لیکن اس نے یہ اجازت نہیں دی کہ ایک مسیحی اپنے بے ایمان ساتھی کو چھوڑ دے۔ مغربی دنیا میں کلیسیا اور سول قوانین میں مسیح کی طلاق سے متعلقہ ممانعت کی شرائط کا ایک طویل ریکارڈ بن چکا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں

کہ ہمارے خداوند کی اس تعلیم کا اس کے شاگردوں پر حیران کن ردِ عمل ہُوا جب انہوں نے یہ کہا "اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں" (متی ۱۹: ۱۰)۔

یاد رہے کہ عہد جدید کی یقیناً یہ تعلیم نہیں کہ طلاق بالکل ناممکن ہے۔ گو ماہرینِ اخلاقیات نے "ایک تن ہونے" اور اِن الفاظ "جن کو خدا نے جوڑا ہے" سے یہ اخذ کیا ہے کہ طلاق کِسی صورت میں ممکن نہیں۔ تاہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ طلاق "عمل جراحی کے اپریشن" کی طرح ہے۔ لیکن پولُس کی رعایت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ طلاق ممکن ہے۔ اُس نے خُود یہ کہا کہ وُہ شخص جو کِسی کسبی کے ساتھ صحبت کرتا ہے۔ وُہ اس کے ساتھ "ایک تن" ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ "ایک تن ہونا" طلاق کی ناممکنات کے ثبوت کے لئے استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

موجودہ صورتِ حال میں قانُونی طور پر طلاق دینا ایک آسان مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن یہ مسیحی نظریات کے نتیجہ میں عورت کی آزادی سے پیدا ہُوا ہے۔ ایک مطلوقہ عورت اب چند صدیوں پہلے کی طرح اخلاقی اور معاشی حیثیت سے "چھوڑی ہُوئی" نہیں۔ بہت سے مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ایک مکمل طور پر ناکام شادی کے لئے طلاق شاید عین خدا کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور دونوں میاں بیوی اور بچوں کی بھلائی کے لئے طلاق ہو جانا بہتر ہے۔ اور اس کے بعد دونوں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت دی جانی چاہیئے۔ لیکن دوسری طرف ہمیں مسیحیوں کی آزادی کو ملحوظ رکھنا ہے۔ کہ وہ اس کے لئے خُود فیصلہ کریں۔ تاہم کلیسیا کو دنیا کے سامنے یہ پیش کرنا ہے کہ مسیح خداوند نے "کسی قسم کی بھی طلاق" کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں کیا۔ لیکن اِسے قانُونی ضابطہ کی شکل دینا ناقابلِ عمل ہے، اور موجودہ دَور میں اِسے پسند بھی نہیں کیا جائے گا۔ آج کل جب کہ اور بہت سے جرائم



سننے میں آتے ہیں۔ تو اِن حالات میں طلاق سے ممانعت کی منادی بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہے۔ بعض مسیحیوں کا خیال ہے کہ آج کل صرف ایک ہی طریقہ ہے جس سے کلیسیا اس معاملہ میں یُوں گواہی دے سکتی ہے کہ نکاح کی کلیسیائی رسم میں مطلوقہ اشخاص کی دوبارہ شادی کرنے سے انکار کر دے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ایسا نظریہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ اور یہ ایک مسیحی کی شخصی آزادی میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیحیوں نے ہمیشہ قانونی شادی کو بھی بالکل درست قرار دیا ہے اور کلیسیائی شادی سے انکار کا یہ مفہوم نہیں کہ اس طرح کسی کو کلیسیائی حقوق اور مقدس شراکت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کلیسیا کو چاہیئے کہ نکاح کی عام عبادت میں بھی اِیسے لوگوں کو برکت دے۔ جنہوں نے اپنی صاف ضمیری کے تحت تائب گنہگار کی حیثیت سے مسیح کی معافی کے نشان کے طور پر دوبارہ شادی کی ہے۔ سب اس بات پر متفق ہوں گے کہ آج کل کلیسیا کو اپنے نظریہ کی ان دو طریقوں سے وضاحت کرنی چاہیئے کہ جو پہلی دفعہ شادی کرتے ہیں اُن کو مسیحی شادی کی حقیقت کے بارے میں شخصی تعلیم دے اور جن کے ازدواجی تعلقات منقطع ہونے کے خطرہ میں ہیں، اُن کی نہایت ہوشیاری اور ہمدردی سے صلاح کاری کرے اور خادمانِ دین کا یہ فرض ہے کہ وہ شادی کے موقعہ پر اور بعد میں بھی لوگوں کو بتائیں کہ وُہ صُلح کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

## ۳۔ شوہر اور بیوی

طلاق اور اس سے متعلقہ مسائل کے پیشِ نظر ہمیں اِس حقیقت کو

فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ بہت سی شادیاں کامیاب بھی ہیں۔ اور نہ ہی عہد جدید کی شادی سے متعلق مثبتی تعلیم کو نظر انداز کریں۔ یہ سچ ہے کہ کرنتھس کے بد چلنی کے ماحول اور دُنیا کے خاتمۂ قریب کی اُمید میں پولُس نے اپنے قارئین کو نصیحت کی کہ وُہ شادی سے اجتناب کریں۔ اور یُوں یونانیوں کے کنوار پن کی فضیلت کے نظریہ سے ابتدائی کلیسیا کے خیال میں متعصبانہ رنگ جھلکنے لگا۔ تاہم بعد میں پولُس نے اپنے ایک خط میں اس بات کو ظاہر کیا کہ مسیح اور اُس کی کلیسیا کے تعلقات کو ظاہر کرنے کے لئے شادی کی تشبیہ ہی نہایت موزوں ہے۔ اور یہی تشبیہ مکاشفہ کی کتاب میں پائی جاتی ہے (افسیوں ۵: ۳۲، مکاشفہ ۲۱: ۹)۔ مقدس پولُس نے اپنی اخلاقی تعلیم میں شوہر اور بیوی کے تعلقات پر کافی زور دیا جیسے کہ "خاندانی فرائض کی فہرست" میں پایا جاتا ہے (کلسیوں ۳: ۱۸-۴: ۱، افسیوں ۵: ۲۱-۶: ۹، ططس ۲: ۱-۱۰، ۱-پطرس ۲: ۱۸-۳: ۷)۔ اِس کے لئے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی کلیسیا میں عام تعلیم کے نمونہ کی ایک مثال ہے جس سے یہ واضح ہے کہ مسیحی کلیسیا میں خاندان کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اِن فہرستوں میں خاوند اور بیوی کا یہ تعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ ان میں سے خاوند تو حکومت کرنے والا ہے اور بیوی محکوم ہے لیکن اِسے ایک عالمگیر مسیحی اُصول کی حیثیت سے قبول کرنے سے پہلے ہمیں جائزہ لینا چاہیئے کہ اِن فہرستوں میں مالکوں اور غلاموں کی تعلیم سے یہ ظاہر ہے کہ گھریلو غلاموں اور مالکوں کی پہلی صدی کی شرائط کا اطلاق دورِ حاضرہ کے آجروں اور ملازموں پر ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح جوں جوں جنسی برابری کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے توں توں خاوند اور بیوی کے تعلقات میں نمایاں تبدیلیاں رُونما ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ کافی حد تک مسیحی تعلیم اور عورت کی معاشی خود مختاری کا ایک نتیجہ ہے۔ آج کل



بہت سے مسیحی گھروں میں بیوی خاوند کی حکومت میں زندگی بسر نہیں کرتی بلکہ دونوں باہمی طور پر ایک دُوسرے کی مدد کے ذریعے برابری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تاہم طبعی طور پر بنیادی جنسی عمل میں خاوند ایک فاعلی اور بیوی مفعولی کردار ادا کرتی ہے اور یہ حقیقت گھر کی عام تشکیل میں بھی منعکس ہوتی رہتی ہے۔ بہت سے لوگ اِس بات پر متفق ہونگے کہ گھر میں اگر کسی کو حکومت کرنے کا حق ہے تو وُہ صرف خاوند ہے (یقیناً ایسا انتظام مسیحیوں کے لئے بہت اچھا انتظام ہوگا)۔ شادی میں برابری کی رُوح نہ صرف مسیحیت کی تعلیم ہے بلکہ عملی طور پر بھی حاکم اور محکوم ہونے کے تعلقات زیادہ مشکل ہیں۔

## ۴۔ خاندانی منصوبہ بندی

قدیم عبرانی لوگ خُدا کے اِس حُکم کے کہ "پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو" (پیدائش ۱: ۲۸، ۹: ۱) جو تخلیقِ کائنات کے وقت اور طوفانِ نُوح کے بعد دیا گیا قائل تھے۔ اور بہت سی تہذیبوں میں بڑا خاندان خُدا کی خاص برکتوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے "اولاد خداوند کی طرف سے میراث ہے..... خوش نصیب ہے وُہ آدمی جس کا ترکش اُن سے بھرا ہے" (زبور ۱۲۷: ۳، ۵)۔ یہ اعتقاد اِس حقیقت سے اور مضبوط ہو گیا ہے کہ کسان طبقہ میں بچے ایک معاشی اور معاشرتی اثاثہ ہیں حتےٰ کہ آجکل بھی ایک بہت بڑے خاندان میں ایک دُوسرے کی مدد کرنے کے ماحول میں پرورش پانا بچے کیلئے ایک تعلیمی سہولت ہے۔

آج کل جب کہ طبی ترقی سے بچوں کی بحفاظت پیدائش اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے طویل زندگی کی توقعات سے دُنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تو مندرجہ بالا مسلمہ نظریہ ایک

بحث طلب سوال بن کر رہ گیا ہے۔ مستقبل کے لئے منصوبے بنانے والوں نے اس بات کی پیشگوئی کی ہے کہ اگلی دو صدیوں میں نسلِ انسانی کی تباہی کا امکان ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کو خوراک مہیا کرنی پڑے گی جبکہ پیداوار میں اس کے برابر کوئی ترقی نہیں ہو رہی۔ خواہ ہم اتنے طویل عرصہ کے لئے پیشگوئی پر تنقید ہی کیوں نہ کریں۔ لیکن کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ چند ایک ممالک میں پہلے ہی آج کل بہت سے لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس خطرہ کے پیشِ نظر اتنی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا بالکل مناسب ہوگا۔

بہت سے مسیحی اس پر متفق ہوں گے کہ ایسے ممالک میں یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کے افراد کی تعداد کے لئے سنجیدگی سے سوچیں۔ بدقسمتی سے غالباً بہترین والدین ہی جو اپنے بچوں کی اچھی طرح پرورش کر سکیں گے۔ وہی خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں گے۔ خاندانی منصوبہ بندی کو اپنانے کے لئے غور و خوض کرنا والدین کا نہ کہ کسی اور کا فرض ہے اور حکومت کا شاید یہ فرض ہے کہ وہ بڑے خاندانوں کی اُن کے خاندانی الاؤنس یا ٹیکسوں میں رعایت (ایسے دستور چند ایک مغربی ممالک میں رائج ہیں) ختم کرنے سے حوصلہ شکنی کر سکتی ہے۔ یا اس کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ حکومت ایسے مراکز قائم کرے جہاں والدین کو خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن اگر حکومت لوگوں پر خاندانی منصوبہ بندی ٹھونستی ہے تو یوں وہ اپنے جائز اختیارات سے تجاوز کرتی ہے۔

ابھی تک مسیحی، خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں سے متفق نہیں حالانکہ کسی حد تک اُن کا استعمال مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک پرانا نظریہ یہ تھا کہ مباشرت سے اجتناب ہی خاندانی منصوبہ بندی کا واحد ذریعہ



ہے۔ لیکن موجودہ دور میں کامیاب اور پُر مسرت شادی کے لئے مباشرت کا جاری رکھنا اور اس سے اجتناب کے خطرات پر زور دیا جاتا ہے۔ رومن کاتھولک کلیسیا نے اس نظریہ میں یہاں تک ترمیم کر دی ہے کہ "محفوظ میعاد" میں مباشرت کرنا درست ہے۔ اور اس کے علاوہ اُس وقت مباشرت کی جائے جب کہ بچے پیدا کرنے کی خواہش ہو۔ وہ لوگ جو موجودہ دور میں خاندانی منصوبہ بندی کو قدرت کے طریقۂ کار میں "مصنوعی مداخلت" خیال کرتے ہیں، انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ بھی حفظانِ صحت کے اقدامات اور علاج معالجہ جیسی "مصنوعی مداخلت" سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ آج کل وہ مسیحی جو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو گناہ خیال کرتے تھے، وہ بھی دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر ضرور اس کی حمایت کر رہے ہیں۔

جیسے کہ ہم نے اس باب میں پیش کیا ہے کہ وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ خاندان میں ایک بچے کا پیدا ہونا خدا کی ایک عظیم نعمت ہے، وہ کتابِ مقدس کے اس نظریہ کو کہ بڑا خاندان خدا کی بخشش کی علامت ہے ترک کرنے میں تامّل کریں گے۔ وہ عمل جو مرد اور عورت کے لئے خدا نے اپنے تخلیقی کام کے لئے مقرر کیا ہے، اگر نوجوان اُسے مانعِ حمل کے طریقوں سے محض اپنی لذّت کے لئے اپنائیں، تو اس کی ہم ضرور مخالفت کریں گے۔ کیونکہ اس سے معاشرہ میں برائی پیدا ہوتی ہے۔ بہ طریقِ دیگر یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ خاوند اور بیوی جنہوں نے کافی غور و خوض اور دُعا کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ وہ اور بچے پیدا نہیں کریں گے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ صاف ضمیری سے موجودہ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو استعمال میں لاتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قدرتی طور پر محبّت کا اظہار کریں۔ اس طرح نہ تو وہ زندگی کو ضائع کرتے ہیں اور نہ ہی افزائشِ نسل کا سبب بنتے ہیں۔

## ۵۔ والدین اَور اولاد

خاندانی فرائض کی فہرست میں کافی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً "اے فرزندو ہر بات میں اپنے ماں باپ کے فرمانبردار رہو" (افسیوں ۶ : ۱، کلسیوں ۳ : ۲۰)۔ اَور یہ عہدِ عتیق کی حکمت کی کتابوں میں دی ہوئی بچّوں کی تابعداری کی اہمیت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اِس میں ہمارے خُداوند یسوع مسیح کا خُود اپنا نمونہ ہے جو ناصرۃ میں اپنے والدین کا تابعدار تھا (لوقا ۲ : ۵۱)، اور جس نے دُکھ سہہ سہہ کر فرمانبرداری سیکھی (عبرانیوں ۵ : ۸)۔ عہدِ جدید اُن لوگوں کے نظریات کے حق میں نہیں جو اپنے بچّوں کو بغیر ضبط کے اپنے جذبات کا اظہار کرنے دیتے ہیں۔ دراصل یہ کچھ نیم مستند نفسیات یا نافرمانی کی اُن عادات پر مبنی ہے۔ جو والدین کی غفلت سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بالکل ناواجب ہے کہ ہم خاندانی فرائض کی فہرست میں بچوں کی ہدایات پر تو بہت زور دیں لیکن دوسری طرف والدین کے لئے ہدایات کو مدِنظر نہ رکھا جائے۔ "اے اولاد والو! اپنے فرزندوں کو دِق نہ کرو تاکہ وہ بیدل نہ ہو جائیں (کلسیوں ۳ : ۲۱) اَور "اے اولاد والو! تُم اپنے فرزندوں کو غصّہ نہ دلاؤ بلکہ خُداوند کی طرف سے تربیت اَور نصیحت دے دے کر اُن کی پرورش کرو"۔ (افسیوں ۶ : ۴)۔ اِن دونوں آیات میں اِس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ بچے، غصّہ اَور دل شکنی سے مشتعل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ بچّوں کو تنگ کرتے ہیں تاکہ انہیں بڑوں کی دل لگی کے لئے مشتعل کیا جائے۔ اَور بعض اوقات مصنوعی بہانوں سے دِق کر کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اِس طرح دِق کرنے سے اُن کی اچھّی تربیت ہو گی۔ بعض اوقات بچّوں کی یُوں بھی دل شکنی ہو جاتی ہے۔ جب اُن کو اتنے زیادہ حکم دیئے جائیں اَور پھر اُن سے توقع کی جائے



کہ وُہ اُن کی تعمیل کریں۔ انسان کی عقلِ سلیم اَور موجُودہ تعلیمی نظریات اِس رائے پر متفق ہیں کہ دُوسرے رشتوں کی طرح بچّوں کے ساتھ بھی مناسب اَور صحیح رویّہ یہ ہے کہ اُن کو کم سے کم حُکم دیئے جائیں اَور پھر اِس بات کا خیال رکھا جائے کہ وُہ ضرور اُن کی تعمیل کریں۔

یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ جیسے موجُودہ حالات میں غلاموں اور مالکوں اَور شوہر اَور بیوی کے تعلقات میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے اِسی طرح اِن حالات نے والدین اَور بچّوں کے تعلقات میں ترمیم کر دی ہے۔ اَور اِس سلسلہ میں تو مسیحیوں کو یقیناً موجودہ ایّام میں بچّوں اَور والدین میں بڑھتی ہوئی رفاقت اَور دوستانہ تعلقات سے خوش ہونا چاہیئے۔ فرمانبرداری کا فرض دو طریقوں سے متاثر ہوتا ہے۔ (ا) والدین کو چاہیئے کہ وُہ بچّوں سے ایسا کام کروانے کی توقع نہ کریں جس کی انہیں عادت نہیں ہے۔ مثلاً اگر وُہ خُود گرجا گھر نہیں جاتے تو اُن کا بچّوں کو گرجا گھر جانے کے لئے حُکم دینا بالکل غیر موثر ہو گا (ب) پھر والدین کو یہ بھی چاہیئے کہ اگر وُہ بچّوں کو کوئی کام کرنے کا حکم دیتے ہیں، تو اُنہیں یہ بھی بتائیں کہ اِس کام کا کیا مقصد ہے۔ گو ایسی تفصیلات وُہ چھوٹے بچّوں کو بتانے سے قاصر ہیں، تاہم جو بچے سمجھ سکتے ہیں انہیں ضرور سمجھایا جائے۔ والدین اَور بچّوں کو باہم مِل کر کام کرنے سے گھر کے ایک محدُود معاشرہ میں رہنا ہے جو دُنیا کی وسیع زندگی کے لئے ایک قدرتی تیاری ہے۔

اولاد والوں کی نصیحت کے لئے مُقدّس پولُس دو الفاظ تربیت اَور نصیحت، استعمال کرتا ہے (افسیوں ۶ : ۴)۔ چاہیئے کہ تمام نصیحتیں سب سے پہلے کتابِ مقدّس سے ہوں اَور اِس معاملہ میں نہ تو خادم الدّین اَور نہ ہی استاد، والدین کی جگہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ موثر

مذہبی تعلیم ماں باپ کی طرف سے ہوتی ہے۔ لفظ "تربیت"، عموماً سزا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور عہدِ جدید کی یونانی زبان میں یہ جسمانی سزا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بچّوں کی تربیّت میں تشدّد کے لئے علمِ الٰہی کا یہ ثبوت ہے کہ خُدا بھی اپنے بڑے بچّوں کی تربیت کے لئے سختی سے کام لیتا ہے۔ اگر خُدا کا یہ مقصد ہوتا کہ یہ دُنیا اُس کے بچّوں کے لئے محض آرام اور مسرّتوں کا مقام ہوتا، تو یقیناً وہ اُسے مختلف صورت میں خلق کرتا۔

فطری خواہش کے تحت گھر میں نظم وضبط کے علاوہ، فرمانبرداری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم بچّوں کی تابعداری کے لئے تربیت کریں۔ وہ بچّہ جو اپنے زمینی باپ کی جسے اُس نے دیکھا ہے تابعداری نہیں کرتا۔ وُہ آسمانی باپ کی جسے اُس نے نہیں دیکھا، کبھی بھی تابعداری نہیں کر سکتا۔ حکم ماننے سے ہم تابعداری سیکھتے ہیں۔ اور سب سے اہم تابعداری خُدا کے کلام کی تابعداری ہے۔

## ۶۔ خاندانی زندگی کے خطرات

ہمارے خُداوند نے نہایت واضح طور پر کہا کہ خاندانی ذمہ داریاں ہمارے مسیحی فرض کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ لیکن بذاتہٖ اِن ذمہ داریوں کے لئے اُس نے مزید کچھ نہ کہا۔ مسیح خداوند نے ایسی ذمہ داریوں کو ناصرت میں بڑھئی کی حیثیّت سے کام کرنے . . (مرقس ۶ : ۳)۔ اور اپنی والدہ اور اپنے بہن بھائیوں کا بوجھ برداشت کرنے اور صلیب پر اپنی والدہ کو اپنے محبوب شاگرد کے سپرد کرنے سے ضرور تسلیم کیا (یوحنا ۹ : ۲۵-۲۷)۔ تاہم اُس نے اِن ذمہ داریوں کو اپنے آسمانی باپ کی مرضی پر ترجیح نہ دی اور انہیں ہرگاہ ثانوی حیثیت دی۔ مثلاً جونہی اُس پر شریعت کے



فرائض عائد ہو گئے اور وُہ ہیکل میں نصیحت کے لئے ٹھہر گیا تو وہاں پر اس نے اپنے والدین سے لاتعلقی کا اظہار کیا (لوقا ۲ : ۴۱-۴۸)۔ اپنی خدمت کے دوران اس نے ارادتاً اپنے بھائیوں اور ماں کے تقاضے کے باوجود کام کرنے سے انکار کر دیا (مرقس ۳ : ۲۱، ۳۱ - ۳۵)۔ مسیح خداوند نے دیکھا کہ اُس کی خدمت کے نتیجہ میں خاندانوں میں جدائیاں ہو رہی تھیں (مرقس ۱۰ : ۳۵)۔ حالانکہ اُس کا ارادتاً یہ مقصد نہیں تھا جیسا کہ بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مسیحی کو بعض اوقات اِس طرح عمل کرنا ہے جیسے کہ اُسے اپنے خاندان سے نفرت ہے۔ (لوقا ۱۴ : ۲۶)۔ حتیٰ کہ اپنے والد کو دفن کرنے کی عالمگیر اور مسلّمہ ذمہ داری بھی مسیح کی فرمانبرداری میں حائل نہیں ہونی چاہیئے۔

مسیح خداوند نے خاندانی ذمہ داریوں میں یہ خطرہ محسوس کیا کہ یہ خود غرضی کے لئے بہانہ اور حُب الوطنی کی کمی کا باعث بن سکتی ہیں اور اِس خطرہ کو دورِ حاضرہ میں اشتمالی لوگوں نے بھی محسُوس کیا ہے۔ وُہ والدین جو زیادہ خودُ انکاری اور اپنے بچّوں کی پرورش میں حقیقی محبّت دکھاتے ہیں، لازماً وہ خودُ غرضی کا مظاہرہ کریں گے اور ایسے لوگوں کو اپنے خاندان کی بھلائی کے علاوہ دُوسروں کی کچھ فکر نہیں ہو گی۔ موجودہ دور میں اِن دو برائیوں سے خاندانی زندگی میں پریشانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً آج کل کے مختصر گھرانوں نے مشترق کے "متحدہ خاندان" جیسے بڑے کنبوں کی جگہ لے رکھی ہے جہاں گھر کے تمام لوگ ایک ہی عمارت میں رہتے تھے یا مغرب میں اعلیٰ طبقہ کے گھرانوں میں جہاں کہ بہت سے نوکر چاکر ہوتے تھے اور اِس کے علاوہ خاندانی حلقہ سے باہر کے لوگ بھی شامل تھے۔ لیکن آج کل وہاں بھی مختصر گھرانوں کا دستور رائج ہے۔ ایسے بڑے گھرانوں میں ایسی تربیت دی جاتی تھی

جس میں خودغرضی کا سبق نہیں سکھایا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے مختصر گھرانوں میں اس بات کی کمی ہے اور خاندان میں تھوڑے بچے باہمی امداد جیسی خوبیوں سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ زندگی کے لئے ایک لازمی تیاری ہے۔

تاہم یہ موجودہ دور کے تمام خاندانوں کے لئے درست نہیں۔ کیونکہ اس گری ہوئی دنیا میں خاندانی تعلقات ایثار کے جذبہ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایثار اور خودانکاری کے اس جذبہ کو خاندانی ماحول سے باہر بھی دوسرے لوگوں سے ظاہر کرنا چاہیئے، جیسے کہ مقدّس پولُس بیان کرتا ہے کہ ہر ایک انسانی خاندان اُس باپ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے آسمان اور زمین کا ہر ایک خاندان نامزد ہے (افسیوں ۳: ۱۴-۱۵)۔
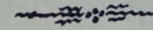


## تیرھواں باب

# مسیحی اور معاشرہ

### ۱۔ قوم یا بقیّہ

عہدِ عتیق کے ابتدائی حصّوں میں بنی اسرائیل کا مذہب ساری قوم کا مذہب تھا۔ اور کافی حد تک ایک مشترکہ مذہب کے باعث بنی اسرائیل کے قبائل میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یسعیاہ کے زمانے سے (۷۰۰ ق م) اور اس کے بعد میں ایک وفادار اقلیّت کا تصوّر ملتا ہے۔ جسے ماہرینِ علمِ الہیات "بقیہ" کے نام سے پکارتے ہیں جو ایک بُت پرست قوم کے درمیان بھی یہوواہ اسرائیل کے خدا سے وفادار رہی۔ مذہب سے یہ نسبت پوری قوم کے صرف ایک گروہ کا تعلق رہ گیا تھا۔ مسیحی کلیسیا میں تقریباً چوتھی صدی سے دو گروہوں میں کچھ اختلافِ رائے ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ کلیسیا میں تمام قوم شامل ہے۔ اور دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ کلیسیا ایک محدود گروہ ہے۔ جسے خدا نے تمام مسیحی قوم میں سے چُنا ہے۔ ایسے ممالک میں جہاں سوائے مسیحیت کے لوگ کسی اور دوسرے عقیدہ کے قائل نہیں، وہ مسیحیت کو قومی مذہب کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کا کلیسیا کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ یہ عوامی اور قومی ہے، وہ ہمیں ایک غیر واضح طریقہ سے ملک کے تمام

دوسرے شہریوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ایسے ممالک میں چند ایک مُلکی قوانین کو مسیحی اخلاقیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تشکیل دیا گیا ہے۔ (مثلاً شادی سے متعلقہ قوانین (لیکن اب اُن میں کافی حد تک ترمیم کی جاچکی ہے) یا انگلینڈ میں سبّت کی پابندی سے متعلق قوانین وغیرہ جو تقریباً ترک کر دیئے گئے ہیں)۔ قدیم اسلامی ممالک میں شریعت یا قرآنی قوانین مذہبی شریعت ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی ضابطوں اور مُلکی قوانین میں بھی شامل تھے۔ ان میں اب بھی چند ایک ایسے ہیں جو قانونی عدالتوں میں منصفوں کی ہدایت کے لئے قانونی ضابطہ کے طور پر کام دیتے ہیں۔

بعض دُوسروں کا یہ نظریہ ہے کہ کلیسیا ایک اجتماعی معاشرہ ہے جس کے تمام اراکین دیانتداری سے مسیح میں ایک شخصی ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور شعوری طور پر ایک مسیحی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس نظریہ کے مطابق کلیسیا کا قومی زندگی سے اتحاد کرنے سے یقیناً ہم دُنیا دی اخلاقی معیاروں سے سمجھوتا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عمل ایک حقیقی مذہب کے لئے باعثِ زوال ہوگا۔

دونوں "عوامی" اور اجتماعی، کلیسیا مسیحیوں کی تمناؤں کو یعنی عوامی کلیسیا اپنی زندگی کے ہر ایک پہلو میں مسیح کے لئے دنیا کو جیتنے کا اور اجتماعی کلیسیا آسمان میں دفادار کلیسیا کی حمایت کے وعدہ کو پیش کرتی ہیں۔ ایسے ممالک میں جہاں انجیل کی منادی صرف ایک صدی یا اِس سے زیادہ عرصہ ہؤا، کی گئی ہے۔ وہاں نام کے مسیحی بھی گو اقلیّت میں ہیں، تاہم ان کا یہ معاشرہ ملک میں دوسرے مذہبی معاشروں سے مختلف ہوگا۔ لیکن یہ کسی صورت میں پوری قوم کو پیش کرنے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔ اور مغرب کے ایسے ممالک میں جہاں مسیحیت زوال پذیر ہے، وہاں بھی صورتِ حال بہت مختلف نہیں ہے۔ جب کہ اکثر لوگ ایک غیر واضح طریقہ سے اپنے آپ کو مسیحی خیال کرتے ہیں، وہ یوں اپنے آپ کو اعداد و شمار کے رجسٹر میں کرتے ہوئے نمایاں طور سے



دوسرے پڑوسیوں سے جو مذہبی ہیں الگ گرجہ گھر میں عبادت کیلئے باقاعدگی سے جاتے ہیں۔ ان سے مختلف ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی عملی کلیسیا ایک دفادار بقیہ ہے۔ لیکن ایسے اقلیتی گروہوں کا یہ خطرہ ہے کہ مسیحیوں کا خیال اور کوششیں صرف اپنے اس اجتماعی گروہ کی فلاح و بہبود پر مرکوز ہوں گے اور خاص کر اُس وقت جب اُن کا یہ خیال ہو کہ صرف وہی خدا کے چنے ہوئے لوگ ہیں۔ اِسی بات کو بنی اسرائیل نے جلاوطنی کے بعد فراموش کر دیا تھا۔ لیکن خدا کا یہ مقصد ہے کہ اُس نے ہمیں دُنیا میں سے اِس لئے بلایا ہے تاکہ دُنیا کو مسیح کے لئے جیت لیں۔

## ۲۔ مسیحی رفاقت

یہ امتیاز مسیحی اخلاقیات کے ایک طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا کرتا ہے۔ کہ کیا دیگر قوموں یا باقی بنی نوعِ انسان کی نسبت ایک مسیحی کو اپنی قوم کیلئے زیادہ یا مختلف فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ سطحی نظر میں پہاڑی وعظ اور انجیل میں دوسری جگہوں میں جہاں مسیحی اخلاقیات کے بہت سے اخلاقی فرائض ہیں یہ ایک مختلف پہلو نظر آتا ہے کیونکہ عہدِ عتیق میں تو یہ فرائض صرف اپنے بنی اسرائیل بھائیوں تک محدود تھے لیکن یہ فرائض ہر ایک قوم، مذہب اور ہر ایک رنگ کے لوگوں کیلئے ہم مسیحیوں پر عاید ہیں۔ مسیح خداوند نے عہد عتیق کا جو دوسرا سب سے بڑا حکم یعنی اپنے پڑوسی سے محبّت رکھنا پیش کیا ہے اس کی یوں تشریح کی جائے کہ لفظ "پڑوسی" میں ایک حقیر اور نفرت انگیز سامری جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ تاہم کسی حد تک پولُس اور زیادہ تر یوحنا کے خطوط میں اپنے مسیحی بھائیوں سے محبت رکھنے کے لئے ایک خاص نصیحت

ہے۔ لیکن میرا یہ خیال نہیں کہ یہ نمایاں حد بندی لوگوں کی تنگ نظری کے لئے ایک رعایت ہے۔ کیونکہ نہ تو مقدّس پولُس اور نہ ہی مقدّس یوحنا ایسی رعایتوں کے عادی تھے۔ مثال کے طور پر مسیحیوں کا یہ ایک خاص فرض ہے کہ وُہ مقدّسوں کی احتیاجیں رفع کریں۔ اَور مسافر پروری میں لگے رہیں" (رومیوں ۱۲ : ۱۳)۔ اور مقدّس یوحنا یہ کہتا ہے کہ حقیقی مسیحی وُہ ہے جو" اپنے بھائیوں کے واسطے جان دیتا ہے" (۱-یوحنّا ۳ : ۱۶)۔

مقدس پولُس مسیحیوں کے ایک دُوسرے پر خاص فرائض کی ایک عجیب اور نہایت موزوں مثال دیتا ہے جب اُس نے ا۔کرنتھیوں ۶ : ۱-۶ میں کرنتھی مسیحیوں کو اپنے مقدمے "بیدینوں" کی قانونی عدالتوں میں لے جانے کے لئے ملامت کی۔ درحقیقت وہ یہاں پر ان عدالتوں کے اختیار و انصاف پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ اُس کا اس بات پر زور ہے کہ ایسے جھگڑوں کا مسیحی معاشرہ میں فیصلہ ہونا چاہیئے۔ اَور اس کی ہمارے خداوند کی تعلیم سے بھی تصدیق ہوتی ہے (متی ۱۸ : ۱۵-۱۷)۔ اپنے ایک مسیحی بھائی کو عدالت میں لے جانے کی بجائے ظلم برداشت کرنا اَور نقصان قبول کر لینا بہتر ہے۔ موجودہ دور میں بھی ضرور ایسے مواقع ہونگے جب کہ یہ ضرورت ہوگی کہ دو مسیحی ایک پیچیدہ مسئلہ کو قانونی عدالت میں لے جائیں لیکن یہ بالکل دوستانہ تعلقات میں ہو نہ کہ دونوں ایک دُوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے یہ قدم اٹھائیں۔ لیکن پھر مقدّس پولُس اِسے ایک الجھن تصوّر کرے گا۔ کہ کیا مسیحیوں میں کوئی بھی اُن کا ثالث نہیں ہے۔ آج کل لوگ کلیسیاؤں کے لئے یہ ایک المیہ ہے کہ وُہ نہ صرف اپنے مسیحی بھائیوں کے خلاف عدالت



میں مقدمہ دائر کرتے ہیں بلکہ وُہ کلیسیاء جیسے منظم ادارہ کے خلاف بھی ایسا قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ یقیناً یہ مقدمہ بازی مسیح کے بدن کے خلاف کفر بکنے کے مترادف ہے اور اِس طرح سے اُس کے نام کی تکفیر ہوتی ہے۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ یروشلیم کی ابتدائی کلیسیا میں کِس طرح مسیحی رفاقت کی کوشش کی گئی تھی کہ سب اپنی چیزیں مشترکہ طور پر رکھتے تھے۔ لیکن عدمِ اِعتماد کے باعث یہ ناکام ہو گئی۔ اور بعدازاں بھی مختلف گروہوں میں یہ کوشش کی گئی۔ لیکن عموماً طرفداری کے سبب سے بہت تھوڑے عرصہ تک رہی۔ آج کل بھی مسیحیوں میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ وہ اِس موضوع پر نئے نئے تجربات کرتے رہیں تاہم مقدّس پولس کے اِس حکم کہ" مقدسّوں کی احتیاجیں رفع کرو" کی مسلسل تابعداری کی جاتی رہی ہے۔ مسیحیوں نے نہ صرف اِس فرض کو محسوس کیا ہے کہ وُہ معاشرہ میں غریب مسیحیوں پر خاص مہربانی کریں بلکہ امیر کلیسیاؤں نے بھی اِس فرض کو شدّت سے محسوس کیا اَور سمجھا ہے کہ وُہ مالی حالت کے لحاظ سے کمزور کلیسیاؤں کی مدد کریں خواہ وُہ روحانی لحاظ سے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ مسیحی خدمت کا موجودہ سالوں میں طریقۂ کار "بین الکلیسیائی" امداد کو ایک اہم مقام دیتا ہے۔ یعنی مغربی ممالک کی امیر کلیسیائیں افریقہ اَور مشرق کی غریب کلیسیاؤں کو مالی امداد دیتی ہیں۔ تاکہ وہ اپنے کام کو اپنے طریقوں سے ترقی دے سکیں۔ ایسے مسیحی جو دوسری کلیسیاؤں کو مالی امداد دے رہی ہیں۔ وُہ یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ جن کلیسیاؤں کی وُہ مدد کر رہے ہیں۔ وُہ اُن کی اپنی دعاؤں اور روحانی نعمتوں سے مدد کریں۔

مسیحی تصوّر میں رُوسی مفکرین کا یہ حصّہ ہے کہ وُہ "سابرناسٹ"

پر زور دیتے ہیں۔ جو پہلا سے اُردو لفظ "عالمگیری" کا ہم معنی ہے۔ اور جو اِن معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ ایک ایسی رُوح سے کام کرنا جس میں سب باہم مِل کر کام کرتے ہیں۔ اور جس میں سب حِصّہ دار ہیں۔ مسیحی کلیسیا کے اچھّے کلام بے دینوں کے اچھّے کاموں سے اکثر اِس رُوح کے تحت متفرق ہوتے ہیں کہ ہر ایک مسیحی کو اپنی معذوری کا احساس ہے اور بغیر احساسِ کمتری یا احساسِ برتری اور نکتہ چینی کے دوسروں کی خدمت اور بھلائی کے مواقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ یہی نمونہ مقدّس پولس نے پیش کیا کہ مسیح کے بدن یعنی اُس کی کلیسیا میں تمام افراد ایک دوسرے کی بھلائی اور بہتری کے لئے کام کرتے ہیں (۱۔ کرنتھیوں ۱۲ : ۱۲-۲۰)۔

ہم اِس سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیحیوں کا ایک خاص فرض یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی کلیسیا اور فرقہ کے لوگوں کی مدد کریں بلکہ مسیح کی کلیسیا کے ہر ایک فرقہ کے لئے اُن کا فرض ہے کہ وہ اُن سے ہمدردی اور وفاداری کا ثبوت دیں۔ یہ وفاداری ایسی ہی پر محبت سمجھ بوجھ کا تقاضا کرتی ہے جو ہم بہت سے بہترین خاندانوں میں پاتے ہیں۔ گو ہمارے اُن کے لئے اپنے بہن بھائیوں جیسے تصوّرات تو نہیں ہوتے۔ لیکن پھر بھی ہم اُن کے مختلف خیالات کو سمجھنے کی ضرور حقیقی کوشش کرتے ہیں۔ اور آج کل یہ کوشش تمام مسیحی دنیا میں جاری ہے اور وہ لوگ جو اس میں شریک ہیں۔ وہ یہ معلوم کر کے متعجّب ہیں کہ اپنی مختلف روایات سے دوسری کلیسیاؤں کے مختلف کلیسیاؤں کے دستورات کو کہاں تک سراہ سکتے ہیں اور اُن سے کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ تمام کلیسیا میں سب مسیحیوں کی بھلائی کے لئے اُن سے سروکار رکھنا آج کل ہم پر ایک اور ضروری فرض ہے۔ غدار قسم کے مسیحی اکثر



اپنے دوسرے مسیحی بھائیوں کو بدنام کرتے ہیں۔ اور خاص کر خادمانِ دین کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے خاندان کے بارے میں کہنا بے وفائی کے مترادف خیال کریں گے۔ یقیناً یہ ایک اچھا موقع ہوگا۔ اگر کسی بھائی یا کلیسیا کے راہنما پر اس کی غلطی واضح کی جائے۔ اور دوسری طرف کسی بھی مسیحی کو ایسی صاف گوئی سے خفا نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی مسیحی کسی دوسرے مسیحی یا کلیسیا کے کسی دوسرے فرقہ کے خلاف کسی قسم کا زہر اگلے کیونکہ یہ حربہ مسیح کی تدبیرِ کل کے لئے بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوگا۔

## ۴۔ شمول اور علیحدگی

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلیسیا سے باہر مسیحی معاشرہ کا کیا روّیہ ہونا چاہیئے؟ بائبل کی تعلیم کا کافی سے زیادہ حِصّہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کلیسیا کو دُنیا سے علیحدگی اختیار کرنا ہے۔ مقدّس یُوحنّا کا یہ نظریہ ہے کہ جبکہ تمام دنیا بدی کے پنجوں میں ہے تو مسیحی معاشرہ خُدا کی وراثت ہے (۱۔ یُوحنّا ۵ : ۱۹)۔ اور مقدّس یعقوب کہتا ہے کہ مذہب کا نصف یہ ہے کہ مسیحی اپنے آپ کو دُنیا کی نجاست سے دور رکھے (یعقوب ۱ : ۲۱) مذہب کے اِس پہلو کا تو منطقیانہ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اِس سے راہب خانہ کی محدود زندگی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جہاں راہبان اور راہبات اپنے آپ کو دُنیاوی زندگی سے دُور رکھتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسے لوگ اِن اخلاقی پابندیوں کو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے عمل میں لاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "یہ دُنیا مسیحیوں کی

شفاعت کی بدولت قائم ہے"۔ اِس خاص بلاہٹ کے بغیر لوگوں
کے لئے یہ مسئلہ ہے کہ کس طرح اِس دُنیا میں رہتے ہوئے اُس
بُرائی سے دُور رہنا ہے جو اُس خراب جہان میں پائی جاتی ہے۔
یہ انسانی حالت کا ایک پہلو ہے جو مسیحیوں کے لئے اِس امر کو
اہم قرار دیتا ہے کہ وُہ پاکیزگی اور دیانتداری جیسی چیزوں کے
معین اخلاقی معیار کو قائم رکھیں۔ ایک عام ہمدردی جس کی آج کل
اخلاقیات کی اِس تعلیم سے حمایت کی جاتی ہے کہ "محبت رکھو اور
جو چاہو کرو"۔ یقیناً دُنیا کے آسان معیاروں سے مطابقت پیدا
کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں پر مسیحی احباب کی رفاقت مشکل
حالات میں اُن کی صلاح کاری۔ اور اُن کا ایمان ہماری
سالمیت کے لئے آزمائشوں کے وقت بہت زیادہ مدد کا باعث
بن سکتی ہے۔ لیکن باقاعدگی سے ایسے مذہبی فرائض مثلاً دُعا، مطالعہ
بائبل جماعتی عبادت اور ساکرامنٹوں میں شریک ہونا اِس سے
بھی ضروری ہیں۔ یاد رہے کہ مسیحی لوگ اِن کاموں کو اپنے آپ
کو نیک بنانے کے لئے نہیں کرتے، گو بعض مبشروں کی یہ رائے
ہے جو عملی زندگی پر زور دیتے ہیں۔ تاہم ایسے مذہبی عمل جو انہیں اپناتے
ہیں، غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وُہ
دُنیاوی لوگوں کی نسبت، غیر مذہبی دُنیا کے کاموں کو ایک
مختلف رُوح میں جاری رکھتے ہیں۔ بہُت کم لوگ بھائی لارنس
کی اُس رُوحانی خوبی سے مستفید ہو سکتے ہیں جیسے خریدتے وقت
یا اسباب خانہ کے باورچی خانہ میں کھانا پکاتے وقت بھی خُدا کی
موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن بہُت سے لوگوں کو جو اپنے
فرائض کو باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ اپنی زندگی اور کاروبار



میں مسیح کے فضل کا احساس ہوتا ہے۔
مقدّس پولُس نے جو ہمیشہ عملی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے"،
یہ محسوس کیا کہ کچھ ایسی قسم کے تعلقات بھی ہیں جن میں بیدینوں
سے کسی طرح کی صحبت نہیں رکھنی چاہیئے۔ اُس کے اِس مشورہ
کہ "بے ایمانوں کے ساتھ ناہموار جُوئے میں نہ جُتو"۔ (۲۔ کرنتھیوں
۶ : ۱۴) کا خواہ براہِ راست غیر مسیحیوں سے شادی کرنے کا
تعلق ہو، خواہ نہ ہو۔ تاہم ایسی شادی یقیناً بائبل کی تعلیم کے متضاد
ہے۔ اِس سلسلہ میں عہدِ عتیق میں ایک زبردست دلیل پیش کی گئی ہے
کہ کس طرح اسرائیل کے بہت سے بادشاہوں اور بعد میں
شمالی سلطنت کے بہُت سے جلا وطنوں کو اُن کی غیر قوم بیویوں
نے ان کے حقیقی مذہب سے بہکا دیا۔ اور ہم وثوق سے کہہ
سکتے ہیں کہ اِس قسم کی باتیں آج کل بھی معرضِ وجود میں آتی ہیں۔
شاید ہم اُس مسیحی عورت کے اعتماد کی تعریف کریں جو ایک
بیدین شخص سے اِس اُمید میں شادی کرتی ہے۔ کہ وہ اسے مسیح
کیلئے جیت لے لیکن مسیحی تجربہ کی شہادت اس کی کامیابی کے
خلاف ہے۔ ایسے معاملات میں ہمیں غور کرنا ہے کہ اُن بچوں
کی تربیت کیسی ہو گی۔ جن کے والدین ایماندار نہیں ہیں۔ یقیناً کوئی
ایسی اُمید نہیں کہ وہ مسیح کی کامل وفاداری سیکھ سکیں۔
مقدّس پولُس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ عملی طور پر ناممکن
ہے کہ ہم دُنیا میں رہیں بھی اور بُرے لوگوں سے کسی قسم کا تعلق
بھی نہ رکھیں۔ (۱۔ کرنتھیوں ۵ : ۹-۱۰)۔ حتیٰ کہ وُہ یہاں تک کہہ دیتا
ہے کہ ہم اُن کی جو کلیسیا سے باہر ہیں عدالت نہ کریں بلکہ اُنہیں
خُدا کی عدالت اور اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ بر طرف

دیگر اُس کا یہ بھی نظریہ ہے کہ مسیحیوں کا یہ فرض ہے کہ کلیسیا میں نظم و ضبط قائم رکھیں خواہ انہیں بداخلاق لوگوں کو کلیسیا سے خارج ہی کیوں نہ کر دینا پڑے۔ لیکن یہ سب کچھ علم اور محبت کی روح میں کیا جائے۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ شاید اُن خوبیوں کے عنقا سے ہم آج کل ایسی سزائیں عائد کرنے میں تامل کرتے ہیں یا اس معاملہ میں ہمارے پاس دنیا سے برتاؤ اور کلیسیا کے لوگوں سے برتاؤ کیلئے الگ الگ معیار ہونے چاہئیں۔

آج کل خاص کر جرمن ماہرینِ علم الٰہیات اور شہید بانہوئیفر کی تعلیم کے زیر اثر یہ سکھایا جاتا ہے کہ مسیحیوں کا یہ فرض ہے کہ وُہ دُنیا کے پیچیدہ اور غیر مذہبی معاملات میں شریک ہوں۔ اِس کا صرف یہی مطلب نہیں کہ مسیحیوں کو اپنے بیدین بھائیوں کی سرگرمیوں میں حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ مثلاً "وار آن وانٹ" اور "سیو دی چلڈرن" جیسی تنظیمیں گو مسیح خداوند کے نام سے تو موسوم نہیں کی گئی ہیں تاہم مسیح کی روح میں چلائی جا رہی ہیں اور نہ ہی اِس کا صرف یہ مطلب ہے کہ ایک مسیحی پورے طور پر بحیثیت ایک شہری کے اپنی ذمہ داریوں کو سر انجام دے جن کا ہم اگلے باب میں تذکرہ کریں گے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ "خدا نے دُنیا سے ایسی محبّت رکھی" (اور یوحنا نے یہاں جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ اکثر اُس دُنیا کے لئے استعمال کرتا ہے جو خدا سے علیحدہ ہے)۔ اور اِسی طرح مسیحیوں کو بھی چاہیئے کہ وہ دُنیا سے محبّت رکھیں جیسے کہ مسیح خداوند عین دُنیا کی زندگی میں آیا اور گنہگاروں کے لئے مُوا۔ اِسی طرح مسیحیوں کو بھی چاہیئے کہ وہ دنیا کی غیر مذہبی زندگی میں آئیں اور بنی نوع انسان کیلئے جان دینے تک تیار رہیں۔ اِس کا یہ بھی مطلب ہے کہ ہم دُنیا کے گناہ کو اپنا گناہ سمجھیں جیسے مسیح یسوع



جو گناہ سے واقف نہ تھا۔ وُہ ہمارے واسطے گناہ ٹھہرایا گیا (۲۔کرنتھیوں ۵: ۲۱)۔ خواہ اِسکا اور کوئی مطلب کیوں نہ ہو لیکن یقیناً اسکا یہ مطلب ہے کہ دُنیا کے گناہ میں ہم شریک ہیں۔ اور یہ اُس دکھ میں شرکت کی رضا مندی پر دلالت کرتا ہے جو دُنیا کے گناہ کا نتیجہ ہے۔

اِس تعلیم کی روشنی میں لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ موجودہ دور میں کلیسیا کو چاہیئے کہ کلیسیائی حدود میں اپنی اخلاقی ذمہ داریوں اور فرائض کو نظر انداز کرتے ہوئے خدمت کے لئے تمام دُنیا سے تعلق پیدا کریں۔ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ کلیسیا دعوتی شراکت یا خدمت میں عورت کے مقام جیسی باتوں کے علاوہ قید کی اصطلاحات یا "بھوک سے نجات" جیسی تحریکوں پر زور دے۔

ہم کرنتھیوں کے پہلے خط میں دیکھ چکے ہیں کہ کلیسیا کو اپنے افراد کے درست رویّہ اور خوشگوار تعلقات کے حصول کے لئے توجہ دینا پڑی کیونکہ کرنتھس کے مسیحیوں کی مقدّس ہونے کے لئے بلاہٹ ہوئی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ جس سے ہمیشہ کلیسیاؤں کی زندگی برباد ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اُن کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر لازمی تھی۔ تاہم میرا ایمان ہے کہ بانہوئیفر اور دوسرے لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ دور میں مسیحیوں کا یہ فرضِ اولین ہے کہ کلیسیا سے باہر کی دُنیا میں شریک ہوں۔ اور واقعی یہ بہت سے خادمانِ دین اور کلیساؤں کی روحانی نجات کا ایک حصّہ ہوگا اگر وُہ کچھ وقت کے لئے اپنی کلیسیائی حاضری، ہدیوں اور تنظیموں کو بھول

جائیں تاکہ وہ ایک وسیع معاشرہ میں پورے دل سے خدمت
کر سکیں۔خواہ یہ اپنے گاؤں میں حفظانِ صحت کے اصولوں
کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کے لئے کام کرنے سے
خواہ کسی اور ملک میں قحط زدہ لوگوں کو بحال کرنے اور
اُن کی خدمت کرنے سے یہ خدمت ہو، تاہم کلیسیا میں دُرست
توازن کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ایک عارضی تدبیر ہو گی۔
اِس سلسلہ میں کلیسیا کو اِن دو پہلوؤں کا خیال رکھنا ہو گا۔یعنی
اپنی عبادتی رفاقت میں تمام افراد مسیح میں اپنے میل ملاپ
اور محبت اور دُنیا کی خدمت کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن بعض
اوقات ایسے مواقع بھی ہیں جب اِن میں سے کسی ایک پر
زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔اور ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں پہلو ایک
ایک دُوسرے کی تقویت کے لئے ہوں کیونکہ ہماری کلیسیائی
رفاقت اور عبادت جتنی زیادہ حقیقی ہو گی۔ اُتنی ہی باہر دُنیا
میں ہماری خدمت اور گواہی مؤثر ہو گی۔لیکن افسوس کا مقام
ہے کہ ہم اپنی خود غرضی کے تحت مسیح خداوند کو صرف اپنے
مسیحی معاشرہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ اُس نے
تو ہمیں اس مقصد کے لئے بلایا ہے کہ ہم تمام دُنیا میں اُسکی
گواہی کی مہم میں شریک ہوں۔

دُنیا میں مسیحی معاشرہ کی خدمت کا ایک یہ بھی حصّہ
ہے کہ وہ مسیح یسوع اور انجیل کی تمام لوگوں میں منادی
کرے۔کیونکہ کلیسیائی زندگی کے یہ دونوں پہلو ایک دُوسرے
کے بہت قریب ہیں۔ یسوع نے کہا "اگر آپس میں محبّت
رکھو گے تو اِس سے سب جانیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو۔"



(یوحنا ۱۳: ۳۵)۔ مسیحی ایمان کے ایسے بھی نو مرید ہیں جو
مُنادی سنتے یا خدا کا کلام پڑھنے سے مسیحیت میں داخل
ہوتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو ہسپتالوں اور دُوسری جگہوں
میں مسیحیوں کی خدمت سے متاثر ہو کر مسیح پر ایمان لاتے
ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مسیحیوں کی محبت اور
رفاقت کو دیکھ کر مسیح کو قبول کیا ہے۔لیکن آج کل مسیحی
کلیسیاؤں اور مسیحی راہنماؤں کی آپس میں کشمکش، ذاتی عناد
اور جھگڑوں سے دُنیا عملی انجیل کو دیکھنے سے قاصر ہے۔اور اگر
وُہ دیکھیں نہ تو وہ کس طرح ایمان لائیں گے۔

## ۴۔خاندان، کلیسیا اور معاشرہ

یہ بالکل اتفاقیہ امر نہیں کہ ہم نے مسیحی معاشرہ کے لئے اپنی
ذمہ داریوں اور خاص کر خاندان اور ریاست کے مابین تعلقات
پر غور کیا ہے بلکہ یہ تو ایک عام بات ہے کہ مسیحی کلیسیاؤں
میں ایک ایسی ہی محبت، ضبط اور باہمی خدمت ہو جو ہم ایک
مسیحی خاندان میں دیکھتے ہیں۔ جیسے کہ باپ ایک گھرانے کا
پاسبان ہے۔اِسی طرح پاسبان کو اپنی کلیسیا کا باپ ہونا چاہیئے
اور بعینہٖ کلیسیائی زندگی کو ساری قوم کے لئے ایک نمونہ
کے طور پر ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جن کا معیار کسی مسیحی مُلک
میں قومی کلیسیا ہے کم از کم اپنے لئے یہ کہنے میں حق بجانب
ہیں کہ وہ ایک ایسی تصویر پیش کر رہے ہیں کہ اُن کی قوم کو کلیسیا
ہونا چاہیئے اور وہ اس وقت کیسی ہو گی۔جب اِس دُنیا کی
بادشاہی" ہمارے خداوند اور اُس کے مسیح کی ہو گی" (مکاشفہ ۱۱: ۱۵)۔

لیکن اُن کا یہ نظریہ کہ ایسے حالات حال ہی میں وقوع پذیر ہیں۔ بالکل غیر حقیقی ہے۔ کسی بھی مُلک میں مسیحی معاشرہ خواہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ تاہم وہ اپنی محدود زندگی میں ایک دوسرے کی بے غرض خدمت، اپنے اختلافات کو بغیر تشدّد اور تلخی کے نپٹانے اور سارے معاشرہ کی زندگی کے لئے باہم تخلیقی کام کرنے سے بنی نوع انسان کی خدمت کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتا ہے۔

رومی حکومت میں کلیسیا پر یہ افتاد پڑی کہ اُس نے اپنی زندگی اور زندگی کے نظام کو غیر مذہبی مملکت کی زندگی اور نظام میں ڈھال لیا۔ اور اس کا بنیادی اثر یہ تھا کہ کلیسیائی عدالتوں کا قانونی عدالتوں سے اور اِس کے بشپوں کا عام نوابوں سے تھوڑا ہی فرق رہ گیا۔ بیشک ایسی امید کا امکان ہے کہ موجودہ ریاست مستقبل قریب میں اس عمل کے متضاد اپنے آپ کو کلیسیائی حقیقی زندگی میں ڈھال لے گی۔ تاہم اگر دنیاوی لوگ یہ دیکھیں کہ مسیحی ایک دوسرے سے کیسے محبت رکھتے ہیں اور اُن کی زندگی دوسروں کی نسبت کس قدر مسرور اور بہتر ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اپنے تمام نظاموں کو کلیسیا کی زندگی کی تقلید میں ڈھالنا شروع کر دینگے۔ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں کہ بعض ممالک میں نوجوان مجرموں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے کہ بنیادی طور پر حکاّم کا جرائم کی سزا یا انسداد سے تعلق نہیں۔ بلکہ وہ پاسبانی رُوح میں نوجوان مجرموں کے مستقبل کی اصلاح اور بھلائی کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہت سے ممالک میں معاشرتی خدمت کی ترقی مثلاً عمر رسیدہ لوگوں اور غریبوں کی مدد کرنا جو کہ عرصۂ دراز تک کلیسیا کا کام رہا ہے۔ اسے اب ریاست نے سنبھال لیا ہے۔ چاہے ریاست کلیسیا سے



کتنی بھی مختلف کیوں نہ ہو۔ اور وہ بہت سے کاموں میں بہت مختلف ہے۔ تاہم اُس نے ایک مسیحی معاشرہ سے جو حقیقت میں اپنے خداوند اور مالک کی رُوح کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ کافی کچھ سیکھا اور مزید کچھ سیکھ سکتی ہے۔

## چودھواں باب

# مسیحی اور ریاست

### ۱۔ ریاست اور خُدا کی بادشاہت

قدیم اور جدید دور میں انسان اس خیال میں محو رہا ہے کہ سیاسی بلکہ فوجی ذرائع سے زمین پر وُہ آسمان کی بادشاہت "قائم کر سکتا ہے۔ دینِ انسانی کے پیروکاروں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اپنی کوشش اور عقل سے یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ لیکن مذہبی لوگ یہ جانتے ہیں کہ آسمان کی بادشاہت کو قائم کرنے کے لئے انہیں خُدا کی قوّت و راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اِسی قسم کی رویا یسعیاہ اور دُوسرے انبیاء کی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یروشلیم کو عالمگیر امن اور عدل کے لئے تمام دُنیا کے واسطے ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی (مثلاً یسعیاہ ۲ : ۲-۴)۔ مکابیوں کے اولین ایام میں بہت سے مکابیوں کا ضرور یہ اعتقاد ہو گا کہ وُہ اِس نئی بادشاہت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اُن کے جانشینوں کے کردار اور حکمتِ عملی سے اُن کا یہ سحر ٹوٹ گیا۔ ہمارے خُداوند کے زمانے میں زیلوتیسی لوگوں (لُوقا ۶ : ۱۵) کا ایک ایسا



گروہ تھا جو اپنے معین پروگرام کے مطابق اِس نئی بادشاہت کو سیاسی اور فوجی ذرائع سے قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ اُن کے ذہن میں اِس کے لیئے بالکل وہی ذرائع تھے جن سے عموماً دنیاوی بادشاہتیں قائم کی جاتی ہیں۔ یہ زیلوتیسی پہلی صدی عیسوی سے ہی بہت سرگرم تھے اور یہی وُہ گروہ تھا جو خاص رومی حکومت کے خلاف یہودی انقلاب کا ذمہ دار تھا۔ جس کے نتیجہ میں یروشلیم ۷۰ عیسوی میں برباد کیا گیا۔ ہمارے خداوند کا اپنا ایک شاگرد زیلوتیسی تھا اور اِس سے خود مسیح یسُوع اپنے دُشمنوں اور خاص کر رُومی حکومت کی نگاہوں میں زیلوتیسی تھا۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کی کتاب میں گملی ایل (۵ : ۳۶-۳۷) اور رومی حاکم کلودیُس لُوسیّاس (۲۱ : ۳۸) نے مسیحی تحریک کو زیلوتیسی بغاوت جیسا خیال کیا تھا۔ مسیح خداوند کے خلاف ایک ایسا الزام تھا جو کہ عموماً ایک زیلوتیسی کے خلاف مخبر پیش کرتے ہیں۔ (لُوقا ۲۳ : ۲) حالانکہ پلاطُس جانتا تھا کہ مسیح یسُوع زیلوتیسی نہیں تھا۔ اور صلیب پر لکھے ہوئے کتبہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یسُوع کو خصوصاً اِس جُرم کے باعث صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ یعنی اِن الفاظ "یہودیوں کا بادشاہ" سے زیلوتیسی جُرم کا تاثر جھلکتا تھا۔

خُود مسیح خداوند نے یہ تسلیم نہ کیا کہ اُس کی بادشاہت سیاسی مملکت جیسی ہے۔ اُس کی آزمائشوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ زیلوتیسیوں کے اِس خواب کا کہ آزاد یہودی مملکت سے بالآخر تمام دُنیا پر قبضہ حاصل ہو جائے گا، گرویدہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ سیاسی لوگوں کے اقتدار کی آرزو کے لئے آزمائشوں میں یہ

عام طریقے تھے۔ مثلاً مالی فائدہ کا وعدہ (پتھروں کو روٹیاں بنانا) ظاہری نمود اور خدا کی موعودہ بادشاہت کو قائم کرنے کے لئے شیطان کے یہ اپنے ذرائع تھے۔ یہی آزمائش بعد ازاں گتسمنی میں بھی آسکتی تھی۔ جب کہ یسوع کو یاد تھا کہ کھجور کے اتوار پر ہجوم نے کس قدر جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اور ہیکل میں غیر قوموں کے احاطہ میں کبوتر فروشوں کے تختے الٹنے سے اُسے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اور جب کہ اُس کے بعض شاگرد پہلے ہی سے مسلح تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ کہے تو اُس کا باپ بارہ تمن سے زیادہ فرشتوں کو بھیج سکتا تھا۔ (متی ۲۶ : ۵۳)۔ لیکن یسوع کو اس بات کا علم تھا کہ اُس کی بادشاہی اِس دُنیا کی نہیں تھی اور اِسے سیاسی بغاوتوں کی طرح جنگ سے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اِس حقیقت کو اُس نے اپنی گرفتاری اور پیشی میں پلاطس پر ظاہر کیا (یوحنا ۱۸: ۳۳-۳۸)۔ اس کی بادشاہت کا تو یہ مقصد تھا کہ وہ دُنیا کے سامنے سچائی اور گواہی کو پیش کرے۔ ہم بعد میں اِس پر غور کریں گے کہ دُنیاوی مملکتوں سے تعلقات میں کلیسیا کا آج بھی ایک اہم کام ہے۔

مقدس پولس اور دیگر لوگوں کی اس تعلیم نے کہ کلیسیا حقیقی اسرائیل ہے، اِس بات کا امکان پیدا کر دیا کہ جونہی کلیسیا نے کچھ دولت واقتدار حاصل کیا۔ وہ اپنے آپ کو پرانے اسرائیل جیسی ایک دُنیاوی مملکت تصوّر کرنے لگی۔ خاص کر رومن کاتھولیک کلیسیا نے نمایاں طور سے مقدس رُومی حکومت کے ایام میں بلکہ کسی حد تک موجودہ نظام میں بھی عام مملکت کے بہت سے دستوروں کو



قائم رکھا ہے۔ جو اِس امر کو پیش کرتے ہیں کہ اُس کی بلاہٹ کا ایک یہ حصہ بھی تھا کہ وہ عارضی قوت کو عمل میں لائیں۔ پروٹسٹنٹ کلیسیاؤں میں آج کل معاشرتی انجیل، اقوام متحدہ اور اچھے پڑوسی کے تعلقات کے تحت ریاست پھر سے خدا کی بادشاہی اور سیاسی تنظیم کے درمیان پرانی انجمن کو از سرِ نو رائج کرنے کے رجحانات میں ہے۔ بعض لوگ اِس بادشاہت کو عالمگیر فلاح وبہبود کی ایک عالمگیر ریاست خیال کرتے ہیں۔

ایک مسیحی کو ریاست کے کاموں اور اپنی ذمہ داریوں کو سنجیدگی سے نبھاتے ہوئے بھی ریاست کی پابندیوں کا بہت زیادہ احساس ہونا چاہیئے۔ عہدِ جدید کے عقیدۂ علم الآخرہ کی تعلیم بالکل واضح کر دیتی ہے کہ دنیاوی ریاست بالکل عارضی ہے اور اس کو ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ جیسے کہ مقدس پولس نے فلپی کی رومی بستی کے شہریوں کو یاد دلایا (فلپیوں ۳: ۲۰) ہمارا وطن آسمان پر ہے اور صرف آسمان پر ہم ایک ایسی مملکت کے شہری ہوں گے۔ جس سے ہم پورے دل سے ایک زبلوتیسی کی سی وفاداری اور جانثاری کا اظہار کر سکیں گے۔ یاد رہے کہ ایک مسیحی" ایک اور ریاست کا شہری ہے اور صرف وہاں سے وہ اپنی سوچ و بچار، عدل و انصاف اور احساس کا انداز حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گو وہ اِس دُنیا میں ہے لیکن اس کے تعلقات کہیں اور ہیں، یعنی اِس کی سوچ و بچار، سچائی اور وفاداری کے رابطہ کا انحصار خداوند پر ہے اور دُنیا سے وہ کسی قسم کی بھی اطاعت کا مفروض نہیں ہے۔ ہم یہ جانتے

ہیں۔ کہ ایک مسیحی کی کچھ سیاسی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ لیکن یہ بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی پارٹی کا پورے دل سے حامی ہو۔ چونکہ اس کی اصل شہریت تو ایک اور ملک کی ہے۔ اس لئے اُسے ہمیشہ ایک معین آزادئ رائے کا احساس ہوگا۔ جس کے تحت وہ بہترین سیاسی پروگرام کی تصدیق کرتے ہوئے بھی ان میں ترمیم کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ اسے اس بات کا بھی شعور ہوگا۔ کہ سیاسی اقدامات کا ماحصل بہت کم ہے اس لئے نہ تو پارلیمنٹ اور نہ ہی زیلو تنسیوں کا انقلاب انسان کو نیک بنا سکتا ہے۔ وہ اس سے بھی باخبر ہوگا کہ چونکہ سب انسان گنہگار ہیں۔ اس لئے مدبّروں کے مقاصد خواہ وہ کتنے ہی روشن خیال کیوں نہ ہوں۔ ہمیشہ خود غرضی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ کسی بھی حکومت کو زیادہ اختیارات دینے سے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

## ۲۔ ریاست اِس دُنیا کی بُرائی کے لازمی نتیجہ کی حیثیت سے،

عہد عتیق اپنے کافی حصّوں میں اُس قسم کی مملکتوں کا جن سے ہم واقف ہیں زیادہ واضح بیان پیش کرتا ہے۔ بعض اوقات تو ریاست کو ایک برائی اور کسی حد تک لازمی برائی کے طور پر خیال کیا گیا ہے۔ ساؤل کے تخت پر سرفرازی کے ایک بیان میں سموئیل جس نے دوسری روایات میں بنی اسرائیل کی سیاسی اہمیت کو تسلیم کیا کہ بادشاہ اپنے قبیلوں کی فلسطیوں کے خلاف راہنمائی کرے۔ یہ پیش کیا ہے کہ ظلم و تشدد کا دوسری قوموں کے



بادشاہوں کی طرح اسرائیلی بادشاہ کے عہد میں بھی ہونا کسی حد تک ایک لازمی امر ہے (۱۔سموئیل ۸: ۱۰۔ ۱۷) ہم دیکھتے ہیں کہ زمانۂ بعد کے انبیاء نے اپنے اور ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کے بُرے کاموں کی اعلانیہ مذمت کی۔ خاص کر حاکموں اور قاضیوں کی جو غریبوں کو دباتے اور لشکروں کے خداوند کی تحقیر کرتے ہیں۔ انبیاء نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ وہ الٰہی عدالت کے تحت ہیں۔ اِس نظریہ کے مطابق ریاست گرے ہوئے انسان کی وراثت ہے اور اِس کے منطقیانہ نتیجہ میں اشتمالیوں کی یہ خواہش ہوگی کہ "ریاست کو ختم کر دیا جائے" اور اس کی جگہ اشتمالی نظام قائم کیا جائے۔ اُن کا یہ مطلب نہیں کہ نئے نظام میں کوئی تنظیم اور نہ کوئی مجوزہ پیداوار ہوگی بلکہ اِس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی جبر و تشدّد اور نہ ہی پولیس ہوگی۔ ٹالسٹائی اور گاندھی کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی تعلیم کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے لیکن مجموعی طور پہ بائیبل میں اشتمالیت کی نسبت ریاست کے وجود کا زیادہ احساس ہے۔

زمانۂ بعد کے انبیاء کی یہ بنیادی تعلیم تھی کہ اِس دنیا کے تمام حاکموں پر خُدا کا اختیار ہے۔ اور جیسا کہ وہ اپنے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ وہ اُن کے منصوبوں بلکہ بُرے منصوبوں کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مثلاً یوسف کے بھائیوں نے اُس کے خلاف بدی کا ارادہ کیا لیکن خُدا نے اِس سے بھلائی پیدا کی (پیدائش ۵۰: ۲۰)۔ خُدا نے باغی ساؤل کو فلسطیوں کے خلاف فتوحات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا (۱۔سموئیل ۱۰: ۱) اور یسعیاہ نے محسوس کیا کہ خُدا نے اسور کے بڑے بادشاہ کو اُسترے کے طور پہ لیا تاکہ اپنے اسرائیلی لوگوں کا سر مونڈے (یسعیاہ ۷: ۲۰)۔ عہد عتیق نہایت وضاحت

سے تبلیغ کرتا ہے۔ کہ خدا اپنے انتظام نجات کے لئے جن لوگوں کو آلۂ کار بناتا ہے۔ وہ خود بخود جبر و تشدّد کی طرف مائل ہونگے اور اپنے خدا داد اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے بالآخر اپنی بدکرداریوں کی سزا پائیں گے۔ موجودہ دَور میں مسیحیوں کو اختیار والوں کے جبر و تشدّد کی آزمائشوں کے بارے میں خبردار رہنا چاہیئے اور جب وہ برائی کا مقابلہ کرتے ہیں تو انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ اِس گری ہوئی دُنیا میں قانون اور نظام کے محافظ ہیں۔

## ۳۔ مقدّس پولُس کی تعلیم

مقدّس پولُس نے قدیم انبیاء کے ادراک سے یہ جائزہ لیا لیا کہ اُس کے زمانہ میں رُومی حاکموں کو خُدا اپنے غضب کیلئے آلۂ کار بنا رہا تھا۔ اس سلسلہ میں پولُس کی مرکزی تعلیم رومیوں ۱۳: ۱-۷ میں ہے لیکن پاسبانی خطوط (۱تیمتھیس ۲: ۱-۲، ططس ۳: ۱-۲) اور (۱پطرس ۲: ۱۳-۱۷) کی تعلیم اتنی یکساں ہے کہ ہمیں ضرور یقین کرنا چاہیئے کہ رومیوں کے خط کی مندرجہ بالا سطور میں مسلّمہ رسُولی تعلیم دی گئی ہے۔ ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ کہ مقدّس پولُس بہت کم لیکن غیر مدلّل رجحان کی بنا پر رومی حکومت کی حمایت میں نہ تھا کہ وہ تو رومی شہری ہونے پر ناز کرتا تھا۔ اس کی اپنی طبیعت اور عملی احتیاط اُس کی راہنمائی کر سکتی تھی کہ وُہ بھی مقدّس لوقا کی طرح رُومی حکومت کے رُوشن پہلو پر زور دے۔ ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ وُہ مسیحی جنہیں شروع میں تبلیغی تصوّر کیا گیا، اُن پر یہ شبہ نہ تھا کہ وُہ سیاسی سازشی تھے۔ نیرو ۶۴ء



میں روم کو آگ لگانے کا الزام مسیحیوں کے سر پر نہ تھوپنے کی کوشش نہ کرتا اگر اہلِ روم اِس بات کا یقین کرنے کیلئے تیار نہ ہوتے کہ یہ ایک ایسا فعل تھا جو مسیحیوں سے سرزد ہو سکتا تھا۔ لیکن مقدّس پولُس کو بعد ازاں اپنی تعلیم میں یہ ظاہر کرنا پڑا کہ مسیحیوں کی حالت حقیقتاً کتنی متفرق تھی۔

رومیوں ۱۳ باب میں مقدّس پولُس نے یہ بیان کیا ہے کہ ریاست خُدا کی طرف سے ایک مقرّرہ انتظام ہے۔ شاید یہ انتظام تخلیقِ کائنات کی ابتدائی تجویز میں نہ تھا۔ لیکن یقیناً اِس گری ہوئی دُنیا کی ضرورت کے پیشِ نظر قائم ہُوا۔ ریاست اِس نظام میں خُدا کے غضب کے آلۂ کار کی حیثیت سے ہے۔ یعنی یہ خُدا کا انسان کی بُرائی کے خلاف ردِّ عمل ہے۔ لیکن اِس میں انسانی غِصّہ کی تلوّن مزاجی جیسا عنصر نہیں بلکہ اس میں خُدا کا انسان کے ساتھ شخصی اور پُر ضبط رویّہ ہے۔ اِس گری ہوئی دُنیا میں حکومت کی طرف سے آئین و انتظام خدا کے آئین و انتظام کا اظہار ہیں۔ اِس لفظ "اختیار والے" جو یونانی غیر مذہبی ادب میں تو دنیاوی حکومت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مقدّس پولُس کے خطوط میں لگا ہے یہ روحانی طاقتوں کو پیش کرتا ہے اِس سے یہاں پر غالباً دونوں فوق الفطرت طاقتوں اور دنیاوی بادشاہوں کے معنی اخذ کئے جا سکتے ہیں اور اس سے ہمیں یاد دلایا جاتا ہے کہ حکومتوں کے لئے یہ ایک عام سنجیدہ عنصر ہے۔ چنانچہ جب تک اس کے خلاف کوئی معقول سبب نہ ہو ہم قدرتی طور پر اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ پولُس رسُول کے نظریہ کے مطابق ایک ملحد رومی شہنشاہ بھی اپنے اختیارات، قدرتی وجوہات یا

معاشرتی تعلقات سے نہیں بلکہ براہِ راست خدا سے حاصل کرتا ہے۔ قدیم یہودی استادوں کا بھی یہی نظریہ تھا۔ (حکمت ۶ : ۳)۔

علاوہ ازیں مقدّس پولس نے یہ بھی محسوس کیا کہ رومی حکومتیں واقعی بدکرداریوں کا انسداد کر رہی تھیں۔ سڑکیں ڈاکوؤں سے اور بحری راستے بحری ڈاکوؤں سے محفوظ تھے۔ درحقیقت بعید کی بات اس میں یہ ہے کہ بدترین اور جابر حکومتیں بھی "بُرے کام کرنے والوں کے لئے ڈر اور خوف کا باعث ہیں"۔ نازی جرمنی میں چور اور ڈاکو جو سیاسی وجوہات کی بنا پر قتل نہیں کرتے تھے، انہیں جیلوں میں دھکیل دیا جاتا اور وہ لوگ جو عوام کی حقیقی خدمت کرتے اُن کی تعریف کی جاتی۔ یاد رہے کہ ایک بڑی حکومت کسی حکومت کے نہ ہونے سے کم بُرائی ہے۔ موجودہ دور میں بہت سے ممالک کی حکومتیں مذہبی اور مسیحی ہونے کے دعولے کے بغیر بھی نہایت احسن طریقہ سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہی ہیں لیکن ایسی حکومتیں درحقیقت مسیحی مکاشفہ کو نہیں سمجھ پائیں (۱۔ کرنتھیوں ۲ : ۸) ورنہ وہ جلال کے خداوند کو مصلوب نہ کرتیں۔

۱۔ تمیتھیس ۲ : ۱-۲ میں رُومی حکومتوں کے لئے دُعا کرنے اور خدا کا شکر ادا کرنے کی نصیحت پائی جاتی ہے اور یہ بالکل یہودی رسم کے عین مطابق تھی، اور مسیحیوں کو چاہیئے کہ وہ قیصر کے گھرانے کے رویّہ کو خواہ کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں، وہ ان احکام کے لئے شکر گذار ہوں جو رُومی حکومت کی طرف سے نافذ کئے گئے۔ اختیار والوں کے لئے دُعا کرنا خواہ ہمارا اُن کی حکمت عملیوں سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو، ہمارا مسیحی فرض ہے۔



رومیوں ۱۳ : ۶ میں ریاست کے فرائضِ منصبی کے لئے کچھ پابندیاں تجویز کی گئی ہیں۔ "تم اِس لئے خراج بھی دیتے ہو کہ وہ خدا کے خادم ہیں اور اِس خاص کام میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں"۔ یہ "خاص کام" یونانی کے عام فقرہ میں ٹیکس اکٹھا کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس میں ایسی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے کہ بعض مفسّروں کی طرح اِس سے پہلی آیات میں مذکورہ قانون اور انتظام کے لئے حوالہ دیا جائے۔ حزقی ایل کے خیال کے مطابق فرمانروا یا حاکم کا یہ کام تھا کہ وہ ہیکل کے لئے چندہ اکٹھا کرے۔ (حزقی ایل ۴۶ باب)۔ اور اس میں ٹیکس اور فنڈ اکٹھے کرنا بھی شامل تھا۔ جیسے کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، مسیح خداوند نے خود ٹیکس ادا کرنے کا حُکم دیا۔ کوئی بھی شخص جس کیلئے منظم حکومتیں سہولتوں اور محافظت کی ذمہ دار ہیں اُس کا یہ حق نہیں کہ وہ اِن چیزوں کی قیمت کے حصّہ میں سے ادا کرنے کے لئے انکار کرے، خواہ اُس کا حکومت کی حکمت عملی سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ہم مسیحیوں کو ضرور یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ دوسری چیزوں کی طرح، جیسے کہ مختاری کی ہماری موجودہ تعلیم زور دیتی ہے، ہماری دولت بھی خداوند کی ہے۔ اِسی طرح ارکانِ حکومت بھی اِس عجیب دائرہ میں خدا کی طرف سے خادم ہیں۔ اور مقدّس پولس یونانی زبان میں اِن لوگوں کے لئے جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ مسیحی ادب میں ہمیشہ ایک مذہبی خدمت کے لئے مخصوص ہے۔

اِس تعلیم سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیحی لوگ اختیار والوں کے تابع رہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی بہت بری طرح تاویل کی گئی ہے تاکہ بادشاہوں کے الٰہی اختیار

کے مسئلہ کو درست قرار دیا جا سکے۔ اور پھر اس کو قائم رکھنے کے لئے رعایا کو اپنے ملک کی منظم حکومت کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیئے خواہ اس کے فرمان لادابُرے ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اِس کے لئے جو یونانی لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے تابعداری کی جائے۔ یہ وہی لفظ ہے جو افسیوں ۵: ۲۱ میں استعمال کیا گیا ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم مسیح کے خوف سے ایک دُوسرے کے تابع رہیں۔ لیکن یہ باہمی تابعداری کو عائد کرتی ہے نہ کہ ایک عالمگیر اور غیر مشروط فرمانبرداری کو۔ مسیحیوں کا ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے کہ انسان کی تابعداری سے خدا کی تابعداری کو ترجیح دی جائے۔ (اعمال ۵: ۲۹)۔ جان ناکس کے نظریہ کے مطابق یہ فیصلہ کرنا کہ ایک حکمران کا حکم خدا کے احکام کے متضاد ہے، ایک ایسا عمل ہے جس کے لئے حکمت و دانش کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلہ میں مقدس پولس کی یقیناً یہ رائے ہوگی کہ بُرے فرمانوں کے لئے نافرمانی کے اپنے اِس حق کو ایک مسیحی سرسری طور پر نہ لے بلکہ یہ درست ہے کہ وہ بعض اوقات اِس موجودہ دَور میں بھی اِس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

## ۴۔ ریاست مکاشفہ کی کتاب میں

جب پولس نے روم کی کلیسیا کو لکھا تو رومی حکومت جابر نہ تھی۔ لیکن نیرو کی ایذارسانی کے بعد بھی عہدِ جدید کے مصنفین مثلاً مقدس لوقا اعمال کی کتاب میں یا مقدس پطرس اپنے پہلے خط میں رومی حکومت کے لئے کسی قسم کی مخالفت کا اظہار نہیں



کرتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۹۵ء میں دومطیان کی ایذارسانی میں وہ سب سے پہلا قدم تھا جب مسیحیوں سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ شہنشاہ کی پرستش کریں۔ اور اِسی صورتِ حال کو مکاشفہ کی کتاب میں منعکس کیا گیا ہے۔ مکاشفہ ۱۳ باب میں وہی ابلیس اژدہا جس نے ایک دفعہ مسیح خداوند سے کہا کہ اگر وہ گر کر اُسے سجدہ کرے تو وہ دُنیا کی شان وشوکت اسے دے دے گا۔ (متی ۴: ۹)۔ اُس نے یہی اختیارات اس حیوان کو دیئے جس سے روما مراد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے خدا کے برگزیدوں کے تمام لوگوں نے وہ قدم اٹھایا جس کے لئے مسیح خداوند نے انکار کر دیا (مکاشفہ ۱۳: ۸) اور انہوں نے اُس حیوان کی پرستش کی۔ بعد کے ابواب میں ظاہر ہوتا ہے کہ دُوسرے حیوان کی شناخت کچھ زیادہ ہی مشکوک ہے جس کو جھوٹے نبیوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے (۱۳: ۱۶، ۱۹: ۲۰، ۲۰: ۱۰)۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں حیوان بالترتیب رومی حکومت کے اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال کے لئے اور جھوٹی تعلیم کو جو اِس ناجائز استعمال کو درست ٹھہراتی ہے، پیش کرتے ہیں۔ یہی تصویر ہم نازی جرمنی میں دیکھتے ہیں جس نے اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال (مثلاً یہودیوں کے قتلِ عام میں) اور نسلی امتیاز جس نے اِسے بعد ازاں درست ٹھہرایا۔ اِن کشفی تصورات کا بیان اس تاریخی حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یعنی جب شہنشاہ کی پرستش کا تقاضا کیا گیا اور مزید برآں بادشاہ کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ لوگوں کی جائیداد جان چلن بلکہ اُن کی روحوں پر بھی اُسے اختیار ہے۔ لیکن ایک

مسیحی کو یہ مشکل درپیش تھی کہ وہ قیصر کے سامنے محض سیاسی وفاداری
کی علامت کے طور پر بخور نہ جلاتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مانچوریا میں
مسیحیوں نے شہنشاہ جاپان کے سامنے ایک ایسی ہی عبادتی
رسم کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ انہیں یہ یقین دلایا
گیا تھا کہ اس میں کسی قسم کا مذہبی مطلب پوشیدہ نہیں تھا۔
موجودہ دور میں بھی ریاست اپنے اختیارات سے اس سے زیادہ
ڈھکے چھپے طریقوں سے تجاوز کر سکتی ہے۔ مثلاً ملکی تعلیم سے۔ بچوں
کے ذہن پر اثر انداز ہونے یا ریڈیو اور نشر و اشاعت میں خبروں
اور نظریات پر پابندی لگانے سے۔ ایسی صورتِ حال میں ہر
ایک ملک کے مسیحیوں کو ہمیشہ باخبر رہنا چاہیئے۔

مسیحیوں کو چاہیئے کہ اگر حکومت اپنے جائز اختیارات سے
تجاوز کرے تو اُس کے احکام کو ماننے سے انکار کر دے۔ اس سے
زیادہ ابتدائی مسیحی کچھ نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں اُن میں سے
بعض کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ
کیا ایک مسیحی کو چاہیئے کہ دورِ حاضرہ میں بھی ایک نا انصاف
حکومت کے خلاف بغاوت میں نمایاں کردار ادا کرے۔ جیسے کہ
۱۹۵۶ء میں ہنگری میں ہوا۔ وہ لوگ جو مسیح کے عدم تشدد
کے نظریہ پر قائم ہیں۔ یقیناً "نفی" میں جواب دیں گے اور وہ
لوگ جو کیتھولک نظریہ کو قبول کرتے ہیں وہ "جائز جنگ" میں
حصّہ لینے میں حق بجانب ہیں۔ اور اس کے مدنظر وہ یہ نظریہ بھی
قائم کر سکتے ہیں کہ ایک "جائز سیاسی بغاوت" میں بھی نمایاں کردار
ادا کر سکتے ہیں۔ مکاشفہ کی کتاب کے لکھے جانے کے ایام میں مسیحیوں
کو صرف اِس بات کا علم تھا کہ ایک ریاست جو اپنے خدا داد



اختیارات سے تجاوز کرتی ہے۔ جیسے رومی حکومت نے کھُلے
بندوں کیا، اُس پر خدا اپنا غضب نازل کرتا ہے۔ کلیسیا کا فرض
ہے کہ وہ ایسی بدی کی عہدِ عتیق کے انبیاء کی طرح مذمت کرے۔
اس کی نہ صرف عہدِ عتیق بلکہ تاریخ بھی تصدیق کرتی ہے۔

## ۵۔ ہمارے خداوند کی تعلیم

گو ہمارا خداوند وقت کے تقاضہ کے مطابق زیلوتیسی
لوگوں کی پُرکشش حکمتِ عملی کی طرف مائل ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ ان تمام
سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہا۔ تاہم اس نے ایک موقعہ پر ہیرودیس
کیلئے "اس لومڑی" (لوقا ۱۳: ۳۲) جیسے الفاظ استعمال کر کے بظاہر
کیا کہ ایسے مواقع بھی ہیں جبکہ ایک مسیحی کو سیاسی طور پر غلط کام کرنے
والوں کے خلاف صاف گوئی سے کام لینا ہے۔ لیکن بر طرف
دیگر اس کے محصول لینے والوں کے ساتھ جو رومی جابروں کے لئے
کام کرتے تھے۔ دوستانہ تعلقات تھے جبکہ حاکمانِ وقت ان کو ذلیل
خوشامدی تصور کرتے تھے۔ مسیح خداوند کا اس سے زیادہ تعلق تھا کہ یہ
محصول لینے والے رومی حکام کی نسبت اپنی برائیوں کی تلافی کیلئے
مستعد تھے (لوقا ۱۸: ۸)۔

اِس موضوع پر ہمارے خُداوند نے براہِ راست تعلیم اس وقت
دی جب فریسیوں اور ہیرودیوں نے مل کر اُسے اپنے سوالات
میں پھنسانے کی کوشش کی "قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں" (مرقس
۱۲: ۱۳۔۱۷)۔ اِس سوال کا اگر تو ہمارا خداوند نفی میں جواب
دیتا تو یقیناً اُس کی رپورٹ رومی حکومت کو کی جاتی کہ وہ زیلوتیسی
انقلابی ہے، اور اگر وہ مُثبت میں جواب دیتا تو وہ اس تمام ہجوم

کا سامنا نہ کر سکتا۔ کیونکہ اُن کے پہلے سے ہی ہیرودیس یا عام محصول لینے والوں سے بہت کم تعلقات تھے۔ تاہم اُس نے ایسا قدم اٹھایا جو اس حقیقت کو پیش کرتا تھا۔ جو اُس کی ہر دلعزیزی کی نسبت اُس کے اپنے لئے ضروری تھا۔ "جو قیصر کا ہے قیصر کو دو" سے یہ مراد ہے کہ ہم حکومت کے فرائض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُسے اُس کی خدمات کے عوض کچھ ادا کریں۔ مسیح خداوند نے جو فعل استعمال کیا وُہ اُس سے مختلف تھا جو اُس سے سوال کرنے والوں نے کیا۔ کیونکہ اُس نے تو یہ پیش کیا کہ اس میں واپس کرنے کا سوال تھا۔ یعنی وُہ سکّہ جو قیصر کے نام سے جاری کیا گیا تھا اور جس پر اس کی تصویر تھی اور جسے ہر ایک شخص اپنے عام کاروبار میں استعمال کرتا تھا، وُہ صریحاً قیصر کا تھا۔ مسیح خداوند کے جواب کا دوسرا حِصّہ "جو خُدا کا ہے خدا کو ادا کرو" سوال سے کہیں بعید تھا۔ اور اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک ایسا حلقہ بھی ہے جہاں صرف خُدا ہی واحد مالک ہے اور وہاں قیصر کا کوئی حق نہیں کہ وُہ دخل اندازی کرے، اِس آیت کی طرطلیان نے نہایت موزوں تشریح پیش کی ہے"۔ جو خُدا کا ہے۔ خُدا کو ادا کرو" یہ الفاظ دیگر انسان میں خُدا کی شبیہ یعنی اپنے آپ کو پیش کرو۔

## ۵۔ موجُودہ صُورتِ حال

وُہ مسیحی جن کے لئے عہدِ جدید لکھا گیا وُہ سیاسی طور پر رومی حکومت میں بے یار و مددگار اقلیت تھے۔ ان میں سے بہت سے غلاموں اور چند ایک دوسرے باشندوں کو جو مقبوضہ صُوبوں میں سکونت پذیر تھے مابہت کم سیاسی حقوق



حاصل تھے۔ بہ طرفِ دیگر موجُودہ دَور میں دُنیا کے بہت سے ممالک میں مسیحیوں کو جمہوری طرزِ حکومت میں کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں اور ترقی کے مواقع بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس میں ایسے فرائض عائد کئے جاتے ہیں، جن کا براہِ راست عہدِ جدید میں حکم نہیں دیا گیا۔ تاہم عہدِ جدید کی تعلیم موجودہ دور میں اِس صورت میں مفید ہے کہ ایک مسیحی منظم حکومتوں کو اپنے ٹیکسوں کو مستعدی سے ادا کرے اور بوقتِ ضرورت پولیس اور دوسرے حکّام کی مدد کرنے سے تعاوُن کرے۔

دورِ حاضرہ میں ایک مسیحی سے یہ مطالبات کئے جا سکتے ہیں کہ وہ (ا) اپنے ووٹ کا بغیر تعصب اور ڈر کے بہت غور و فکر سے اپنے مقامی اور قومی انتخاب میں استعمال کرے گا۔ (ب) وُہ اِس کوشش میں رہے گا کہ اپنے وقت کے سیاسی مسائل سے باخبر رہے گا تاکہ جو کچھ درست ہے اُس کے مطابق عمل کر سکے (ج) وُہ اپنے مسیحی حقِ آزادی کو استعمال میں لاتے ہوئے حکومت کی غلط حکمتِ عملی کے خلاف آواز بلند کرے گا۔ یہ اُس سچائی کا ایک حِصّہ ہے۔ جس کے لئے مسیح خداوند اِس دنیا میں آیا۔ (یوحنا ۱۸ : ۳۷ - ۳۸)۔ یہ ایک ایسی گواہی ہے جس سے بہت سے ممالک میں مسیحی معاشرہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسیحی لوگوں کو ایذائیں بھی دی جائیں۔ لیکن یہ اِس صورت میں مؤثر ہو گا۔ اگر مسیحیوں نے پہلے ہی سے حکومت کے اچھے کاموں میں تعاون کا اظہار کیا ہو۔

عام طور پر مسیحی کی دوسروں کے بارے میں فکر مندی اُسے

سیاست میں حصّہ لینے کی ترغیب دلائے گی۔ خواہ ہم اُسے اُن تین سرگرمیوں تک ہی محدود کیوں نہ کر دیں۔ جن کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ اس کی بہر حال یہی کوشش ہو گی کہ اپنے ملک اور دُنیا کے پس ماندہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کافی کچھ کیا جائے۔ لیکن یہ یقیناً زیادہ ٹیکسوں کے لئے ایک غیر مقبول قدم ہو گا۔ حاجتمندوں سے ایک ایسا تعلق ظاہر کرتا۔ عہد عتیق کے انبیاء کی تعلیم اور مسیح کے نمونہ سے بالکل ہم آہنگ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مسیحی کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ کہیں ریاست اپنے اختیارات سے تجاوز تو نہیں کرتی جس سے مسیحی کی وہ انفرادی آزادی چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ جس کے لئے وُہ بلایا گیا ہے (گلیتوں ۵ : ۱۳)۔ موجودہ ریاست میں اعلےٰ ترین منظم مرکزی نظام میں بھی انسانی آزادی کے لئے مسلسل دھمکی دی جاتی ہے۔ خواہ یہ نظام سرمایہ داری کا ہو، خواہ اشتمالی نظام جو اپنے موجودہ پروپیگنڈہ سے انسان کے ذہن پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ لیکن موجودہ زندگی کی پیچیدگیوں میں خاص کر یہ دو نظریات یعنی پس ماندہ لوگوں کی مدد کرنا اور انفرادی آزادی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک مسیحی کا جرمنی کو دوبارہ متحد کرنے یا صنعت کاری کو قومی ملکیت بنانے جیسے مخصوص سیاسی مسائل کے معاملہ میں اختلافِ رائے ہے۔ اور یہی وُہ صُورت حال ہے جو مسیحیوں کی طرف سے دیانتدارانہ غور و فکر، آزاد بحث اور سنجیدگی سے دُعا کا تقاضا کرتی ہے۔

کسی وقت بھی ایک مسیحی کو ایک ایسی صُورتِ حال سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ جہاں اُسے اپنے لئے یہ فیصلہ کرنا ہو گا۔ کہ اپنی



ضمیر کے خلاف اپنے مُلک کی حکومت کے احکام کو ماننے سے انکار کر دے۔ یہ ایک عام نظریہ رہا ہے کہ جب بھی اُسے کہا جائے تو اُسے مُلک کے لئے لڑنا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف کسی کو تکلیف دینا یا کوئی دوسرا ظالمانہ فعل سرانجام دینا، اُس وقت بھی جب کہ اُس کے لئے سخت احکام ہی کیوں نہ ہوں، غلط ہے۔ پھر ایک مسیحی یہ بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ جب حکومت لازمی تعلیم کے قانون کے تحت بچّوں کو سیاسی یا مذہبی پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کرے تو وُہ اپنے بچّوں کو سکول سے ہٹائے یعنی اِس نظریہ کے تحت کہ انتہائی قسم کے معاملات میں ایک مسیحی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وُہ کِسی منظم حکومت کے خاتمہ کے لئے کسی بغاوت میں حِصّہ لینے میں حق بجانب ہے۔

ایک مسیحی اِس بات کو صفائی سے سمجھتا ہے کہ ریاست کا خُدا کی بادشاہت کی نسبت انسان کی گری ہوئی حالت سے تعلق ہے۔ اِسی لئے اس میں یہ ایک لازمی دستور ہے کہ وُہ بُرائی کے لئے معافی پر نہیں بلکہ سزا پر زور دیتی ہے۔ اور اُس کے حاکم جو اپنے آپ کو خُدا وندِ اِن نعمت تصوّر کرتے ہیں۔ وُہ عوام کی آزادی کی قدر کی بجائے ہر گاہ اقتدار و مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ تاہم موجودہ رفاہی ریاست میں خدمت انصاف اور امدادِ باہمی جیسے مقاصد کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اِن مقاصد نے مسیحی انجیل سے بہت سے خیالات حاصل کئے ہیں۔ آخر میں ہم

یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک مسیحی کا اِس بات پہ زور ہوگا کہ اِس بادشاہت کو کافی حد تک خدا کی بادشاہت کے ہمشکل ہونا چاہیئے۔
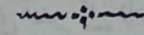


## پندرھواں باب

# مسیحی اَور تمام بنی نوع انسان

### ۱۔ حُبّ الوطنی

ہمیں ایک ایسی ہی محافظت کی ضرورت ہے جو انسان کو مشترکہ نظریہ، مشترکہ زبان اَور ایک ایسی نسل اَور رسوُمات سے جن سے ہم واقف ہیں، دی جاتی ہے۔ بہت سے دُوسرے لوگ اَور وُہ مسیحی جن کا یہ تصوّر ہے کہ اُن کا وطن آسمان پر ہے انہیں بھی اپنے مُلک سے خاص وفاداری کا احساس ہے۔ لیکن بعض ممالک میں ایسی وفاداری کا یہ خطرہ ہے کہ کہیں وُہ سیاسی مذہب بن کر نہ رہ جائے۔ مثلاً قومی جھنڈا ایک مذہبی اَور سیاسی نشان کو ظاہر کر سکتا ہے اور ہندوؤں کی بھارت ماتا سے محبت، مذہبی احساسات اَور حب الوطنی دونوں کو پیش کرتی ہے۔ تاہم ہمارا یہ اعتقاد بھی ہوسکتا ہے کہ روئے زمین کے کسی حصّہ اَور اس کے باشندوں سے انسان کا خاص لگاؤ تخلیق کائنات کا ایک محسن نظام ہے۔ کپلنگ اسے یوں بیان کرتا ہے کہ "خداوند نے سب لوگوں کو یہ ساری زمین دی کہ اُس سے محبّت رکھیں۔ چونکہ ہم تنگ دل ہیں اِس لئے اُس نے

ہر ایک کے لئے ایک ایسی جگہ مقرر کی جو سب سے پُرکشش ہو۔" یہی تصوّر پولس رسول کے اِن الفاظ میں جھلکتا ہے: "اور اُس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی اور اُن کی میعادیں اور سکونت کی حدیں مقرر کیں" (اعمال ۱۷ : ۲۶)۔

جیسے کہ عہدِ عتیق میں بیان کیا گیا ہے بنی اسرائیل کو اپنے وطن سے پورے دل سے محبت تھی۔ بائبل میں ایک اسیر نے یوں لکھا "اے یروشلیم! اگر تجھے بھولوں، تو میرا دہنا ہاتھ اپنا ہُنر بھول جائے۔ اگر میں تجھے یاد نہ رکھوں۔ اگر میں یروشلیم کو اپنی بڑی سے بڑی خوشی پر ترجیح نہ دوں تو میری زبان میرے تالو سے چپک جائے" (زبور ۱۳۷ : ۵-۶)۔ تاہم عہدِ عتیق میں نہایت اعلیٰ اور مذہبی آرزوؤں کے تحت بھی ایسی حُب الوطنی کے نمایاں خطرات واضح کئے گئے ہیں (الف) بغیر کسی قسم کے اثبات کے بنی اسرائیل دوسری نسلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ حقارت یہاں تک تھی کہ غیر قوموں کو کتوں سے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے (مرقس ۷ : ۲۷)۔ یہ نفرت عزرا کے عہد میں غیر قوم بیویوں کو چھوڑنے سے، خواہ وہ کتنی ہی وفادار کیوں نہ تھیں (عزرا ۹ : ۱-۱۰) اور فلسطین کے اصلی باشندوں کو بالکل نیست نابود کرنے کی کوشش میں ہولناک نتائج میں ظاہر ہوئی۔ (استثنا ۷ : ۱- آگے) (ب) اُن میں ایک ایسا نسلی امتیاز پایا جاتا تھا۔ جو کبھی بھی قدیم ادوار میں نہیں تھا اور اگر تھا تو غالباً یہ بہت بڑی چیز ہوتی۔ یہودی لوگ اِس بات کو فراموش کر بیٹھے کہ شاہی خاندان کے آباؤ اجداد میں راحب کنعانی اور رُوت موآبی جیسی عورتیں بھی تھیں۔ اِس صدی کا یہ ایک المیہ ہے کہ نازی جرمنی میں ایک آریائی قوم نے



اپنے نسلی امتیاز کے لئے غیر مدلّل مطالبات کا دعوےٰ کیا تاکہ وہ یہودیوں کو جو عہدِ عتیق میں نسلی امتیاز کے قائل تھے، ایذا پہنچا دے سکیں (ج) بنی اسرائیل اس بات سے اتفاق کرتے تھے کہ ایک قوم کی حیثیت سے اُن کا فرض تھا کہ وہ دوسری قوموں کو اپنے میں شامل کریں۔ کیونکہ خُدا نے تو انہیں اِس مقصد کے لئے بلایا تھا کہ وہ اپنی خاص خُداداد نعمتوں سے دوسری قوموں کے لئے برکت کا باعث بنیں (پیدائش ۱۲ : ۳)۔ "میں خداوند نے تجھے صداقت سے بلایا۔ میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا۔ اور تیری حفاظت کروں گا۔ اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا" (یسعیاہ ۴۲ : ۶)۔ اسیری کے بعد اِس محدود خلوت پسندی کی عقیدۂ کلیت پسندی نے جگہ لے لی جیسے شاعر بنی جس نے یسعیاہ ۴۰-۵۶ باب کو لکھا، سکھایا۔ مندرجہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خُدا کا دوسری قوموں کے لئے اپنا ایک خاص مقصد ہے (عاموس ۹ : ۷)۔

موجودہ دور میں جنوبی افریقہ میں "اپرتھیٹ" کی حکمتِ عملی قوموں کی کُلّی طور پر علیحدگی عام طور پر ایک مدلّل نظریہ پر قائم ہے کہ یہ درست ہے کہ ہر ایک نسل اپنے طرز و طریق پر بڑھے۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ایک قوم دوسری قوم کے اُمور میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی کسی قسم کی دشمنی اور عناد کا امکان ہے۔ شمالی آئرلینڈ اور ایرہ کے درمیان تقسیم اور بھارت اور پاکستان کا وجود اسی نظریہ کے تحت ہے۔ اِس نظریہ کی حمایت اِس رائے سے کی جاتی ہے کہ زیرِ بحث اقوام میں سے ایک فی نفسہٖ دوسری سے اعلیٰ ہے۔ اور جب کھلے بندوں اِس کا اظہار کیا جاتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر انسان کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ اپرتھیٹ کی حکمتِ عملی

یہ  مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں (ا) مختلف قوموں اور مختلف تہذیبوں
کی ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدگی عملی طور پر ناممکن ہے۔ مثلاً
جنوبی افریقہ میں سفید افریقانہ لوگوں کو اپنی فیکٹریوں اور کھیتوں
میں سیاہ بانٹو لوگوں کی مزدوری کے لئے ضرورت ہے اور بانٹو
لوگ محتاج ہیں کہ وہ مزدوری کریں تاکہ اپنا اور اپنے بال بچّوں کا
پیٹ پال سکیں۔ (ب) نہ تو مسیحیت کے بنیادی اصول اور نہ ہی
موجودہ نفسیاتی امتحان مثلاً جن کا اطلاق یونیسکو کی تفتیش میں ہوتا
ہے، ہمیں اجازت دیتے ہیں، کہ ہمارا یہ اعتقاد ہو کہ ایک نسل
فی نفسہٖ دوسری سے اعلیٰ ہے (ج) اگر ایک نسل معاشی اور تمدنی
لحاظ سے دوسری نسل سے پس ماندہ ہے، تو اِس کا یہ خدشہ ہوگا
کہ کہیں ارادتاً اِن پس ماندہ لوگوں کے لئے گھٹیا قسم کا تعلیمی نصاب
تجویز نہ کیا جائے۔ ایک افریقانہ مدبّر سے جب یہ پوچھا گیا کہ بانٹو
لوگوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔ تو اُس نے یہ پیش کیا کہ اُنہیں
ایسی تعلیم دی جائے جو اُن کے لئے ہوٹلوں میں نوکری اور جنگلات
میں مزدوری کے لئے موزوں ہو۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وُہ موجودہ
دور میں عہدِ عتیق کے لکڑہاروں اور پانی دینے والے لوگوں جیسے
تھے۔ یہ اکثر اوقات ہمارے مشاہدہ میں آیا ہے کہ پس ماندہ
لوگ اپنی تمدّنی روایات پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن آج کل
اُن کا یہ رجحان ہے کہ وُہ مغرب کی سائنسی تعلیم کو سیکھنے کے آرزومند
ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "اپرتھیت" کا مسئلہ کافی حد تک اونچے
طبقہ کی اقلیت کے فطری خدشات کے عقلیت کے رنگ پر مبنی
ہے۔ گورے جنوبی افریقی لوگوں کو کم مزدوری کے معاشی مقابلہ سے
خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اور انہیں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کہیں اُن کی



تہذیب بھی اُن تصورات سے جنہیں وُہ ملحد خیال کرتے ہیں، بگڑ نہ
جائے۔ پھر انہیں اس خدشہ کا بھی احساس ہے کہ کہیں انہیں بالکل نیست و
نابود نہ کر دیا جائے۔ اپنے ان خدشات کو درست قرار دینے کے لئے
وہ بظاہر معقول وجوہات پیش کرتے ہیں۔
کِسی مُلک میں ایک مسیحی اقلیت جس کی تمدنی روایات کافی حد تک
دوسرے مذہب کی راہ میں حائل ہیں مشکوک حالت میں ہے۔ حکومت
سے تعاون اور اس کی اطاعت جیسے معیاری فرائض پر ہم نے گذشتہ
باب میں واضح طور پر غور و خوض کیا ہے۔ مسیحی بھی دوسروں کی طرح
فطری طور پر اپنی جائے پیدائش اور اپنی محبوب رفاقتوں سے پیار
کرتے ہیں۔ یہ بالکل مناسب ہوگا۔ اگر پاکستانی مسیحی بھی علامہؒ اقبال کی
پراسرار شاعری اور مغل شہنشاہوں کے فنِ تعمیر پر ناز کریں۔ البتہ
ہم ایک فرانسیسی مسیحی سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس لئے والٹیئر
اور روسو کی ادبی خصوصیات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں کہ وُہ
مسیحی ایماندار نہ تھے۔ ایسے مواقع بھی ہوں گے جب کہ قومی تہوار کے موقع
پر ایک مسیحی کو دوسرے مذہب کی رسومات کو احترام کی نگاہ سے
دیکھنا ہوگا۔ لیکن اُسے اُن میں حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ عین
ممکن ہے کہ اِس طرح وُہ قیصر کے سامنے بخور جلانے والے جیسی
رسم کو ادا کرے۔
سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے مذہب
سے مسیحی مذہب میں داخل ہو تو وُہ اپنے آباؤ اجداد کی قومی میراث
میں سے جو کچھ اچّھا ہے، اس پر قائم رہے۔ ایک مسیحی کو اپنے مسلمان
پڑوسیوں سے جو اپنے مذہب پر صدقِ دل سے قائم ہیں۔ پانچ
وقت نماز کی پابندی اور نشہ آور مشروبات سے اجتناب جیسی اچھّی

باتیں سیکھنا چاہئیں، مشرق اور افریقہ میں مسیحیت کے اوّلین ایام میں یہ ایک المیہ تھا کہ پہلے نومریدوں نے اپنے مشنری استادوں کے مذہبی ایمان کے ساتھ ساتھ ان کا مغربی طرزِ زندگی بھی اپنا لیا۔ مختلف قوموں کے آپس میں تعلقات میں یہ فیصلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ کہاں تک وہ ایک دوسرے کی تہذیب سے سیکھنے کے لئے تیار ہیں۔ اور کہاں تک کسی کو اپنے اسلاف کے "اچھے طریقوں" کو قائم رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

## ۲۔ مسیحی نظریۂ کُلّیت پسندی

عہدِ جدید کی بنیادی اخلاقی تعلیم کا جو خُدا یعنی تمام لوگوں کے باپ اور تمام انسان سے محبّت کا تقاضا کرتا ہے یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ رنگ و نسل کے تمام اختلافات مِٹ کر رہ جائیں۔ "وہاں نہ یونانی رہا نہ یہودی، نہ ختنہ نہ نامختونی۔ نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے" (کلسیوں ۳ : ۱۱)۔ "خُدا کسی کا طرفدار نہیں بلکہ ہر ایک قوم میں جو اُس سے ڈرتا۔ اور راستبازی کرتا ہے۔ وہ اُس کو پسند آتا ہے" (اعمال ۱۰ : ۳۴ - ۳۵)۔ آج کل اِس نظریہ کو ہر دو مسیحی اور غیر مسیحی بھی (کم از کم نظریاتی طور پر) قبول کرتے ہیں لیکن بعض اوقات اِس نظریہ کے حامی مسیحی فرائض اور حب الوطنی کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک مسیحی بھی بھُول جاتے کہ تمام بنی نوع انسان کے لئے اُس کا سب سے اہم حصّہ یہ ہے کہ وُہ تمام قوموں میں انجیل کی منادی کرے (متی ۲۸ : ۱۹)۔ یاد رہے کہ منادی کی یہ خدمت اِس رُوح



میں ہو کہ مسیحی مبّشر جس شخص کے سامنے کلام یا نمونہ سے منادی کرتا ہے، اُس کی مذہبی اور تمدّنی وراثت کا احترام کرتے ہوئے کرے۔ ایک مسیحی کا یہ بھی ایمان ہے کہ انجیل کی خوشخبری کو پیش کرنے کے بعد وُہ بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی قوم کی خصوصی وراثت اور صلاحیتوں کو پیش کرے۔ جیسے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکاشفہ کی کتاب کا مصنف کس طرح اِس حقیقت کو آسمانی شہر کی تصویر بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے" اور لوگ قوموں کی شان و شوکت اور عزت کا سامان اُس میں لائیں گے" (مکاشفہ ۲۱ : ۲۶) زمین پر خُدا کی بادشاہی کی مسیحی رویا یہ نہیں کہ ہر چیز یکساں ہو بلکہ یہ تو ایک ایسی دُنیا ہے۔ جس میں طرح طرح کی تمدّنی روایات بکثرت موجود ہیں۔ اور ایک دُوسری کے لئے تحریک پیدا کرتی ہیں۔

آج کل یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مختلف قوموں کے درمیان مسیحیوں کی شخصی فہم و تفہیم اور دوستی کی ضرورت ہے۔ لیکن اِس کے لئے یہ ایک ضروری شرط ہے۔ کہ معاشرتی تعلقات اور مساوات کے موقعوں پر نسلی امتیاز رکاوٹ کا باعث نہ ہو۔ مثلاً جنوبی افریقہ کی کرکٹ کی ٹیم میں ایک افریقانر اور بانٹو دونوں کو مساوی مقام دینا چاہیئے اور جمیکا کا باشندہ ایک انگریز کی مانند انسپکٹر بننے کے لئے ترقی کا حقدار ہے۔ ہمیں جاننا چاہیئے کہ مختلف نسلوں کے لوگوں کے درمیان مسیحی دوستی کی بہت مشکلات ہیں۔ ایک تو زبان کی رکاوٹ ہے۔ اور وُہ شخص جو کسی غیر زبان پر حاوی ہونیکا دعویٰ کرتا ہے۔ اُس میں بھی زباندانی کی ضرور بہت سی خامیاں ہوں گی جن سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کی کافی گنجائش

ہے۔ کچھ مُعاشی رکاوٹیں بھی ہیں کیونکہ جب تک گورے لوگوں کی اکثریت ہے۔ اَور کالے لوگوں کی کثیر تعداد غربت کا شکار ہے اُس وقت تک اِن میں مہمان نوازی کے موقوں پہ غلامی کی روح کا احساس ہونا لازمی ہے۔ کچھ نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً جب ایک نسل کے کِسی شخص کو اپنے قدرتی ماحول سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو وُہ کچھ معیوب سا محسوس کرے گا۔ اِسی وجہ سے ایک انگریز ہندوستان میں گستاخانہ رویّہ اختیار کر لیتا ہے اور ایک پاکستانی پارک شائر میں اپنے آپ کو بے تکلف محسوس نہیں کرتا۔ معاشرتی نظریات کا اختلاف بھی ایک رکاوٹ ہے مثلاً جمیکا کا ایک باشندہ بلند آواز میں گفتگو اَور موسیقی کو پسند کرتا ہے جب کہ اُس کے ایک انگریز پڑوسی کے لئے یہ باعثِ مداخلت ہے۔ اَور جب انگریز لڑکی ایک پاکستانی لڑکے سے ر... ی کرتی ہے تو وُہ محسوس کرتی ہے کہ اُسے اپنے سسرال سے وابستہ رہنا ہے حالانکہ انگلستان کے ماحول میں اُس پہ یہ پابندی نہ ہوتی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہم ایسے حالات میں یہ بھول جائیں کہ دوسرے لوگوں کی مختلف تہذیب اَور معاشرتی وراثت سے کہاں تک سیکھ سکتے ہیں۔ بعض اہلِ فکر مسیحیوں کو یہ رکاوٹیں اس شبہ میں ڈال دیتی ہیں آیا کہ مختلف نسلوں کے لوگوں آپس میں شادی مناسب ہے یا نہیں۔ تاہم کوئی بھی ایسا مسیحی اصول نہیں جو ایسی شادیوں کو ممنوع قرار دیتا ہو۔ لیکن وہ شخص جو کسی دوسری نسل کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اُسے چاہیئے کہ وُہ پہلے اپنے دوسرے مسیحیوں سے اس کیلئے تصدیق کروالے۔ وُہ لوگ جو ایسی شادیوں کے بارے میں سوچتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نظریات کا اختلاف یقیناً کشمکش اَور کھچاوٹ



کا باعث ہوگا۔ لیکن ایسی کشمکش خداوند کی مدد سے مسیحی محبت سے یقیناً دور ہو سکتی ہے۔ نیز مخلوط نسل کے بچے یوریشین اَور Coloured لوگوں کے خلاف غلط تعصبات کے باعث مشکلات میں زندگی بسر کریں گے۔ یہ دَورِ حاضرہ کے مصنف کے طویل تجربہ کے یقین پر مبنی ہے۔ کہ صرف خُدا کے فضل سے مختلف نسلوں کے لوگ آپس میں مِل کر رہتے ہیں جیسے کہ مسیحی لوگوں کو رہنا چاہیئے۔

## ۳۳۔ جنگ کا رواج

انفرادی جھگڑوں کی طرح اِس دُنیا میں قومیں آپس میں لڑتی ہیں۔ اَور اِن لڑائیوں کے تصفیہ کے لئے جنگ ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ بائبل مقدّس بھی جنگ کے رواج کو زندگی کی ایک حقیقت کی حیثیت سے قبُول کرتی ہے۔ عہدِ عتیق کے مصنفین نے دوسری قدیم قوموں کے مورخین کی طرح یہ خیال کیا کہ جنگ ایک ایسا واقعہ ہے جو اکثر رُونما ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً سال میں ایک ایسا وقت تھا جب "بادشاہ جنگ کے لئے نکلتے تھے" (۲۔ سموئیل ۱۱ : ۱) اَور یقیناً ہمعصر اسُوری بادشاہوں کا بھی یہی دستور تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خُدا نے بعض اوقات اپنے لوگوں کو خُود حکم دیا کہ وہ ظلم و تشدد کی روح میں نبرد آزما ہوں مثلاً جیسے اُس نے فلسطین کے اصلی باشندوں کو تہ تیغ کرنے (استثنا ۲۰ : ۱۶) اَور ادوم اَور بابل کے حامیوں کو سزا دینے میں اُس نے ظاہر کیا۔ (زبور ۱۳۷ : ۷۔ ۹)۔ حتیٰ کہ عہدِ جدید میں مقبوضہ علاقوں کی فوج اَور سپاہیوں کی خدمت کو ایک لازمی دستور کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اَور اُس کی غلامی کی طرح کچھ مخالفت نہیں کی گئی۔ اَور مابعد صدیوں میں فیصلہ کُن الفاظ

ہیں غلامی کی مذمت کی گئی۔ دورِ حاضرہ میں سیاستدان اکثر یہ کہتے ہیں کہ جنگ کے بارے میں وُہ تو اپنے ذہن میں خیال تک بھی نہیں لاتے۔ لیکن دُوسرے ممالک کے بد دیانت حریت پسندوں کی طرف سے یہ زبردستی اُن پر ٹھونس دی جاتی ہے۔ تاہم حکومتیں اپنے بہت زیادہ اخراجات سے فوجی دستے اِس لئے نہیں رکھتیں کہ تفریحات کے موقعوں پر اُن کی نمائش کی جائے بلکہ اُن کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ دشمنوں کو کچلا جائے۔ یاد رہے کہ نہ تو سیاستدانوں اور نہ ہی سپاہیوں کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ اُن کے دُشمن ہوں تاکہ وُہ انہیں قتل کریں بعینہٖ۔ جیسے کہ ڈاکٹروں کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ اُن کے پاس بیمار آئیں تاکہ وُہ اُن کا علاج کر سکیں۔ ملحد اور مسیحی ممالک دونوں میں سپاہیوں کے وجود کا سبب "جنگ" ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں آج تک جنگ کی دھمکی فیصلہ کُن ہے۔ اور اگر دشمن سیاستدان کی دھمکی کو قبول کر لیتا ہے تو لازمی امر ہے کہ سیاست دان مجبور ہے کہ یا تو وُہ جنگ کرے۔ یا پھر خود ذلّت برداشت کرے۔ لیکن عام طور پر وُہ انسانی فطرت کے تقاضہ کے تحت جنگ کو ہی اختیار کرتا ہے۔

ابتدائی مسیحوں نے جو کہ اقلیّت تھے اور جن کا کوئی سیاسی اثر و رسُوخ بھی نہ تھا بلکہ جن کا یہ ایمان تھا کہ بہر صُورت دُنیا کے تمام نظام عنقریب اختتام پذیر ہوں گے، قدرتی طور پر نہ تو سیاسی زندگی میں اور نہ ہی نتیجتاً جنگ میں حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ کلیسیا کے کچھ حصّہ میں سے منصف یا سپاہی بننا تک ممنوع تھا۔ اور اب بھی بعض ایسے ہیں جن کا اندازِ فکر یہی ہے اور یہ معقول بھی ہے۔ لیکن دُنیا کو ترک کئے بغیر عملی طور پر یہ انتہائی مشکل ہے۔ بہت سے مسیحوں



کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم دُنیا کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کریں تاکہ اپنے اثر و رسوخ کو اپنی معاشرتی بہبودی اور انجیل کی اشاعت کے لئے استعمال میں لا سکیں۔

مسیحیوں کے جنگ سے متعلق عام رویّہ کے لئے دو اُمور پیش خدمت ہیں (ا) ایک مسیحی کو یہ علم ہے کہ جنگ نہ صرف بذاتہٖ بُری ہے اور بنی نوع انسان کے لئے خُدا کے بنیادی مقصد کے متضاد ہے۔ بلکہ کسی بھی شخص کا یہ خیال نہیں کہ ایک شخص کا دوسرے لوگوں کو بیدردی سے قتل کر دینا درست ہے، سوائے حقیقی اچھائی کی امید میں جو اس سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم اس سادہ سی حقیقت کو نظر انداز کرنا مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ عرصہ دراز سے بین الاقوامی جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے جنگ کا طریقہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جنگ کی دھوم دھام کے ماحول نے بعض لوگوں کو اس طرح فریب دیا ہے کہ وہ یہ تصوّر کرنے لگتے ہیں کہ جنگ کرنا اچھّا ہے کیونکہ اس میں لوگ اپنی بہادری کی خصوصیات کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ اُس اصول کو بھی پُورا کرتی ہے کہ جس میں زندہ رہنے کی قوّت ہے، وُہ زندہ رہے، لیکن ایسی دلائل کا ایٹمی جنگ پر جس سے ہم آج کل دوچار ہیں، اطلاق نہیں ہو سکتا۔ بہر کیف "زمین پر صُلح" صریحاً ہمارے سامنے ایک مسیحی نظریہ کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اور اس کی ممکن صورت وہی ہے۔ جب "دُنیا کی بادشاہی ہمارے خداوند اور اُس کے مسیح کی ہو گئی اور وُہ ابدالآباد بادشاہی کرے گا۔" (مکاشفہ ۱۱: ۱۵) (ب) تمام مسیحی یہ جانتے ہیں کہ ہماری انسانی فطرت کی خود غرضی سے جنگ رُونما ہوتی ہے۔ مقدّس یعقوب سوال کرتا ہے "تم میں لڑائیاں اور جھگڑے کہاں سے آ گئے؟ کیا اُن خواہشوں سے نہیں جو تمہارے

اعضا میں فساد کرتی ہیں۔ ۲ تم خواہش کرتے ہو۔ اور تمہیں ملتا نہیں۔ خون اور حسد کرتے ہو اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے" (یعقوب ۴: ۱-۲) جنگ کو روکنے کے لئے مسیحی خواہ اور طریقے استعمال کیوں نہ کریں۔ لیکن اس برائی کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان تبدیل ہو جائے اور یہ ایک ایسا کام ہے جسے صرف مسیح خداوند سرانجام دے سکتا ہے۔

## ۴۔ جائز جنگ اور انسدادِ جنگ

جب مسیحیوں نے سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا تو اُن کا عموماً یہ نظریہ تھا کہ اگر جنگ کسی جائز سبب کے باعث ہے تو اُن کا اس میں حصہ لینا مناسب ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت ماہرینِ علم الٰہیات نے بڑی احتیاط سے جنگ کے کچھ اصول مرتب کئے ہیں۔ جائز جنگ وہ ہے جو کسی جائز سبب مثلاً اپنے دفاع کے لئے اور عموماً مناسب ذرائع سے کی جائے۔ تاہم جنگ کی ایسی شرائط کی کسی بھی حقیقی جنگ میں کبھی بھی پورے طور سے پرواہ نہیں کی گئی لیکن پھر بھی انہی شرائط نے مسیحی سپاہیوں اور مسیحی سیاستدانوں کے ضمیروں کو کسی حد تک سکون دیا ہے اور ساتھ ہی اِن شرائط نے تباہ کن ذرائع پر حد بندی لگاتے سے اس موجودہ صدی تک جنگ کی دہشت کو کم کیا ہے۔ ہم یہاں پر جائز جنگ کی صرف دو شرائط کا ذکر کریں گے جنہیں اس ایٹمی دور میں پورا کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ امکان تھا کہ جنگ سے ایسی بھلائی پیدا ہو گی جو اس کی برائیوں سے زیادہ اہم ہو گی۔ لیکن یہ ایک ایسی شرط تھی جو اس صورتِ حال میں کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے جب کہ ایک عالمی جنگ میں نسلِ انسانی کا ایک بہت زیادہ حصہ کے بالکل نیست و نابود ہو جانے کا امکان ہے۔ دوسری شرط یہ ہے



کہ "جنگ میں جو ذرائع استعمال کئے جائیں وہ انسانی فطرت کے مطابق ہوں اور اُن کا مسیحی اصولوں اور بین الاقوامی معاہدوں سے ہم آہنگ ہونا بھی لازمی ہے۔" لیکن یہ شرط میگاٹن بم کے استعمال کیلئے کوئی گنجائش نہیں رہنے دیتی اور یُوں جائز جنگ کا مسئلہ بیسویں صدی صدی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ چنانچہ اس مسیحی نظریہ پر از سرِ نو غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں بعض مسیحیوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق ایسی شرائط پیش کی ہیں۔ جن کے تحت وہ اب بھی ایک ایسی حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ جو جنگ کرتی ہے۔ (ا) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے پاس ایٹم بم رکھیں تو سہی۔ لیکن صرف اس مقصد کے لئے کہ دوسروں کو ہراساں کیا جائے تاکہ وہ جنگ شروع نہ کریں۔ لیکن کسی قسم کے حالات میں بھی ہمیں انہیں استعمال نہیں کرنا چاہیئے (ب) بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم پر حملہ کیا جائے تو ہمیں مصافیاتی ہتھیار استعمال کر لینے چاہئیں (یعنی ایسے ہتھیار جو اُن ہتھیاروں کی طاقت کے برابر ہیں جو ایٹمی دور سے پہلے جنگوں میں استعمال کئے جاتے تھے) لیکن کبھی ایٹمی حربی ہتھیار استعمال میں نہیں لانے چاہئیں (یعنی ایسے ہتھیار جو بہت زیادہ تباہی کا باعث ہیں) (ج) بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ایک ایسی جنگ کی حمایت کر سکتے ہیں۔ جس میں غیر ایٹمی ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں ضرور اس وقت عدم تعاون کا اظہار کرنا چاہیئے۔ جب ہماری حکومت ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے لگے۔ کسی شخص کا اُن پابندیوں پر جو مسیحی لوگ اپنے ایامِ امن میں عائد کریں، بہت کم اعتقاد ہو گا۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کی ابتدا سے پہلے ایک کلیسیا کی عدالتِ اعلےٰ میں یہ قانون پاس ہوا کہ مسیحی لوگ

CamScanner

دشمن کے کسی شہر پر بلا امتیاز طور پر بمباری کے لئے اصرار نہیں کر سکتے۔ لیکن جب ہیمبرگ پر بُری طرح سے بمباری ہوئی تو اس وقت کسی قسم کا بھی احتجاج نہ کیا گیا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ایامِ امن میں کلیساؤں کی طرف سے معینہ شرائط کے تحت تعاون، جنگ کے جذباتی زور میں مسیحی اصولوں کو بھی مکمل طور پر ترک کرنے میں ختم ہو جائے گا۔

اگر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جائز جنگ کے قدیم مسئلہ کی طرح اب کسی بھی سمجھوتہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ تو بین الاقوامی جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ہمیں از سرِ نو سوچنا ہے کہ آیا ایک مسیحی کو جنگ کے دستور سے بالکل ہاتھ دھونا پڑے گا یا اس کا یہ مطلب ہو گا کہ معاشرہ کے موجودہ نظام میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ مثلاً اقوامِ متحدہ یا یورپی معاشرہ جیسی تنظیموں کے سامنے اپنی قومی مطلق العنانیت کو معقول حد تک اطاعت میں دے دیا جائے۔ ہم اس سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ مختلف ممالک کے درمیان معاشی رکاوٹیں ہوں گی۔ اور ایک وقت آئے گا جب مغرب کی ترقی یافتہ قوموں کا کم از کم معیارِ زندگی گھٹیا ہو جائے گا۔ مسیحیوں کو چاہیئے کہ وہ ضرور ایسے مقاصد کے لئے جو یقیناً غیر مقبول ہوں گے، قانون سازی کی حمایت کرنے کے لئے تیار رہیں۔

سیاسی ذمہ داری کا ہمیشہ یہی مطلب نہیں کہ حکّام سے تعاون کیا جائے۔ حالانکہ تعاون کے بغیر احتجاج محض منفی اور تلافِ ذات بن کر رہ جاتے گا۔ اگر تو مسیحی ہمیشہ حکومت کے خلاف رہے ہوں تو سیاسی دنیا میں اُن کا وجود بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اُن کے لئے یہ بہت اچھا ہو گا۔ اگر انہوں نے عام حکمتِ عملی سے



تعاون کے ساتھ ساتھ حکومت کے غلط کاموں کے خلاف مسیح کے نام میں احتجاج کیا ہو۔ اور اُس احتجاج کی عدمِ تعاون کے اقدام سے پشت پناہی کی ہو۔ اِس سلسلہ میں حکومت کی بیوقوفی جلسئہ عام میں ظاہر کرنے اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے تصوّراتی اشارے بہت حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جب کرسمس آئی لینڈ کے نزدیک ایٹمی تجربات کئے جانے والے تھے تو لارڈ رسل نے ایک نہایت اعلےٰ معنی خیز حرکت تجویز کی کہ غیر جانبدار قوموں کے بحری بیڑوں کو کھلے سمندر میں اکٹھا ہونا چاہیئے، جیسے کہ سمندر پر اُن کی آزادی کے اصولوں کے مطابق اُن کا حق ہے۔ تاہم امن پسندوں کے لئے یہ بالکل فضول ہے۔ کہ وہ ایسی معنی خیز حرکات کریں جن سے عوام کو بجائے امن کے لئے آمادہ کرنے کے غصّہ دلانے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ مسیحیوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے معنی خیز اشارے کرتے ہوئے پولیس اور دوسرے حکّام کا بھی خیال رکھیں جو احتجاجیوں کے ہجوم پر قابو پانے کے لئے اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ مسیحی لوگ صُلح کے حق میں ایسی قربانیاں کریں۔ جن سے حقیقی دکھ پیدا ہو جائے۔ مثال کے طور پر ہسپانوی خانہ جنگی میں چند رومن کاتھولک پریسٹوں نے ماس میں شریک ہونے سے انکار کیا تا کہ اُن کی کلیسیا فاسشتی آمروں سے تعاون کرنے کے خلاف احتجاج کرے۔

بعض مسیحی یہ محسوس کریں گے کہ شاید اُن کا ایسے مظاہروں میں حصّہ لینا مناسب ہے۔ اور بعض ایک کا خیال ہے کہ سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لمبے مذاکرات اور تخفیفِ فوج جیسے طریقوں سے امن قائم ہو جائے گا۔ اگر ہمارا یہ اعتقاد ہے تو ہمیں پیچیدہ

مسائل کو سمجھنے کے لئے بہت سی دقتوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا اور اگر کوئی یہ کہے کہ امن و جنگ کے فیصلے کرنا۔ صرف ماہرین کا کام ہے تو ہمیں شخصی طور اپنے ارادوں کو تبدیل نہیں کر لینا چاہیئے۔ یہ بجا ہے کہ ماہرین اطلاعات بہم پہنچانے میں مفید ہیں لیکن کلی طور پر اُن پر ایسے فیصلے چھوڑ دینے سے ہم اُن کے فریب میں آ سکتے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ وہ ایسے فیصلے کرنے میں ہم سے کہیں زیادہ عقلمند نہیں اور ایسے فیصلے کرنا اور اُن میں دلچسپی لینا ہم سب شہریوں کا کام ہے کہ اپنے دوستوں اور بچوں کو جنگ کی ناگہانی موت سے بچانے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

اشتمالیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مغربی دنیا میں سرمایہ داری نظام کی حکومتوں کو ختم کر دینے سے دنیا میں امن قائم ہو جائیگا لیکن مسیحیوں کا یہ نظریہ ہے کہ موجودہ حکومتوں کے ذریعہ سے امن قائم کرنے کے اب بھی امکانات ہیں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بغیر کسی انقلاب کے حکومتیں اپنے نظاموں میں ترمیمات کرنے سے امن قائم کرنے کیلئے تعمیری کردار ادا کر سکیں۔ غلامی کی برائی کو ختم کرنے کیلئے مسیحیوں نے صنعتی انقلاب کے موقع کو استعمال کیا اور یوں غلامی کو معاشرہ کے معاشی نظام کا کم اہم حصہ بنا دیا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی ایجاد سے وہی حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ جو کارکنوں کے لئے ویسا ہی موقعہ مہیا کر رہے ہیں جس سے وہ موجودہ دور میں امن کی خاطر کام کر سکتے ہیں۔ بہت سی حملہ آور قومیں مثلاً روس، کیوبا میں یا ریاستہائے متحدہ امریکہ، ویت نام میں ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے گریز کرنا چاہتی ہیں۔ اور ماضی کے لوگوں کی نسبت امن قائم کرنے کے انتظامات



کو قبول کرنے کے لئے زیادہ مستعد ہیں۔ مسیحیوں کا یہ فرض ہے کہ وُہ دُعا بھی کریں اور اپنے روشن خیالوں سے مدبروں پر زور دیں کہ وُہ ایسے انتظامات کے لئے کام کریں۔

## ۵۔ امن پسندی کیلئے حالات

گو مسیحیوں کی اکثریت نے جائز جنگ کی تصدیق کی ہے۔ اور انہوں نے حب الوطنی کے کردار کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ ایک با اُصول اور ایماندار مسیحی کو مسیح کے نمونہ اور اُس کی تعلیم کو مدِنظر رکھتے ہوئے جائز جنگ سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔ بعض امن پسند یہ تسلیم کرینگے کہ موجودہ شرائط کے تحت چند ایک حالات میں کوئی بھی حکومت یا تو اپنی رعایا کو بچانے یا معاہدوں کے فرائض کو پورا کرتے میں جو سنجیدگی سے سرانجام دیئے جائیں گے، مجبور ہوں گے۔ لیکن ان کا یہ نظریہ بھی ہوگا کہ تمام مسیحیوں کو عدمِ تشدد کے مسیحی معیار کی حمایت کرنی چاہیئے اور تمام دنیا سے عالمگیر برادرانہ محبت کی گواہی دینی چاہیئے۔ کیونکہ اُن کا یہ نصب العین معاشرہ کی بہتری کے لئے ہے۔ لیکن یوُں وہ جنگ کے خاتمہ کے لئے کوئی زیادہ عملی کردار ادا نہیں کرتے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وُہ معاشرہ کے لئے فرائض ادا کرنے کی نسبت اپنی ذاتی سالمیت کی اقدار کے خطرہ میں ہیں۔ لیکن اُن کا یہ رویّہ ہماری مسیحی خود انکاری سے بمشکل ہی ہم آہنگ ہے۔ تاہم انہیں اِس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ جنگ کی کوششوں میں ایسے تعاون میں ناکامی کے خلاف نہایت سختی سے قدم اٹھائیں۔ ہمیں امن پسندوں کی تعریف کرنا

چاہیئے کہ وُہ اپنے موقف کی خاطر تکلیف برداشت کرنے کے لئے
بھی تیار رہتے ہیں۔ لیکن یہ اُن کے شایانِ شان نہیں ہے، کہ اگر اُن
پر سزائیں عائد کی جائیں تو وُہ اِس کے خلاف احتجاج کریں۔ کیونکہ
اُن کا دُکھ برداشت کرنا ہی اُن کی حقیقی گواہی ہے۔

مسیحی امن پسند بغیر کتابِ مقدّس کی آیات پر تکیہ کئے جن کی اکثر
رُو اور اُن کے مخالفین ایک دُوسرے پر بوچھاڑ کرتے ہیں، اِس
معاملہ کو مستحکم طریقہ سے پیش کر سکتے ہیں۔ خود ہمارے خداوند نے ظلم و تشدد
اور بُرائی کا اپنا دُوسرا گال پھیرنے سے مقابلہ کیا۔ اور بُرائی کا بدلہ بھلائی
سے دیا۔ خاص کر اس نے اپنی اذیت اور صلیب کے دکھوں میں اپنے
دشمنوں کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اپنے
دشمنوں سے نپٹنے کے لئے اُسے فوق الفطرت طاقت بھی حاصل ہو
سکتی تھی (متی ۲۶ : ۳۳)۔ اور یسوع نے جب یہ مشورہ دیا کہ "شریر
کا مقابلہ نہ کرو" تو اُس کی معقول تشریح یہ ہے کہ وُہ اپنے شاگردوں
کو یہ نصیحت دے رہا تھا کہ وُہ حفاظتِ ذات کے لئے اپنے فطری
حق کو بھی استعمال میں نہ لائیں ..... یعنی اُس حق کو جو ایک جائز جنگ
میں بنیادی عنصر ہے۔ ایک غیر امن پسند مسیح خداوند کی تعلیم اور ذاتی
نمونہ کے لئے یہ جواب دے گا کہ اِن کا تو شخصی بُرائیوں سے تعلق
ہے۔ چنانچہ اس تعلیم کا قوموں کے جھگڑوں پر کسی قسم کا اطلاق نہیں
ہو سکتا۔ لیکن یہ جواب ہمیں معقول دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ جب ہم
خداوند یسوع مسیح کی تعلیم کی رُوح کا نوجوان مجرموں سے نپٹنے
پر اطلاق کرتے ہیں تو کوئی شخص بھی یہ رائے نہیں دے گا کہ
مجرموں کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ لیکن مسیحی اصولوں کا یہ تقاضا ہے
کہ ہم اُن کو سزا دینے کی بجائے ان کی اصلاح کریں۔ بعینہٖ کوئی



ایسا طریقہ ہونا چاہیئے جس سے ہم مقابلہ نہ کرنے کے لئے مسیح کی تعلیم کا
جنگ کے حالات پر بھی اطلاق کر سکیں۔ کوریا کی جنگ میں کلّی طور
پر اطاعت کے تقاضا سے دست برداری اور رہوڈیشیا کی بغاوت
سے نپٹنے کے لئے فوجی قوانین کی بجائے معاشی استعمال شاید مسیح
کی تعلیم کے اطلاق کا نہایت اچھا آزمائشی تجربہ ہے۔

مذہب امن پسندی کے خلاف سب سے زبردست دلیل یہ
ہے کہ ایک مسیحی باقی شہریوں کے ساتھ ایک شہری کے حقوق اور
آزادی کو قبول کرتے ہے، زندگی کے بقچہ میں بندھا ہوا ہے اور
جب جنگ کے وقت اُس کے لوگ انتہائی خطرہ میں ہیں تو کیا اُسے یہ
کہنے کا حق حاصل ہے کہ "ایک مسیحی کی حیثیت سے میں اُس بوجھ میں شریک
نہیں ہو سکتا، جو میرے دُوسرے ہم مُلک، اپنے وطن کی سالمیت اور بچاؤ
کے لئے برداشت کر رہے ہیں"؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک سرگرم ترین
امن پسند بھی با دلِ نخواستہ ہائیڈروجن بم کی تیاری کے لئے ٹیکس ادا کرنے
سے مجموعی جنگ میں حصّہ لیتا ہے۔ اور وُہ بھی اس سلسلہ میں اتنا ہی ذمہ دار
ہے جتنا کہ وہ شخص جو زمین پر بم پھینکتا ہے۔ یقیناً ہمیں ایک مسیحی کے لئے
بھی یہ کہنا ہے کہ گو اُسے جنگ کی صورتِ حال میں برائی کے لئے
احساسِ ندامت ہے، تاہم اُسے یہ بھی احساس ہونا چاہیئے کہ وُہ اپنے ہم مُلک
لوگوں کے شانہ بہ شانہ جنگ میں حصّہ لے اور ایسے ہی دُکھ برداشت
کرے۔ جیسے کہ وُہ دُکھ برداشت کرتے ہیں، ایسے ہی لڑنے جیسے کہ وُہ
لڑتے ہیں۔ مسیحیوں کا دُنیا کی زندگی اور دکھوں میں شریک ہونے کا
نظریہ، ضرور اس نظریہ کی حمایت کرے گا۔

# حصۂ سوم

# مسیحی طریقِ حیات

## سولھواں باب

# خُود انکاری

## ۱۔ مسیحی نیکی

مسیحی نیکیاں کافی حد تک وہی ہیں جو کسی بھی اچھّے اَور نیک شخص میں ہوتی ہیں، خواہ اُس کا تعلق کسی مذہب سے بھی کیوں نہ ہو۔ اَور خواہ وُہ لا مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مسیحی بھی، جیسے کہ یونانیوں کو اس کا علم تھا، انہی بنیادی اَور روایتی نیکیوں یعنی ضبطِ نفس، دانش، حوصلہ اور انصاف اور عالمگیر طور پر مسلمہ خوبیوں مثلاً سچائی، دیانتداری، پاکیزگی اَور محبت کو ظاہر کرے گا۔ مسیحی اخلاقیات پر کسی بھی درسی کتاب میں اِن اَور دُوسری خوبیوں کے متعلق ایک اور باب کا اضافہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں کسی قِسم کا شک نہیں کہ مسیحی ایمان میں ان میں سے ہر ایک اپنے آپ میں ایک خاص وسعت رکھتی ہے۔ درحقیقت مسیحی نیکی کے دو پہلوؤں یعنی خود انکاری اَور محبّت پر عہدِ جدید میں بہُت زیادہ زور دیا جاتا ہے یعنی یہ ایسی خوبیاں ہیں جن میں مسلّمہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک اَور خاصیّت اَور قوّت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس پر ہم اگلے باب میں



غور کریں۔

حقیقت تو یہ ہَے کہ اخلاق کو خواہ وُہ کتنا ہی اہم ہے مسیحی نظریہ میں کوئی ممتاز حیثیت نہیں ہَے۔ جتنی کہ غیر مذہبی معلمین اِخلاق نے عموماً زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے زور دیا ہے۔ مسیحی ضمیر نے بار بار نیکی اَور بدی کے مسائل کے لئے نہایت ہی محتاط تعلق کے خلاف احتجاج کیا ہے جیسے اناجیل میں بعض ایک یہودیوں کی فریسیت، یا بعض یسُوعی فرقہ کے لوگوں کی سوفسطائیت یا انگریز پیوریٹن لوگوں کی شریعت پسندی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہَے۔ ہم اس شخص کی طرح جو کُلّی طور پر اپنی خوشیوں کو ڈھونڈنے کے تعاقب میں ہے لیکن عموماً انہیں پانے میں ناکام ہو جاتا ہے، ایک متناقضانہ اُلجھن میں ہیں۔ اِسی طرح وُہ شخصی جسے اپنی انفرادی کاملیت کی فکر دامنگیر رہتی ہے اکثر بہُت کم ترقی کرتا ہے۔

تاہم ہمیں اس سے یہ مفروضہ قائم نہیں کرنا چاہیئے کہ مسیحی نیکی غیر ضروری ہے بلکہ ہمارا یہ مطالبہ ہَے کہ مسیحی نیکی کا طریقہ، نیکیاں پیدا کرنے کے طریقہ سے بالکل منفرد ہَے۔

## ۲۔ خُود پرستی

بہُت سے مسیحی مفکّروں کا یہ نظریہ ہَے کہ ایک معقول قسم کی خود پرستی کا مسیحی شخص کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہَے۔ اِس کے ثبوت کے لئے وُہ مسیح کے دو بڑے حکموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں سے دوسرا یہ ہے "تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبّت رکھ" اِس سے وُہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ خود مسیح خداوند نے خود پرستی کی تصدیق کی ہے۔

تاہم اپنے شاگردوں کو مسیح خداوند کی خود انکاری سے متعلق بار بار نصیحت ہمیں قائل کر دیتی ہَے کہ اپنی ذات سے محبت رکھنا اس کی

تعلیم کا لازمی حصّہ ہے۔ دوسرے حکم میں وہ احبار کی کتاب سے ایک قدیم قانون کا حوالہ دیتا ہے۔ (احبار ۱۹ : ۱۸) اور وہ یہ جانتا تھا کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے۔ اور اپنی بہتری کا خواہاں رہتا ہے۔ مقدس پولُس بھی اِسی حقیقت کو نہایت وضاحت سے یوں بیان کرتا ہے۔ "کیونکہ کبھی کِسی نے اپنے جسم سے دشمنی نہیں کی بلکہ اس کو پالتا اور پرورش کرتا ہے"۔ (افسیوں ۵ : ۲۹)۔ مسیح خداوند وہی کچھ کہہ رہا تھا۔ جو وہ حاضرہ کا ایک مبشر اکثر کہتا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر وہ اپنے سامعین کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ جیسے دولت سے انتہائی محبّت کرتے ہیں، ویسے ہی جوش سے وہ اس کی (مسیح کی) خدمت کریں۔ اور ایک دُوسرے موقع پر وُہ انسان کے عام رجحان یعنی اپنی زندگی میں دولت کو اوّل مقام دینے کے خلاف آگاہ کرتا ہے۔ اس طرح مسیح خداوند نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ وُہ اپنے پڑوسیوں سے ایسی ہی محبّت رکھیں۔ جیسے کہ وہ اپنی ذات سے رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اُس نے اُن کو خود پرستی کے فطری رجحان سے بھی آگاہ کر دیا۔ تھوماس آکینس نے مسیح کی تعلیم کو بالکل حقیقی طور پر اپنایا جیسے کہ اُس کے اِن الفاظ سے ظاہر ہے۔ "انسان کو چاہیئے کہ دُوسری سب چیزوں کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو بھی ترک کر دے۔۔ حتٰے کہ اپنی ذات سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اپنی ذات کی محبت کے سرمایہ میں سے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہونا چاہیئے"۔

فی الحقیقت عام اخلاقیات اور مسیحی اخلاقیات کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ ایک غیر مذہبی معلّم اخلاق نے جو یونانی روایات سے متاثر ہے، اکثر ایک نیک زندگی میں احساسِ ذات کو



اوّل مقام دیا ہے۔ اور مسیحی مفکروں نے کبھی کبھی اِسے بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیا ہے۔ ایسا کرنا بالکل آسان رہا ہے۔ کیونکہ یہ درست مسیحی تعلیم ہے کہ جیسے توڑوں کی تمثیل میں سکھایا گیا ہے، انسان کو چاہیئے کہ وُہ خدا اور بنی نوع انسان کی خدمت میں اپنی قدرتی صلاحیتوں کو احسن طریقہ سے استعمال میں لائے۔ اور اور اگر وہ اُن کی حفاظت کر کے اُن کو چمکاتا نہیں تو وہ کس طرح انہیں مناسب طور پر استعمال کر سکتا ہے؟ مسیحی خود مختاری کے اصول کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے اور اپنے تعلیمی موقعوں کو استعمال میں لاتے ہوئے معاشرہ کے لیے بہترین خدمات پیش کرے لیکن یہ طرف دیگر خود پرستی اور احساسِ ذات کی کوشش سے خطرناک نتائج ہی برآمد ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اختلاف یہاں پر ہے کہ مسیحی لوگ اِن کاموں کو اپنی شخصی محبت سے نہیں بلکہ اس محبت سے سرانجام دیتے ہیں جو وہ خدا سے رکھتے ہیں

ہم اس نظریہ کو مختلف گروہوں کے لوگوں کے نظریات میں اوّلیتوں کے موازنہ سے واضح کر سکتے ہیں۔ ایک جسمانی شخص جیسے کہ دوسرے حکم کے الفاظ ہمیں یاد دلاتے ہیں اپنی ذات کو پہلے رکھتا ہے اور دُوسرے لوگوں کو بعد میں اور عموماً یہ خیال کرتا ہے کہ خدا تو ایک مبہم سی ہستی ہے جو اُس سے کہیں دور ہے اور اس سے براہ راست اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ دوسری طرف دین انسانی کا پیرو دوسرے لوگوں کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دیتا ہے حالانکہ وہ خدا کی ہستی کو بالکل فراموش کئے ہوئے ہے۔ ایک مذہبی آدمی کی طرح دوسرے مذاہب کے استادوں نے بھی خدا کو اوّل مقام دیا ہے اور بعد میں اپنی ذات

گو بیگن اکثر دوسروں کے مطالبات کو بھول جاتے ہیں منطقیانہ طور پر اُن کا ہندو دانشوروں کی طرح یہی نظریہ ہے کہ خدا کو انسانی ذات کی گہرائیوں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن اِن کے مقابلہ میں مسیحیوں کی اولیتیں بالکل واضح ہیں کہ خُدا کا اولیّن مقام ہے۔ اور بعد ازاں دُوسرا درجہ انسان کا اور انسان کی خُودی کی کوئی وقعت نہیں۔

## ۳۔ خودانکاری کا مفہوم

ہمارے خداوند کی اخلاقی نصیحت حتیٰ کہ محبّت کے حکم سے بھی زیادہ جس امر کا اناجیل کے بیانات میں بار بار ذکر پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی خودی سے انکار کیا جائے۔ "اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے۔ اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے" (مرقس ۸: ۳۴، متی ۱۰: ۳۸، ۱۶: ۲۴ لوقا ۹: ۲۳، ۱۴: ۲۷، مقابلہ کرو یوحنا ۱۲: ۲۵)۔ یہاں پر جو فعل استعمال کیا گیا ہے وہ "عیش وعشرت سے اجتناب" کے معنوں میں نہیں بلکہ وُہ فعل مستعمل ہے جب پطرس نے انکار کیا کہ وُہ اپنے خُداوند کو نہیں جانتا (مرقس ۱۰: ۳۰) اور ہمارے خُداوند کی اُس پیشن گوئی میں بھی جہاں اُس نے یہ کہا کہ جو کوئی زمین پر اُس کا انکار کرے گا۔ وُہ خُدا کے فرشتوں کے سامنے اُن کا انکار کرے گا۔ (لوقا ۱۲: ۹)۔ اِس جملہ سے یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص اپنی خودی اور اپنے ذاتی مفادات کو اتنی کم اہمیت دے کہ ہم کہہ سکیں کہ وہ تو اپنے وجُود کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔



مسیحی مفکرین نے یہ محسُوس کیا ہے کہ ضرورت ہے کہ اِس حُکم کے لئے جو انسان کی فطری طور پر خُودپرستی کے متضاد ہے، کوئی نہ کوئی جواز پیش کیا جائے۔ لیکن ہم مسیحیوں کے لئے یہ حقیقت کہ یہ مسیح خداوند کا حکم ہے۔ ایک موزوں جواز ہے۔ دونوں بڑے حکموں میں سے دُوسرا "تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ"۔ اِس امر کی دلیل پیش کرتا ہے کہ ہم اپنی خودی سے اس لئے انکار کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے دُوسرے پڑوسیوں کے لئے بھلائی کے کام کر سکیں۔ ٹومفر نے اِس سے متعلق یُوں لکھا "خُدا کا حکم ہمیں اپنے پڑوسی کے پاس جانے کیلئے مجبُور کرتا ہے ..... ہر ایک کو اپنے پڑوسی کا روپ دھار لینا چاہیئے اور دُوسرے کے لئے وُہ ایک ایسا طریقِ عمل اختیار کرے جیسے کہ وُہ خُود دُوسرے کی جگہ پر ہے"۔ تاہم صرف پڑوسیوں کے لئے خود انکاری کے عمل سے مسیحیوں اور دینِ انسانی کے پیروکاروں کے درمیان کوئی فرق نہ رہے گا۔ کیونکہ وُہ بھی تو اکثر دوسروں کے فائدہ کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ تاہم خود انکاری کے لئے یہ حُکم ایک اچھا مسیحی محرّک ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے خداوند کی خود انکاری کے لئے بلاہٹ اور نہ ہی پُولس رسُول کی اپنے اعتبار سے مر جانے اور مسیح کے ہم میں زندہ رہنے (گلتیوں ۲: ۲۰) کی تعلیم میں پڑوسی کا کوئی حوالہ ہے۔

غیر مذہبی معلمین اخلاق نے یُونانی روایات کی تقلید میں خود انکاری پر احساسِ ذات کے لئے ایک وسیلہ کی حیثیت سے بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ایک پہلوان کا اپنے جسم پر ضبط اس کی جسمانی

CamScanner

کاملیت کا وسیلہ ہے اور ایک ہندو تیاگی کی ریاضت شاید اس کے لئے روحانی فضیلت کا باعث ہو۔ لیکن مقدس پولس کا وہ بیان جہاں وہ اپنے جسم کو مارنے اور کوٹنے را۔ کرنتھیوں ۹: ۲۹) کے متعلق بتاتا ہے۔ اِس بات کو واضح کرتا ہے کہ مسیحی زندگی میں ایسے عمل کے لئے کچھ گنجائش ہے۔ ایک عورت نے جو خود بھی راہبہ رہ چکی تھی۔ لکھا کہ "ریاضت کا یہ اثر نہیں تھا کہ میں نے اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کو دبایا بلکہ میری خودی اس لئے میرے قابو میں تھی کہ میں نے خود انکاری کے لئے پیہم عمل کیا" ہمارے خداوند کا یہ بالکل درست خیال تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو اُن کے کاموں کا اجر دے گا۔ اور انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ وہ شخص جو اُس کی اور انجیل کی خاطر اپنی جان کھوئے گا۔ وہ اسے پائے گا (مرقس ۸ : ۳۵)۔ تاہم یہ اس نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ جو یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ خود انکاری کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ احساسِ ذات کو حاصل کرنے کا سب سے بہترین وسیلہ ہے۔ اور اگر ہم اس نظریہ کو قبول کر لیں تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ ہماری محبت کا محور خدا نہیں بلکہ ہماری ذات ہے۔ دورِ حاضرہ کا دینِ انسانی کا ایک پیرو جب یہ لکھتا ہے کہ "کلی طور پر میرے لئے کون سی زندگی سب سے زیادہ پُر سکون ہے" اور پھر مسیحیوں سے یہ بھی توقع کرتا ہے کہ وہ اِس معاملہ میں اُس سے متفق ہوں تو یہاں پر وہ مسیحی اخلاق میں خود انکاری کے مقام کو بالکل نظر انداز کئے ہوئے ہے۔

خود انکاری کے لئے بائیبل میں سب سے بہترین اور معقول وجہ یہ ہے کہ ہم مسیح خداوند اور انجیل کی خاطر جان دینے تک



تیار رہیں (مرقس ۸ : ۳۵)۔ لیکن اس کے لئے افادیت پسندی کی اخلاقیات کی اصطلاحات میں ایک سادہ ترین وجہ بھی نہیں دی جا سکتی۔ بظاہر ہم خدا اور مسیح خداوند کو اپنی خود انکاری سے اُس صورت میں فائدہ نہیں پہنچاتے جس طرح کہ ہماری اپنی ذات اور ہمارے پڑوسی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ خود انکاری کے لئے ہمارے خُداوند کا حکم اس وقت بھی قائم ہے جب کہ بظاہر ہم یہ نہ دیکھ سکیں کہ یہ کسی طرح بھی انجیل کی اشاعت یا خُدا کے جلال کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ خود انکاری ہی میں ساری مسیحی اخلاقیات پوشیدہ نہیں بلکہ یہ تو مسیحی اخلاقیات کا ایک لازمی جزو ہے جو محبت کو محض جذباتیت سے خراب ہو جانے سے بچاتی ہے۔ اور اُن مسیحی مفکروں کی عقلی اور انسانی محبت کے لئے ایک ذہنی اِصلاح کُن کی طرح کام دیتی ہے..... اُن مفکروں کے لئے جن کا دورِ حاضرہ میں یہ تقاضا ہے کہ ہم اُس نیکی کو جو ہمارے خداوند کے کسی خاص حکم کی تابعداری سے حاصل ہوتی ہے، خود پہنچائیں، کیونکہ اِس لحاظ سے خود انکاری مسیحی محبت سے مختلف ہے۔ بہت سے لوگ خواہ وہ ایماندار ہوں یا بیدین ہوں اِس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسیحی محبت انسان کو معاشرہ کی بہبودی کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن بہت کم لوگ خود انکاری کی تصدیق کرتے ہیں سوائے اُن حالات کے جہاں اِس کے نتائج سے انسان کو جو اِسے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے عمل میں لاتا ہے، براہِ راست فائدہ حاصل ہو۔

## ۴ فروتنی

خود انکاری کا سب سے پہلا تو یہ مطلب ہے کہ اپنی ذات
کے متعلق سب غلط مطالبات کا انکار کیا جائے اور اِس میں نہ صرف
ذاتی مجبوریوں کا اعتراف بلکہ انسان کے خدا سے صحیح تعلقات
بھی شامل ہیں۔ یہ ایک ایسی فروتنی ہے جو انسان کے گناہوں سے
ہٹ کر، اُن میں نہایت مناسب ہے۔ کیونکہ انسان کا مخلوق ہونے
کی حیثیت سے اپنے خالق پر پورا انحصار ہے۔ اور اس کی معقول
خدمت یہ ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے تابع رہے۔ یہ امتیازی
قسم کی فروتنی ہمارے خداوند یسوع مسیح میں تھی جو بالکل بیگناہ تھا۔
ہم میں یہ اعتراف ہونا چاہیئے کہ ہم انفرادی طور پر گنہگار ہیں۔
اور سب بنی نوع انسان کے اجتماعی گناہ میں بھی شریک ہیں۔ حتیٰ کہ
ہماری بہترین سے بہترین تمنائیں اور کامیابیاں بھی گناہ سے
بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ تسلیم کرنا کہ ہم گنہگار ہیں۔۔۔ بیداری کی کسی
میٹنگ میں جذباتی توبہ کا نہیں بلکہ لالچ اور خود غرضی جیسے گناہوں
کے مقابلہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقدس برنارڈ نے کہا کہ فروتنی کا یہ
مطلب ہے کہ ہم اپنی ذات کی حقیقت سے واقف ہیں۔ بہت
معلمین اخلاق محض ریاکاری کی انکساری یا اُن مسیحیوں کی بددیانتی
کے لئے ملامت کرتے ہیں حق بجانب ہیں جو دُنیاوی زندگی میں تو
اپنے لئے بہت اچھی رائے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور کلیسیا میں
اقرار بھی کرتے ہیں کہ اُن کے گناہوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت
ہے۔ لیکن یہ سب دکھاوے کے لئے کرتے ہیں۔ جیسے کہ سی۔ ایس
لوئیس اسے بیان کرتا ہے کہ مسیحی فروتنی کا یہ مطلب نہیں کہ



"خوب صورت عورتیں جھوٹ موٹ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں
کہ وہ بدصورت ہیں اور ہوشیار اور چالاک آدمی یہ ظاہر کریں کہ وہ
تو دیوانے ہیں۔

ایک مسیحی دو طرح سے فروتنی سیکھ سکتا ہے۔ سب سے پہلے وہ
مسیح خداوند سے اپنے شخصی تعلقات سے فروتنی سیکھتا ہے۔ کیونکہ یہ
ہمارے خداوند کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ شخصی تعلقات ہی
تھے جن سے وہ لوگ اِس حقیقت سے آگاہ ہو گئے کہ وہ اپنے آپ
کو پہنچانیں۔ بعض اوقات یہ مسیح کی پاکیزگی کی موجودگی میں ادراک
کی روشنی سے آتی ہے جیسے کہ مقدس پطرس نے تعجب سے کہا "اے
خداوند! میرے پاس سے چلا جا کیونکہ میں گنہگار آدمی ہوں" (لوقا ۵: ۸)
یا جیسے کہ زکائی نے محسوس کیا کہ مسیح کی موجودگی اس سے تقاضا کرتی
تھی کہ اس نے جو زائد محصول لیا ہے اس کی تلافی کرے (لوقا ۱۹: ۱-۹)
یہ بعض اوقات بیباک ملامت سے پیدا ہوئی مثلاً جب یسوع
نے پطرس کو شیطان کہہ کر پکارا (مرقس ۸: ۳۳)۔ یا جب اس نے
سامری عورت کی حالت کے متعلق صاف صاف حقائق بتا دیئے۔
(یوحنا ۴: ۱۷)۔ یہ بعض اوقات مزاحیہ انداز سے بھی پیدا ہو سکتی
ہے۔ مثلاً جب یسوع نے اپنے شاگردوں کو "گرج کے بیٹوں" کا
لقب دیا (مرقس ۲: ۱۷)۔ چنانچہ اب بھی مسیحی مبلغوں کا فرض
ہے کہ وہ اناجیل کے یسوع کو اس طرح پیش کریں کہ اُن کے
سامعین اُس کی پاکیزگی کی روشنی میں اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے
فروتنی سیکھیں۔

فروتنی سیکھنے کے لئے ایک اور طریقہ ہے جس پر بہت کم مذہبی
رنگ غالب ہے۔ تاہم ہمارے زمانے کے لئے بہت مفید ہے۔

وہ طریقہ یہ ہے کہ ہم دیانتداری سے پہنچائیں کہ ہماری انسانی کامیابیاں محدود ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ایسے دور میں بھی جب کہ انسان نے سائنس اور علمِ صنعت و حرفت سے قدرت پر ایک نیا ملکہ حاصل کر لیا ہے اور جس میں اُس نے ایک ایسا فہم و ادراک حاصل کیا ہے جس سے وہ علمِ نفسیات کے ذریعہ سے اپنے ذہن کی حالتوں کو سمجھ لیتا ہے۔ ایسی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم ایسے حقائق سے دوچار ہیں کہ دورِ حاضرہ میں بہ نسبت کسی بھی گذشتہ صدی کے غالباً جنگ سے بہت زیادہ قتلِ عام ہوا ہے۔ نیز ذہنی بیماری کی تعداد بڑھ چکی ہے اور مغربی ممالک میں جیلوں کو خالی کرنے کے عرصہ کے بعد خاص کر نوجوانوں میں ظلم و تشدد جیسے جرائم بڑھ گئے ہیں۔ گو ہمیں یہ نہیں چاہیئے کہ موجودہ سائنس اور علمِ طب کے حصولات نے انسان کو جو عظیم فائدے بہم پہنچائے ہیں اُن کا کم اندازہ لگائیں۔ بلکہ ہماری ناکامیوں کو ہمیں بہت زیادہ فروتن بنا دینا چاہیئے اور ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار رہیں کہ ہم اپنی اخلاقی قوت سے نہیں۔ بلکہ خُدا کے فضل سے اپنی صنعتی کامیابیوں کا درست استعمال کرنے کے قابل ہوں گے۔

## ۵۔ فرمانبرداری

مسیحی خود انکاری کا ایک یہ حصہ ہے کہ فرمانبرداری سیکھی جائے۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس مسیح خداوند کا نمونہ ہے جس نے "دُکھ اُٹھا اُٹھا کر فرمانبرداری سیکھی" (عبرانیوں ۵: ۸)۔ ایک راہب کیلئے فرمانبرداری کا اصول مقدم ہے "جب کسی بالادست کی طرف سے کوئی حُکم دیا جاتا ہے تو راہب یوں سمجھے جیسے کہ یہ خُدا کی طرف سے



حکُم دیا گیا ہے۔ اور اس کی تعمیل میں کوئی تاخیر نہ کرے۔" افسیوں کے خط سے آگے ایک مسیحی کو مسیح کے سپاہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور سپاہی کا یہ کام نہیں کہ وہ "کیوں" کا سوال کرے بلکہ فرمانبردار رہے۔ جنرل بُوتھ نے اِس تصوّر کو نہ صرف جاذبیت بخشی ہے بلکہ مکتی فوج کی تنظیم سے ایک ایسا اچھا عملی تاثر پیش کیا ہے کہ انگریز لوگ جو سپاہی کی جنگ میں مصروفیت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اُن گیتوں کو بھی پسند کرتے ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "ہم مسیح کے سپاہی ہیں یا وُہ گیت جس میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ "یسُوع کے سپاہی جنگ میں قدم مارو"۔ مسیحیوں کا اس کے بارے میں اختلاف رہا ہے آیا کہ راہب خانہ میں اپنے اعلیٰ حاکموں، یا کلیسیا کے حکم یا کتابِ مقدس میں خُدا کے پُر اسرار مشوروں یا اپنے دلوں میں روح القدس کی باطنی آواز کی تعمیل کریں۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ خُدا کی مرضی معلوم کر کے اُس کی فرمانبرداری کی جائے۔

سکاٹ لینڈ کے ایک کسان کے بارے میں ایک سبق آموز کہانی بتائی جاتی ہے۔ کہ جب ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں کی پریسبیٹرین کلیسیا کے دو مخالف فرقوں کو متحد کر دیا۔ تو اُس کسان نے بہت سوچ و بچار کے بعد کہا "یہ درست تو نہیں...... اور معقول بھی نہیں...... خیر یہ خُدا کی مرضی ہے"۔ یہ ایک حقیقی اور مسیحی نظریہ ہے کہ زندگی میں ایسے حالات بھی ہیں جن میں ہماری قوتِ دلیل جیسے کہ فرائیڈ کے حامی بتاتے ہیں۔ اس خطرہ میں ہے کہ یہ غیر شعوری محرکات سے بھٹک جائے کیونکہ ایسے لمحات میں یا تو یہ ہماری بالکل راہنمائی نہیں کرتی یا پھر اس طرح سے ہماری راہنمائی کرتی ہے جسے ہم اپنے دل میں غلط خیال کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک مسیحی کو چاہیئے کہ وہ خُدا کے احکام کو سُن کر اُن پر عمل کرے۔ یہ ممکن

ہے کہ یہ احکام مختلف لوگوں کو مختلف طور سے دیئے جائیں لیکن ایک مسیحی اپنی خواہشات کا انکار کرتے ہوئے خدا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ مرتد راہب مارٹن لوتھر نے ڈائٹ آف وارمز کے موقع پر یہ کہا "کہ میرا یہ مقام ہے.... اور اس کے علاوہ میرا اور کچھ بھی نہیں"۔ درحقیقت جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اس وقت وہ اوگسطینی راہب خانہ کے جسے اس نے چھوڑ دیا تھا، ایک اعلیٰ ترین راہب کی سی فرمانبرداری کا کام سرانجام دے رہا تھا۔

## ۶۔ خود فراموشی

اپنے مخصوص معنوں میں خود انکاری کا یہ مطلب ہے کہ اپنی ذات اور اپنے شخصی مفادات کو نظرانداز کر دیا جائے۔ ہم اسے تمام گفتگو میں "خود فراموشی" کہہ کر پکارتے رہے ہیں۔ خود انکاری کا یہ مطلب نہیں کہ لینٹ کے دنوں میں یا اس کے بعد مٹھائی یا سگریٹ نوشی کو ترک کر دینا۔ نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ علی الصباح اٹھنے اور روزہ رکھنے جیسی ریاضت کو عمل میں لانا، جس کا مسیحی زندگی میں شاید کہیں اور کچھ مقام ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہ اپنی ذات اور اس کی اپنی روحانی زندگی کے لیے غیر ضروری حد تک سوچ و بچار ہو لیکن یہ خود انکاری کے نظریہ کے متضاد ہے جیسے کہ روحانی راہنماؤں نے محسوس کیا ہے۔ ایسی قسم کی ریاضتوں سے انسان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح ریاضت کرنے والا شخص خدا کی بجائے اپنی قربانی میں پناہ حاصل کرتا ہے۔ نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے جیسے کہ بعض رومن کاتھولیک ماہرین علم الٰہیات کا خیال ہے کہ معاشرتی زندگی اور خاندانی تعلقات کو ترک کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض مشنری لوگ اپنی ضمیر کی آزادی کے تحت اِن چیزوں کو چھوڑ دیں لیکن یہ عمل پھر بھی



خود انکاری کے عمل سے کہیں بعید ہے۔ اکثر ہم کلیسیا کی کونسلوں میں اپنی مرضی کو منوانا چاہتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو ہم اسے اپنی ہتک خیال کرتے ہیں لیکن یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہم نے درحقیقت خود انکاری نہیں سیکھی۔ اسی طرح مالی مشکلات کے وقت کلیسیا کے کسی کام کو خواہ بند ہی کیوں نہ کر دیا جائے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو ہمارا ذاتی کام نہیں۔ اور اکثر ہم اپنے ماتحت ہم خدمتوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ہمارے نظریات کے جو ہمارے طویل تجربات سے قائم ہوئے ہیں، ان کے ماتحت رہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خود انکاری کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی دولت کو چھوڑ دیا جائے۔ تاہم اِس قسم کی نفس کشی کو بعض لوگ چند ایک دوسری وجوہات کی بنا پہ اپنی روحانی ترقی کے لئے عمل میں لا سکتے ہیں۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ یہ ہماری خود فراموشی کے لئے بعض اوقات مدد کا باعث ہو۔ لیکن یہ بذاتہٖ خود انکاری نہیں کہلا سکتی۔

خود فراموشی کے لئے "مسیحی محبت کی دافع قوت" ایک بہترین وسیلہ ہے۔ حتیٰ کہ مسیحیت کے باہر بھی تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں یعنی پیریکلیس سے لے کر گاندھی تک اعلیٰ سبب کے باعث کسی حد تک خود فراموشی کو اختیار کیا۔ تاہم ایک ایسے شخص کے لئے یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ اپنے سبب کو اپنی ذات سے اس طرح نہ ملا لے کہ ایک تنقید کرنے والا شخص یہ شک کرنے لگے کہ اس کے اپنے سبب کے جذبۂ ایثار میں وہ اپنی بڑائی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ذات سے محبت کا دلدادہ ہے۔ یہ ایک سرگرم مسیحی کارکن کی ایک خاص آزمائش ہے کہ وہ بڑے جوش سے مسیح اور انجیل کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے لیکن اُس کے جوش و خروش سے یہ تحریک پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ تو مسیح خداوند کا نہیں بلکہ

اُس کا اپنا کام ہے۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ مقدس پولس نے بھی جو مسیح کے ہم خدمتوں میں سب سے اعلےٰ تھا، زندگی کے ایک ایسے مرحلہ پر یہ مشکل محسوس کیا کہ وہ اپنی خدمت میں اپنے آپ اور اپنی عزت کو اتنا اہم مقام نہ دے۔ تاہم قید کے خطوط سے یہ ظاہر ہے کہ بوڑھا پولس اپنی ذات کو یہاں تک فراموش کر چکا تھا کہ اُسے تو اب صرف مسیح یسوع کا خیال تھا۔ یہ خدا کے فضل کا کام تھا کہ اُس نے پولس جیسے مزاج کے شخص کو خود فراموشی کا درس دیا۔ حالانکہ یہ اس کی اپنی کوششوں سے بالکل ناممکن تھا۔ خود فراموشی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم خدا اور انسان سے پورے دل سے محبت رکھیں۔ اِس کا ہم اگلے باب میں ذکر کریں گے۔

## ۷۔ صلیب اٹھانا

خود انکاری عہدِ جدید میں فروتنی، فرمانبرداری اور خود فراموشی سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ مسیح خداوند کا اپنے ہونے والے شاگرد کیلئے یہ چیلنج ہے کہ "وہ اپنی خودی سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے"۔ (مرقس ۸: ۳۴)۔ صلیب اٹھانا یہاں پر خود انکاری کے ایک لازمی جز اور مسیحی ضبط کی ایک لازمی شرط کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مقدس پولس تو اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور کافی حد تک اس کا تعلق اُس واقعہ سے ہے جو کلوری پر رونما ہوا۔ "ہم مسیح کے ساتھ مر گئے" (رومیوں ۶: ۸)۔ "میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں اور اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے۔" (گلتیوں ۲: ۲۰)۔

ہم مسیح کی صلیب پر اِس لئے فخر کرتے ہیں کہ اس میں مسیح کی موت اور گناہ



پر شاندار فتح کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ نظریہ تو یوحنا کی انجیل سے پہلے ہی شروع ہو چکا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مسیح خداوند کو صلیب پر چڑھایا جائیگا جس کا اُس کی سربلندی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن جب یسوع نے مبارک جمعہ سے پیشتر اپنے شاگردوں کو اپنی صلیبیں اٹھانے کی بار بار دعوت دی تو اُس وقت صلیب ایسی قابلِ فخر شئے نہیں تھی جیسے کہ مسیحی فنکاروں اور شاعروں نے اسے اب بیان کیا ہے اور جب وہ اس سلسلہ میں صلیب اٹھانے کے متعلق کہہ رہا تھا تو اُس کے شاگردوں کے خیالات ضرور جابر مجرموں یا متعصب زیلوتیسیوں کے مقابلہ کی طرف منتقل ہو جاتے ہوں گے جو اپنی آخری اور ذلت آمیز راہ پر بھاری صلیب کو یعنی اپنے پھانسی کے آلہ کو لے کر جا رہے ہوتے۔ ہمارا خیال بھی ہٹلر کے زمانے میں جرمنی کے یہودی لوگوں کی طرف مائل ہو سکتا ہے جو مجبوراً داؤد کے ستارے کی علامت کے طور پر پہلے امتیازی نشان کو اوڑھے ہوتے جب انہیں اجتماعی پھانسی کے لئے مقتل کی طرف لے جایا جاتا۔ مسیح یسوع نے اپنے شاگردوں کو اس قسم کی تکلیفیں اور دُکھ برداشت کرنے کی پیش کش کی۔ جب یسوع نے اپنے زندہ ہونے کی پیشنگوئی کی تو شاگرد اسے بالکل نہ سمجھ سکے کیونکہ اس وقت اُن کے سامنے خوشی کی کوئی رویا نہ تھی۔ ایسٹر سے پہلے صلیب کے تصور میں صرف موت کے معنے پوشیدہ تھے اور آج کل بھی ہر ایک مسیحی کے تجربہ میں شہادت کا امکان ہے۔

شہادت کی موت سے پیشتر پولس نے جب وہ پرجوش زندگی بسر کر رہا تھا، لکھا کہ "میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا۔" ہم اِس آیت کا زور بیان اِس تشریح سے کم کر سکتے ہیں کہ اِس کا یہ مطلب ہے کہ ہم میں گناہ آلود عناصر مر جائیں، ہاں البتہ رومیوں کے چھٹے باب کے متعلق اِس آیت کا یہی مطلب ہونا چاہیئے۔ لیکن اِس سے یہ بھی مراد ہے کہ

"ہماری شخصیت پورے طور سے موت کے تجربہ میں سے گذرے۔"
اور اِس تشریح کے لئے یہ سبب پیش کیا جائے گا کہ ہماری فطرت
گناہ سے اِس قدر لبریز ہے کہ اِسے ضرور مرنا اور دفن ہونا ہے۔
حتیٰ کہ یہ ظاہر ہونے لگے کہ اِس کے وجود سے بالکل انکار کیا جا
چکا ہے۔ تاہم جیسے کہ ہمارے خداوند کی تعلیم سے ظاہر ہے (لوقا
۱۱: ۲۶) اگر ہم شیطان کو جو خودی ہے نکالیں تو ممکن ہے کہ ہم روح
کے گھر کو خالی چھوڑ دیں اور اِس سے سات بدترین شیاطین اس
پر قبضہ کر لیں۔

پس خود انکاری جو حقیقتاً بہتر ہے، ضرور ہے کہ وہ مسیح کے لئے
ہمارے دل میں جگہ پیدا کرے۔ لیکن یہاں پر ہم اخلاقیات کے دائرہ
سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اپنی صلیب اٹھانا محض مسیح کے جذبۂ ایثار
کی اخلاقی تقلید ہی نہیں اور نہ ہی مسیح خداوند کی موت کے ذریعہ اپنے
آپ میں ایک نئی اخلاقی قوت حاصل کر لینے اور نہ ہی ایک تارک الدنیا
کی طرح جسمانی طور پر ذلّت برداشت کر کے مسیح کے دکھوں میں شریک
ہونے سے اپنی صلیب اٹھائی جا سکتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اِن
تمام چیزوں کا مسیحی عمل میں ایک خاص مقام ہو۔ لیکن انہیں پولُس
کے مسیح کے ساتھ مصلوب ہونے کے تجربہ میں شامل نہیں کیا جا
سکتا۔ کیونکہ یہ ایک تجربہ ہے "اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ
ہے"۔ اِس کا مطلب ہم آخر میں بیان کریں گے۔

مسیحوں کی خود انکاری کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کلیسیا کی مشین میں
محض ایک دندانہ ہے یا مسیح کے بدن میں دوسرے لاکھوں خلیوں
میں سے ایک خلیہ ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال ہے تو اِس طرح ہم کلیسیا
کے لئے وہ غیر شخصی خوبی منسوب کرتے ہیں جو ہماری اخلاقی جبلّتِ



اجتماعی ریاست یا موجودہ سرمایہ داری کے نظام کی بہت وسیع صنعتی
یونٹ کے متضاد ہے۔ ہمارا یہ درست اعتقاد ہے کہ وقت کا تقاضا
ہمارے انفرادی اختلافات کو دور نہیں کر سکتا۔ لیکن مختلف اشخاص
کی خصوصیات کی ترقی کا باعث ہے۔ لیکن یہ تو کچھ خود انکاری
کی نسبت احساسِ ذات کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی دو شرائط
ہیں۔ جس قدر کوئی شخص مسیح کے بدن یعنی کلیسیا کی خدمت اور محبت
میں اپنے آپ کو نظر انداز کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس کے اپنے
ذاتی احساس اور تکمیل کے حقیقی امکانات ہوں گے "جو کوئی اپنی
جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا
ہے اُسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۹)۔ مسیحی معاشرہ میں ہمارا یہ
نصب العین ہونا چاہیئے کہ صنعتی، سیاسی اور معاشرتی گروہوں
میں کلیسیائی زندگی منعکس ہو۔ ساتھ ہی کلیسیا میں افراد کی اہمیت،
ننھے بچوں کی اہمیت کی مانند ایک ایسی شے ہے جس سے خود
ایک شخص بالکل بے خبر ہے۔ اگر ہماری دلیل درست ہے تو ایک
مسیحی کی خود انکاری اس پر مبنی نہیں کہ وہ کچھ کرتا ہے بلکہ اس پر کہ
جو کچھ مسیح نے اس کی خاطر وہ اُسے قبول کرتا ہے۔ حتیٰ کہ کلیسیا میں بھی
ہم صرف اِس صورت میں اپنی خودی کا انکار کریں گے جب ہم مسیحی
نعمتوں میں اسے سب سے بڑی نعمت سمجھ کر قبول کر کے کس
طرح محبت رکھیں۔ اور اُس وقت جب خدا کی محبت ہمارے دلوں
میں ڈالی جاتی ہے، ہم حقیقی مسیحی طریقہ سے اپنی ذات کا انکار کرتے
ہیں۔

# سترہواں باب

# محبّت

## ۱۔ محبّت کی اقسام

یُونانی زبان میں پانچ ایسے الفاظ ہیں۔ جن کا ترجمہ "محبت" کیا جا سکتا ہے۔ اور ہم انہیں محبّت کی مختلف اقسام کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

(ل) لفظ اِپتھومیہ کا "آرزو" یا بعض اوقات "شہوانی خواہشات" جیسے الفاظ سے نہایت موزوں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ ہماری تمام قسم کی عموماً جبلی خواہشات اور بعض اوقات خصوصاً شہوانی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ جب مسیح یسُوع اپنے شاگردوں کے ساتھ فسح کھانے کا آرزومند (لُوقا ۲۲ : ۱۵) تھا تو اُس وقت اُس نے اِپتھومیہ سے متعلقہ فعل استعمال کیا اور خداوند نے اُس وقت بھی یہی فعل استعمال کیا۔ جب اُس نے کسی شخص کو کسی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھنے سے منع کیا (متی ۵ : ۲۸)۔ اِپتھومیہ ایک فطری خواہش ہے جو محبّت کی دُوسری اقسام کے لئے بنیاد کے طور پر ہے۔ یہ بذاتہٖ انسانی فطرت کی حقیقت ہے جو اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہے۔ لیکن جیسے کہ اِس سے شہوانی خواہشات کے معنی اخذ کئے جاتے ہیں، یہ بدکرداری



کی مستوجب ہے۔

(ب) 'ایراس' کافی حد تک غیر مذہبی یونانی ادب میں محبت کیلئے ایک عام لفظ ہے۔ لیکن عہدِ جدید میں یہ کہیں نہیں پایا جاتا کیونکہ عموماً مخلف جنسوں کی محبت کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ 'ایراس' کی نظر قدر و قیمت پر ہوتی ہے اور خاص کر اُس چیز کی خوبصورتی کو دیکھتی ہے جس سے محبّت کی جاتی ہے، خواہ یہ خوبصورتی فطری ہو یا مصنوعی اور خواہ یہ حقیقی جوہر کو پیش کرے۔ لیکن 'ایراس' کو بدصُورتی اور غیر دلکش چیزوں میں کبھی بھی محسوس نہیں کیا جاتا۔ 'ایراس' میں ملکیتی اور محو بالذات کے معنی پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ محب اپنی محبوبہ اور کسی دُوسری شئے کو جس سے وُہ محبت کرتا ہے، اپنی ملکیت بنا کر صرف اپنی ہی ذات کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور 'ایراس' میں حاصل کرنے کا نہ کہ دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔ تاہم 'ایراس' محبت کی بہت ہی پرشوق اور پُرجوش قسم ہے کیونکہ محبت کرنے والے کے دل میں محبت کے جذبات کا طوفان اُمڈ آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ وجد آفرین خوشی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یونانیوں کے نزدیک خوبصورتی سے محبت خواہ یہ فن سے ہو خواہ مناظرِ فطرت میں اور خواہ یہ منطقیانہ تحقیق اور غور و فکر میں، "ایراس" کہلاتی ہے اور جذبات اور ملکیت کے اشتیاق کو ظاہر کرتا ہے۔ یونانیوں نے 'ایراس' کو اپنے مذہب میں بھی محسوس کیا کیونکہ مذہب کی پراسرار اقسام کے تحت پجاری، دیوتا کی خوب صورتی میں کھو جاتا ہے۔ لیکن اُن کے فلسفیانہ ادب میں "ایراس" کو اِس کے امتیازی تعلقات کے باوجود عام گفتگو میں شہوت پرستی کے رنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اور شاید اِسی بنا پر عہدِ جدید کے مصنفین نے اِس لفظ کے استعمال سے گریز

کیا۔

(ج) لفظ "فلیہ" دوستی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ عہدِ جدید کے انگریزی ترجمہ میں اِس سے متعلقہ فعل کا ترجمہ عموماً، محبت کیا جاتا ہے۔ "فلیہ" دوستوں کی دائمی محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اس میں ایراس کی پُرجوش اور جذباتی محبت کا بہت کم عنصر ہوتا ہے۔ بلکہ اِس میں ایک دوسرے کی مدد کا راز پوشیدہ ہے جو خوشگوار دوستانہ تعلقات کی ایک خوبی ہے۔

(د) "اسٹرگے" وہ قدرتی محبت ہے جو خاندان کے افراد میں پائی جاتی ہے۔ عہدِ جدید میں یہ صرف صفت کے ایک جزو کے طور پر استعمال ہوتی ہے جس کے معنی ہیں "طبعی محبت سے خالی" (رومیوں ۱ : ۳۱، ۲ تیمتھیس ۳ : ۳)

(ر) "اگاپے" ایک ایسا لفظ ہے جو عہدِ عتیق کے یونانی ترجمہ اور مسیحی ادب میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اِس سے باہر یہ لفظ بہت کم مستعمل ہوا ہے۔ ہاں البتہ ایک دفعہ یہ مصری دیوی "اسیس" کیلئے اُس کے ایک نام کے طور پر استعمال کیا گیا۔ "اگاپے" سے مشتق فعل اکثر کلاسیکل یونانی میں ملتا ہے۔ لیکن وُہ یہ لفظ قدرے غیر جانبدارانہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو کہ ایک غیر واضح پسندیدگی اور غیر اہم اطمینان کو ظاہر کرتا ہے۔ "اگاپے" کے مسیحی معنی اُس تعلیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسے مسیح خداوند اور اُس کے شاگردوں نے محبت کے موضوع پر پیش کیا۔ یہ لفظ جو یونانی ادب میں تو بہت کم ملتا ہے لیکن یہ عہدِ جدید اور بعدازاں مسیحی ادب میں محبت کے لئے مخصوص ہو گیا۔



## ۲۔ مسیحی محبت کا مفہوم

جیسے کہ ہم عموماً محبت کے بارے میں خیال کرتے ہیں۔ مسیحی محبت یا "اگاپے" محض جذبات ہی نہیں ہیں۔ بلکہ بارتھ کے نظریہ کے مطابق اِس میں انسان کی پُوری ذات شامل ہے۔ کیونکہ یہ محبت "اپنی ذات سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف رُخ کرتی ہے"۔ یاد رہے کہ ہماری مسیحی محبت کی آرزو، نمونہ اور ماخذ خدا کی محبت ہے۔ خدا کی محبت کا ظہور تخلیق کائنات میں ہے۔ کیونکہ ہم مسیحیوں کا یہ ایمان ہے کہ جو کچھ خدا نے خلق کیا اور جس میں انسان کی محبت کرنے اور محبت کروانے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔ وہ سب خدا کی "اگاپے" کا اظہار ہے "خدا محبت ہے اور جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خدا میں قائم رہتا ہے اور خدا اس میں قائم رہتا ہے"۔ (۱۔ یوحنا ۴ : ۱۶)۔ خدا کی یہی محبت مخلصی کے کام میں بھی ظہور پذیر ہے۔ کیونکہ مسیح یسوع کی زندگی اور موت سے ہم انسانی محبت کے لئے آرزو اور نمونہ حاصل کرتے ہیں۔ "اے عزیزو جب خدا نے ہم سے ایسی محبت کی تو ہم پر بھی ایک دوسرے سے محبت رکھنا فرض ہے"۔ (۱۔ یوحنا ۴ : ۱۱)۔ یہ کچھ اس طرح سے ہے کہ جیسے مسیح یسوع نے محبت سے اپنے آپ کو ہمارے لئے دیدیا اُس طرح ہماری بھی بلاہٹ ہوئی ہے اور ہمیں اِس قابل بنا دیا گیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں۔ "خدا کی یہ محبت روح القدس کے وسیلہ سے ہمارے دلوں میں ڈالی گئی ہے" (رومیوں ۵ : ۵)۔

مسیحی محبت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم صرف بنی نوع انسان سے محبت رکھیں، حالانکہ مسیحی اخلاقیات میں اِس سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ پہلا اور بڑا حکم یہ نہیں کہ ہم اپنی مانند صرف اپنے پڑوسیوں سے پیار کریں

CS CamScanner

بلکہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان
اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھیں (مرقس
۱۲: ۲۹-۳۰)۔ یہ حقیقت ہے کہ مقدس پولس نے صرف ایک دفعہ واضح
طور پر انسان کی خدا سے محبت کے بارے میں کہا مگر وہ عموماً انسان
کی طرف سے خدا سے محبت کو ایمان کے ردِ عمل کی حیثیت
سے پیش کرتا ہے۔ شاید اُس نے یہ محسوس کیا ہو کہ یہ قدرے بے حرمتی
ہو گی کہ اُسی لفظ کو خدا کی انسان سے کامل محبت اور اُس محبت کے
جواب میں ہماری کمزور آرزوؤں کے لئے استعمال کرے۔ واقعی ایک
یہ صورت ہے کہ "کامل محبت خوف کو دُور کر دیتی ہے (۱۔یوحنا ۴:
۱۸)۔ تاہم جب یہ کامل بھی ہو جائے تو بھی خدا کی محبت انسان سے
اور انسان کی خدا سے محبت کے درمیان کافی فرق رہتا ہے۔ خدا ہم
میں کسی اخلاقی خوبی کو دیکھ کر ہم سے محبت نہیں کرتا لیکن ہم اُس میں
حسن و خوبی کو دیکھتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ خدا اپنی محبت سے انسان
میں اچھی چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن بر طرف دیگر انسان جو محبت
خدا سے کرتا ہے اس میں اِس قسم کی کوئی تخلیق نہیں۔ جیسے کہ ہم نے
عہدِ عتیق کے 'حسید' یا 'عہد کی محبت' کے متعلق کہا ہے، کامل اور دانشمند
خالق کی اپنی مخلوق سے محبت کا قدرتی اظہار یہ ہے کہ وہ حکم دے
اور مخلوق کی اپنے خالق سے فطری محبت یہ ہے کہ وہ اُس کے حکم
کی تعمیل کرے۔ مسیح خداوند کے وسیلہ سے مخلصی یافتہ انسان ہونے
کی حیثیت سے خدا سے ہمارے خاص تعلقات میں خدا کی محبت
کا ظہور معافی میں ہے اور ہماری محبت کا اظہار شکر گذاری سے
ہے۔

ہم کسی شخص سے جسے ہم نہیں جانتے محبت نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ



خدا سے محبت رکھنے میں ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اُسے
جاننے کی کوشش کریں اور صرف خداوند یسوع مسیح کے وسیلہ سے
ہم خدا کو بہترین طور پر جان سکتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کو ایک
بچے کی طرح شروع کرنا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ وہ یسوع سے تو محبت
رکھتا ہے۔ لیکن خدا سے ڈرتا ہے۔ یہاں پر یہ خطرہ بھی ہے کہ یسوع
سے ہماری محبت میں ایک جذباتی قسم کی ہیرو پرستی سے تنزلی
واقع نہ ہو جائے۔ ہمیں یہ سیکھنا چاہیئے کہ ہم اُسے نہ صرف "ابن آدم
یعنی اپنے ایک طاقتور اور شفیق ہیرو کی طرح بلکہ مقدس توما کے
ہم زبان ہو کر اُسے اپنے خداوند اور خدا کی حیثیت سے جانیں۔
(یوحنا ۲۰: ۲۸)۔ مسیحی تعلیم اپنے وسیع معنوں میں اور خاص کر
فضل کے وسائل یعنی کلام، ساکرامنٹ اور دعا ایسے طریقے ہیں جن
سے ہم خدا کو بہتر طور پر جان کر اس سے محبت رکھ سکتے ہیں۔

علم اِخلاقیات کے نقطۂ نگاہ سے ہمارا تعلق خاص اِس بات سے
ہے کہ انسان کی خدا سے محبت کا یہ ردِ عمل ہے کہ وہ بنی نوع انسان
سے بھی محبت رکھتا ہے۔ انحراف و جذبات کے خلاف مسیحی محافظت
جس کی طرف انسانی محبت اکثر مائل رہتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم انسان
سے محبت رکھنے کیلئے خدا کی محبت کو بنیاد اور محبت کے اشتیاق
کے لئے استعمال کریں۔ ہماری اِس اولیت سے ہماری انسانی محبت
بالکل درست رہے گی۔ اِسے ایک ہندو اپنشد میں ظاہر کیا گیا ہے۔
"خاوند کی خاطر خاوند پیارا نہیں بلکہ رُوح کی خاطر خاوند عزیز ہے"۔
خدا کی محبت کے بغیر انسانی محبت ہر قسم کے بگاڑ اور تنزلی کا
مستوجب بن سکتی ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے پورے دل سے زندہ
اور حقیقی خدا کو پیار کرتا ہے۔ یعنی بائیبل کے خدا کو نہ کہ اپنی

جذباتی قوتِ واہمہ کو، تو اِس محبت سے اُس کی اپنے بیوی بچوں اور پڑوسیوں سے ایک اور حقیقی رنگ میں محبت ہوگی۔ جب انسان میں چھوٹے بڑوں کے اختلافات کی کوشش کارفرما ہوتی ہے تو اِس سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان خُدا کی عظیم محبت سے محروم ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہماری فطری انسانی محبت کے باعث ہے اور یہ صُورتِ حال بالکل ناکام اور قابلِ رحم ہے۔

خُدا کی "اگاپے" کے دو پہلو ہیں۔ اور اِس کے نتیجہ میں ہماری انسانی "اگاپے" بھی دو پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ ایک تو عام قسم کی ہمدردی یا تمام لوگوں کی بھلائی کے لئے عالمگیر خواہش ہوتی ہے۔ جس میں ہمارے انسانی جذبات شامل نہیں ہوتے۔ ہم ایسی ہمدردی مشرقی پاکستان کے سیلاب زدہ لوگوں سے جنہیں ہم نے دیکھا بھی نہیں، ظاہر کر سکتے ہیں۔ یا اُس شخص سے جسے ہم نے یریحو کے راستے پر دیکھا ہے۔ جسے مارا گیا۔ اور جس کے کپڑے بھی اتار لئے گئے۔ اور اب وُہ بیکسی کی حالت میں ادھ موا پڑا ہے۔ تاہم بائبل ایک ایسے خُدا کا مکاشفہ بخشتی ہے۔ جو تمام بنی نوع انسان سے انفرادی طور پر اپنا ذاتی تعلق ظاہر کرتا ہے۔ اِسی طرح دوسری سے ہماری محبت میں شخصی تعلق اور ذاتی دلچسپی کا عنصر ضرور ہونا چاہیئے۔ عہدِ عتیق میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب آدم اور حوّا اچانک ننگے ہو جانے سے کچھ پریشان نظر آتے تھے تو خُدا نے خود اُنہیں لباس پہنایا اور وُہ ممرے کے بلوطوں کے پاس ابراہام کے خیمہ میں خاندانی معاملات پر غور و خوض کرنے کے لئے گیا۔ اِن کہانیوں کی پُشت پر یہ حقیقت ہے کہ انسان کے شخصی معاملات میں بھی خُدا کی محبت کارفرما ہے۔ بائبل کے مکاشفہ کا منتہائے کمال وُہ عظیم شخصیت یعنی مسیح خداوند ہے جس نے اکثر اوقات لوگوں کے لئے بھلائی کے کام کئے۔ اُس نے



بیت عنیاہ میں ایک بھائی اور اُس کی دو بہنوں سے خاص شخصی محبت کا اظہار کیا (یوحنا ۱۱ : ۵)۔ اور اپنے شاگردوں میں سے ایک کے ساتھ اس کے شخصی تعلقات، اُس کی خاص محبت کو ظاہر کرتے ہیں (یوحنا ۱۳ : ۲۳)۔ ایک طرح سے خُدا کی اگاپے نمونہ کا باعث ہے وُہ سرگرم اور معاف کرنے والی ہے جو خُدا انسان سے شخصی تعلقات میں ظاہر کرتا ہے۔ یہ محبت ہر ایک شخص سے خواہ وُہ کسی خاص کام کے لئے چنا ہوا فرد ہو، خواہ وُہ غریب مصیبت زدہ ہو جو سڑک پر بے یار و مددگار پڑا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خدا کی اگاپے، ہماری انسان کے ساتھ پُرجوش محبت سے کہیں بڑھ کر ہے اور اگر ہم اِس کا انکار کر دیں تو اِس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم انسانی محبت کے مُقابلہ میں خُدا کی محبت کو کسی حد تک ادنٰے اور معمولی قرار دیتے ہیں۔ خُدا کا یہ کام کہ وُہ کس طرح لوگوں کو چننا اور اُن سے محبّت کرتا ہے، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

مسیحی "اگاپے" "ایراس" سے اِس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ اپنی محبت کے شے سے اس کی حقیقی یا تصوراتی خوبیوں اور قدر و قیمت کی خاطر محبت نہیں کرتی۔ محبت کے اس مفہوم کے پیشِ نظر ہمیں خُدا کی محبت کے لئے یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ خُدا کی فطرت سے جذبات و احساسات کا بلا مقصد اور غیر ارادی ظہور ہے، خواہ اس کی محبت کو کوئی قبول کرے یا ردّ کرے۔ یعنی اُس چشمہ کی طرف سے ہر طرف پانی خارج ہوتا رہتا ہے اور اسے کچھ بھی پتہ نہیں کہ کس چیز پر گرتا ہے بارتھ کی دی ہوئی "اگاپے" کی تعریف ہماری صحیح راہنمائی کرتی ہے "اگاپے کسی دوسرے کے لئے ایثار کا نام ہے۔ حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب کہ اُس میں کوئی خوبی بھی نہ ہو"۔ افلاطون نے کہا کہ "ایراس

کے معروض کو اچھا، لطیف اور کامل ہونا چاہیئے"۔ لیکن خدا کی اگاپے زیادہ تر ہماری انسانی "اسٹرگے" کی مانند ہے۔ یعنی وہ فطری محبت جو ہم اپنے اعزہ و اقارب کے لئے ظاہر کرتے ہیں۔ خواہ وہ اس کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ روزمرّہ زندگی میں انسان اُن لوگوں سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہے، جو نہ تو اچھّے اور نہ ہی کامل ہیں۔ ایک ماں نہ صرف اپنے شرابی بیٹے سے محبت رکھتی ہے۔ بلکہ اسے پسند بھی کرتی ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ خواہ وہ ماں اپنے بیٹے کی شراب نوشی کو ناپسند ہی کیوں نہ کرے، پھر بھی اس شرابی بیٹے میں ایسی باتیں ہیں جو قابلِ محبّت ہیں۔ ایسا مفروضہ قائم کرنا انسانی تصوّر سے بعید نہیں کہ خدا بھی تو ایسے ہی کرتا ہے لیکن یہ انسان کی اپنے مقام سے گراوٹ کے باعث ایک غلط عقیدہ ہے جو ہمیں اس اعتقاد سے روکتا ہے کہ خدا ایک بہت بڑے گنہگار میں ایک قابلِ محبت خوبی کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر ایک بدشکل اور جسمانی نقائص میں مبتلا بچے کے والدین کو کوئی یہ کہے کہ اُن کے اِس بدنصیب بچّے میں کچھ بھی تو قابلِ محبّت نہیں بلکہ ان کا پیار اُن کے دل کی اچھائی کی بنا پر ہے، تو ضرور وہ غصّہ سے بھڑک اٹھیں گے۔ کیا خدا کے اُن ماہرین علم الٰہیات کے لئے بھی ایسے ہی احساسات نہیں ہوں گے۔ جو عالمگیر بدکاری اور سیاہ کاری سے متعلق تعلیم دیتے ہیں۔ روح القدس خدا کی اگاپے کو انسان کو اِس طرح سکھاتا ہے کہ وہ اُسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ اُن لوگوں میں جنہیں دنیا تو بالکل حقیر اور ناچیز جانتی ہے لیکن وہ ان میں نیکی کی کرنوں کو دیکھ سکے اور یُوں انہیں پسند کرنا سیکھیں۔

اگرچہ "اگاپے" محبوب کی اعلےٰ خوبیوں کو دیکھ کر اس کی طرف راغب نہیں ہوتی۔ تاہم وہ اس قابلِ قدر اور اچھی خصوصیات



کو پیدا کرنے کی خواہاں رہتی ہے۔ خدا کی اگاپے معاف شدہ گنہگاروں میں تخلیقی کام کرتی ہے۔ یعنی اُن میں خدا کی شکل کو پھر سے بحال کرتی ہے جو خدا کی اگاپے کا ابتدائی کارِ تخلیق میں کام تھا۔ ہماری انسانی مجبوریوں کے باوجود بھی ہماری انسانی محبت میں تخلیق کا یہ کام ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ کتنا پُرمسرت تجربہ ہے کہ جب ایک عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو اس وقت وہ اُس میں اُن خوبیوں کو پیدا کر دیتی ہے۔ جو اِس سے پیشتر اس میں پنہاں تھیں اور شاید اس میں جلوہ گر نہیں۔ اِسی قسم کا تخلیقی کام ہم اُن والدین میں بھی دیکھتے ہیں جو اپنے قصوروار اور مجرم بچوں میں اچھی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے بچوں کو جب اپنے سرپرستوں میں حفاظت اور قبولیت کے عناصر نظر آتے ہیں تو وہ اپنی ذات کو نظرانداز کرتے ہوئے خاطر خواہ آزادی کے تحت دوسروں سے محبت کرتے ہیں۔

جیسے کہ ہمارے زمانے کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں ایسی محبت اپنے بچّوں اور دوسرے لوگوں پر نظم و ضبط اور برائی کرنے والوں پر تعمیری سزا عاید کرنے سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ یہاں پر بھی خدا کی اگاپے کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ "کیونکہ جس سے خداوند محبّت رکھتا ہے اسے تنبیہ بھی کرتا ہے اور جس کو بیٹا بنا لیتا ہے اُس کے کوڑے بھی لگاتا ہے"۔ (عبرانیوں ۱۲: ۶)۔ یہ سچ ہے کہ عہد جدید میں خدا کی محبت کی خوبی کا ظہور اس کی معافی میں ہے لیکن یہ معافی نہ تو کتاب مقدس میں اور نہ ہی مسیحی تجربہ میں لوگوں کو اُن کے بُرے کاموں کے تکلیف دہ نتائج سے ایک بے اصُول رہائی ہے بلکہ اس قسم کی معافی اور اگاپے جو اُس کے انصاف میں ظاہر ہے، وہ

خدا کے عدل کے متضاد ہو گی۔ بنیادی طور پر معافی کا یہ مطلب
نہیں کہ سزا سے درگزر کی جائے بلکہ جو شخص قصوروار ہے اور شاید
اس کے لئے دکھ بھی برداشت کر چکا ہے، اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیا
جائے جیسے کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ خدا کی معافی اور بنی نوع
انسان کے لئے ہماری معافی میں لازمی جزو یہ ہے کہ معافی یافتہ شخص
پھر سے اپنا مقام حاصل کر کے اچھی زندگی شروع کر سکتا ہے اور اپنے
گذشتہ قصوروں کو بالکل ترک کر دیتا ہے اور اُسے یقین ہے کہ اُس کے خلاف
کبھی قسم کی کارروائی عمل میں نہیں لائی جائے گی۔ ایسی معافی تو مسیحی
کلیساؤں میں پڑوسیوں اور محدود معاشرہ کے اچھے تعلقات میں دیکھی
جا سکتی ہے لیکن صنعتی اور بین الاقوامی وسیع تعلقات میں مسیحی معافی
کا اطلاق زیادہ پیچیدہ نظر آتا ہے۔ اور ایسی پیچیدگیوں کے پیش نظر
اسے عمل میں لانا مشکل ہے۔ لیکن یہاں پر بھی ماضی کو فراموش کرتے
ہوئے نئے آغاز کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان
اور بھارت معافی کی رُوح میں ماضی کے گذشتہ تعلقات کو بھول کر
پھر سے دوستانہ تعلقات اختیار کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اعلےٰ
ذات کے لوگوں اور اچھوتوں کے لئے بھی معافی کا یہی سبق ہے۔ کہ وہ
نسلی امتیاز کو بھول کر برادرانہ تعلقات میں زندگی بسر کریں۔

## ۳۔ محبت اور پسندیدگی

یہ خیال بالکل ایک غلط تصور پر مبنی ہے کہ مسیحی محبت کسی صورت
میں بھی وہ جذبہ نہیں جسے ہم عموماً محبت کہہ کر پکارتے ہیں۔ کیونکہ یہ کہا
جاتا ہے کہ مسیح خداوند نے تو ہمیں تمام لوگوں سے محبت رکھنے کیلئے
کہا ہے لیکن تمام آدمیوں سے ایسی پسندیدگی کا احساس بالکل ناممکن ہے



جسے ہم عموماً محبت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ سی۔ ایس۔ لوئیس
نے یوں لکھا کہ "اپنے پڑوسی سے ہماری مسیحی محبت، اُس کو پسند کرنے
اور اس پر مہربانی کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ
ہم کچھ لوگوں کو تو پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگوں سے بالکل پسندیدگی کا
اظہار نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ بذاتِ خود نیکی میں اور نہ
ہی بدی میں شمار ہوتی ہے۔" میرے خیال کے مطابق نہ تو اِس سے
عام اور نہ ہی کتابِ مقدس میں مستعمل لفظ "محبت" کے معنی اخذ ہوتے
ہیں۔ اگر "اگاپے" کا یہی مطلب ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں
یا ایک دوسرے کا بوجھ اٹھائیں یا اُن پر مہربانی کریں (اور عہدِ جدید تو
ہمیں نہایت وضاحت سے اِن کاموں کا حکم دیتا ہے) تو مسیح خداوند
مقدس پولس اور مقدس یوحنا کو اِس عجیب و غریب لفظ "اگاپے" کے
استعمال کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پولس رسول تو صریحاً اِس حقیقت کو پیش
کرتا ہے کہ "اگاپے" دوسرے لوگوں کے لئے مدد کے کام کرنے سے بالکل
مختلف ہے" اور اگر اپنا سارا مال غریبوں کو کھلا دوں یا اپنا بدن جلانے
کو دیدوں اور محبت نہ رکھوں تو مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں" (۱۔کرنتھیوں
۱۳:۳)۔ یہ حقیقت تو ہم موجودہ دور میں بھی دیکھتے ہیں کہ اکثر نیک
کام کرنے والے اگرچہ لوگوں کی مدد کے لئے حقیقی خود انکاری ظاہر
کرتے ہیں، تاہم اُن سے وہ حقیقی اور شخصی تعلق کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ
وہ لوگ جن کا یہ نظریہ ہے کہ "اگاپے" محض جذبات ہی نہیں ہیں۔ اس لئے
یہ "پسندیدگی" سے بنیادی طور پر مختلف ہے، انہیں یاد رکھنا چاہیئے
کہ بظاہر تو وہ یہ معقول دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہمیں عہدِ جدید میں محبت
رکھنے کے لئے کہا گیا ہے لیکن حکم کے ذریعے سے ایسی محبت پیدا کرنا
بالکل ناممکن ہے اور ایسی کوشش سے ہم ریاکاری میں پھنس جائیں گے۔

اس حقیقت کے ثبوت میں بائبل ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ چونکہ ہم اپنے اصلی مقام سے گر چکے ہیں۔ اس لئے ہم میں کوئی نیکی نہیں ہوتی ہے لیکن یہ خدا کا فضل ہے جو ہمیں اچھے کام کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اور اسی فضل سے ہم اپنے ناپسندیدہ پڑوسی سے مہربانی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی مدد کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کا یہ نظریہ ہے کہ حکم کے ذریعہ سے پسندیدگی کا جذبہ کا احساس ناممکن ہے انہیں پولس کی روح کے پھلوں کی فہرست پر غور و خوض کرنا چاہیے جس میں محبت، خوشی اطمینان، تحمل۔ مہربانی۔ نیکی۔ ایمانداری۔ حلم اور پرہیزگاری کے لئے کہا گیا ہے (گلتیوں ۵: ۲۲-۲۳)۔ ضبطِ نفس کے علاوہ ان میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی حد تک جذباتی عنصر موجود ہے اور ان میں سے کوئی بھی حکم کے ذریعہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کریں اگر ہم کسی کو محض کہہ دیں کہ وہ خوشی اور اطمینان حاصل کرے، تو یہ اس طرح حاصل کرنا ناممکن ہے۔

وہ لوگ جو اس سے انکار کرتے ہیں کہ مسیحی محبت میں مہربانی بھی شامل ہے وہ شاید کسی اور وجوہات کی بنا پر ایسا کرتے ہوں۔ (ا) اُن کا یہ اعتقاد نہیں ہو سکتا کہ خدا اپنی پاکیزگی میں گنہگار لوگوں کے لئے جن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی نہیں، کسی قسم کی پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم تو پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ یہاں پر چند ایک غلط فہمیاں ہیں (ب)، وہ اگاپے کو عام انسانی محبت سے جسے وہ بنیادی طور پر خود غرض تصور کرتے ہیں، مختلف انداز سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ خاص کر وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ اسے جنسی محبت سے جسے کافی عرصہ تک مسیحی روایات میں غلطی سے ناپاک اور بنیادی غیر موزوں خیال کیا گیا ہے، سے متفرق ظاہر کیا جائے (ج)، بعض مسیحیوں کا یہ



بالکل غیر مسیحی رجحان ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے نیک بننا چاہتے ہیں اور چونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ایسی کوششوں سے ان میں دوسرے لوگوں میں پسندیدگی کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایسی مہربانی کا مسیحی اگاپے میں کوئی کردار نہیں ہے۔ یاد رہے کہ مسیحی اگاپے میں جذبات کو یقیناً ایک خاص مقام حاصل ہے لیکن یہ کلی طور پر اگاپے نہیں۔ اور وہ لوگ جو ہمیں اس کے دوسرے پہلوؤں کے لئے یاد دلاتے ہیں وہ اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اکثر محبت بگڑ کر محض جذباتیت رہ جاتی ہے محبت، انسان کی پوری شخصیت کی قربانی کا نام ہے۔ اور اس میں محبوب کی پوری ذات کا علم اور اس کی خدمت میں عملی اقدام دونوں شامل ہیں۔ ایک خبطی نوجوان جو ایک لڑکی میں ایسی خوبیاں دیکھتا ہے جو اس کے اپنے ہی تصورات کی تخلیق ہیں، وہ بت پرستی کرتا ہے نہ کہ اس میں "اگاپے" کارفرما ہے۔ اور وہ شخص جو اپنی دوستی کے تعلقات کے لئے بڑے احساسات سے باتیں تو کرتا ہے لیکن اپنے دوستوں کے لئے جب کہ دکھ میں ہیں، عملی طور پر کچھ نہیں کرتا، وہ حقیقی اگاپے سے بالکل خالی ہے۔ اگاپے کی عملی اور بہترین تصویر کرنتھیوں کے پہلے خط کے تیرھویں باب میں پیش کی گئی ہے۔

## ۶- اگاپے اور محبت کی دوسری اقسام

اکثر اوقات یہ نظریہ قائم کیا جاتا ہے کہ اگاپے میں محبت کی دوسری اقسام کا کوئی بھی عنصر موجود نہیں اور خاص کر یہ ایراس سے تو بالکل مختلف ہے۔ لیکن محبت کی تمام اقسام میں اپتھومیہ کی قدرتی خواہش کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود رہتی ہے۔ اپتھومیہ کی محبت بے جان اشیاء اور انسان

سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ہر قسم کی مہربانی کے لئے جبلّی فطری بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ عام قسم کی محبت جو انسان اپنے دوستوں (فِلیہ) اور اپنے اعزہ و اقارب (سٹرگے) سے ظاہر کرتا ہے وہ کسی نہ کسی حد تک جذباتی ہے اور خاص کر اُس وقت جب ’ایراس‘ اپنے جذبات کی بہ سبب عادت خوبیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ محبت کی زیادہ جبلّی اقسام مثلاً مادرانہ شفقت یا مختلف جنسوں کے درمیان محبت خود غرضی یا بے غرضی کا مظاہرہ کر سکتی ہے مثلاً جب ماں اپنی خواہشات اور جبلتوں کو پورا کرنا چاہتی ہے، تو اِس میں لازماً ’ایراس‘ کی خود غرضی شامل ہوگی۔ لیکن جہاں وہ اپنے آپ کو اپنے بچہ کے لئے بے غرض اور بغیر کسی ملکیتی جذبہ کے ساتھ پیش کرتی ہے تو وہاں ہم اگاپے کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ ہمارے نظریہ کے مطابق وہ شخص جو اپنی محبوبہ سے دل لگی اور ذاتی لذت کی خاطر محبت کرتا ہے، صحیح محبت نہیں کرتا، کیونکہ وہ ’ایراس‘ کی محبت کا شکار ہے۔ بہ شرحِ دیگر وہ شخص جو اپنی محبوبہ کی خاطر اپنے ذاتی مفادات کو ترک کرنے کے لئے تیار ہے۔ یقیناً اس کے دل میں ’اگاپے‘ کی بے غرض محبت ہے۔ چونکہ خُدا نے انسان کو اپنی ’اگاپے‘ کے ظہور کے لئے پیدا کیا، اس لئے گِرا ہُوا انسان اب بھی کبھی نہ کبھی اگاپے کے بے غرض وصف کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن انسان اپنے مقام سے چونکہ گر چکا ہے، اس لئے اکثر اوقات اُس کی محبت بگڑ کر جذباتیت اور خود غرضی کا روپ دھار لیتی ہے اور ہر طرح کی گمراہی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ پس جب مسیح یسوع کی محبت کسی کے دل میں آتی ہے۔ تو یہ دوسری محبتوں کو اس کے دل سے نکال نہیں دیتی بلکہ اُن کی کایا پلٹ دیتی ہے تاکہ پھر سے انہیں ویسی ہی شکل دے جیسے کہ



خُدا کا تخلیقِ انسان کے وقت ارادہ تھا۔ اِس قسم کے تغیر کلّی کے تین پہلو ہیں (ا) انسان کی محبت میں خود غرضی کی بجائے بے غرضی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دوسروں کے مفاد کی خاطر ان سے محبت کرتا ہے (ب)۔ اُس کی محبتوں کو خُدا کی عظیم محبت کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت مل جاتی ہے اور اس کی صحیح اور درست اولیتیں اپنا اصلی مقام حاصل کر لیتی ہیں (ج) ہر قسم کی محبت کو محض جذبات کی نسبت عملی تعلق اور خدمت کا اہم مقام مل جاتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ’اگاپے‘ عملی محبت کا نام ہے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ثانوی محبتوں میں مسیحی ’اگاپے‘ اپنا فطری کردار ادا کرتی ہے۔ ہم یہ تو پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ’اگاپے‘ کسی کی خوبیوں کو دیکھے بغیر ظاہر کی جاتی ہے وہ اُس فطری محبت کے عین مطابق ہے جو والدین سے نالائق اور قصور وار بچوں سے دکھاتے ہیں۔ دوستی میں خوشگوار تعلقات ہمیں ارسطو کا وہ قول یاد دلاتے ہیں۔ جس نے کافی دیر پہلے یہ محسوس کیا کہ نیکی صرف ابتلا حال و انعام سے ہونی چاہیئے۔ اور والدین اور آجروں کے لئے یہ واجب نہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں سے اپنے ذاتی تعلقات کے تحت ناجائز سلوک کا بہانہ بنائیں۔ اِس کے لئے ہم ایک اصول پیش کرتے ہیں کہ دستکاری اور ہر کہیں اچھے تعلقات کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ دونوں طرف سے مناسب سلوک ہو۔ گو انصاف شخصی تعلقات کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن ہماری مسیحی محبت یونانی ’ایراس‘ کے قدرتی میلان اور جذبات سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے بے غرض خدمت جو کہ مسلمہ طور پر مسیحی محبت کا عام اظہار ہے وہ اعتدال پسندی اور حتیٰ کہ ناخوشگوار فرض کا معاملہ بن سکتی ہے۔ جیسے کہ نہ

صرف افلاطون کے "ایراس" کے بیان میں محبت کی تصویر پیش کی گئی ہے بلکہ پولس بھی ا۔کرنتھیوں ۱۳ باب میں اگاپے کو بیان کرتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ اپنے عمل اور جرأت کو کھو دے۔ لیکن ایسی دلیرانہ محبت میں عظیم خطرات ہیں کیونکہ ایک محبوبہ کو نہایت آسانی سے ایک شکستہ بت بنایا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ جنسی برائیوں کے خطرات بھی لاحق رہتے ہیں۔ تاہم محبت کا یہ مقصد نہیں کہ یہ ایک بے کیف اور غیر رومانی معاملہ ہے بلکہ یونانی "ایراس" کی طرح اگاپے ایک اعلیٰ قسم کی محبت ہے۔ یونانیوں نے اس محبت کو جسے ہم روحانی حسن اور فلسفیانہ حقائق میں جانتے ہیں، بہت اعلیٰ مقام دیا۔ لیکن ہم مسیحی تو اسے صرف مسیح یسوع میں پاتے ہیں جس میں خدا کی اگاپے کا کامل مکاشفہ دیا گیا ہے۔



## اٹھارہواں باب

# مسیح میں قائم رہنا

### ا۔ فضل اور ترقی

اس کتاب میں جس موضوع پر بحث و تمحیص کی گئی ہے وہ بہت سے صاحب فکر مسیحیوں کے نظریہ کے مطابق "فطری اخلاق" ہے اور بدیں وجہ وہ اس سے نفرت کا اظہار کریں گے۔ ایسے لوگ ضرور کہیں گے کہ عہد جدید کی اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ مسیحی نیکی "تابعداری یا نیکی کی کوشش کرنے کا معاملہ نہیں، بلکہ مسیح خداوند سے وہ زندہ تعلق ہے جسے اخلاقی جدوجہد کی اصطلاحات کی نسبت فضل، نئی پیدائش اور روحانی ترقی کی اصطلاحات میں بیان کرنا چاہیئے۔ ہر وہ شخص جس نے یوں اچھی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی اخلاقی بے بسی اور لاچاری سے واقف ہے۔ اور وہ مقدس پولس کی طرح نیکی کا ارادہ تو کرے گا۔ لیکن خدا کے فضل کے بغیر نیک کام اس سے بن نہیں پڑیں گے (رومیوں ۷: ۱۸)۔ فضل کے بارے میں ایک یہ نظریہ ہے کہ انسان کو ایک پُر اسرار قوت کا ٹیکہ لگ جاتا ہے جس [illegible] وصول کنندہ میں نیکی کا

رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بدی کے خلاف جنگ کے لئے زائد قوت آجاتی ہے۔ فضل ہماری روحانی کوشش میں وہی کام سرانجام دیتا ہے جو کلوی غدود کا جسمانی تگ و دو میں ہے۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ خدا بعض اوقات ساکرامنٹوں اور پُر اسرار طریقوں سے اپنے فضل کا کام کرتا ہے۔ لیکن اگر ہم فضل کو صرف ایسے ہی طریقوں تک محدود رکھیں تو یہ ایک غلط تصور ہو گا۔ خدا کے فضل میں وُہ تمام طریقے شامل ہیں۔ جن کے وسیلہ سے خدا کے لوگوں سے شخصی تعلقات ہیں۔ یعنیہ جس طرح اچھے والدین کا اپنے بچوں سے اور سمجھ دار استادوں کا اپنے طلباء سے تعلق ہوتا ہے اِسی طرح فضل کے ذریعہ سے خدا کے انسان سے شخصی تعلقات ہیں ـــ!

"تاہم پروردگاری اور تربیت میں خدا کا فضل ہماری توقعات اور ہمارے تصورات سے کہیں بالا ہے۔ خدا کا فضل جیسے کہ اِس کا براہِ راست زیادہ نیک زندگی سے تعلق ہے۔ لاینحل طور پر مسیحیت کے ابتدائی دور کے واقعات یعنی تجسم، موت، مسیح یسوع کی قیامت اور اُس کے روح القدس کے نازل کرنے سے وابستہ ہے۔ روح القدس ماضی کے واقعات کا براہِ راست اور باثر عت تمام ہماری زندگی پر اطلاق کرتا ہے چنانچہ اِس طرح مصلوب اور زندہ خداوند سے ہمارے زندہ تعلقات ہیں ـــ:

اگرچہ ہمارا اب بھی یہ نظریہ ہے کہ سادہ تابعداری اور نیکی کی دیانتدارانہ جدوجہد کا اِس زندہ تعلق میں ایک مقام ہے اور اس کے لئے ہمارے پاس کتابِ مقدس میں سے اثبات موجود ہیں۔ تاہم ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہماری اپنی کوششوں پر زور دینے سے اِس تعلق کی روح کہ مسیح ہم میں ہے اور ہم مسیح میں ہیں مقدرے مبہم سی ہو جائے گی۔ پولُس رسول اپنے خطوط میں



یہ جملہ "مسیح میں" اور اس کے ہم معنی جملوں کو ایک سو ساٹھ دفعہ استعمال کرتا ہے۔ اِن کے علاوہ وُہ دوسرے اَور جملے مثلاً "مسیح ہم میں" اَور اس کے ہم معنی جملے تقریباً بارہ دفعہ استعمال کرتا ہے جو اُس کے سب سے بڑے تعلیمی بیانات میں ملتے ہیں۔ مقدّس پولس یہ کہتا ہے کہ اسے گلتیہ کی کلیسیاؤں کی طرف سے جننے کے سے درد لگے ہوئے ہیں۔ جب تک کہ مسیح اُن میں صورت نہ پکڑ لے (گلتیوں ۴ : ۱۹)۔ اور اُس کی یہ خواہش تھی کہ اُس کے افسی نومرید یہاں تک ترقی کریں کہ "وہ مسیح کے پورے قد کے اندازہ تک پہنچ جائیں" (افسیوں ۴ : ۱۳)۔ مسیح یسوع سے رفاقت میں ترقی کے لئے اس محاورہ کا نہ صرف پولس تذکرہ کرتا ہے بلکہ خود ہمارے خداوند نے انگور کے حقیقی درخت کی تمثیل میں اِس حقیقت کی وضاحت کی "تم مجھ میں قائم رہو اور میں تم میں۔ جس طرح ڈالی اگر انگور کے درخت میں قائم نہ رہے تو اپنے آپ سے پھل نہیں لا سکتی۔ اُسی طرح تم بھی اگر مجھ میں قائم نہ رہو تو پھل نہیں لا سکتے" (یوحنا ۱۵ : ۴)۔

مسیح میں نیکی کے لئے ہماری ترقی کو سمجھنا ایک آسان بات نہیں ہے کیونکہ ترقی ایک بھید ہے اور یہ ایک پُر اسرار اور عموماً لاشعوری عمل ہے۔ خود ہمارے خداوند نے اسے اپنی ایک تمثیل میں یوں واضح کیا "خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے۔ اور رات کو سوئے اور دِن کو جاگے اور وُہ بیج اِس طرح اُگے اور بڑھے کہ وُہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی۔ پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے" (مرقس ۴ : ۲۶ - ۲۸)۔

اِس سے یہ مراد ہے کہ ہم اِس ترقی کے نتائج کو دیکھ کر اسے جانتے ہیں۔ اِسے عہد جدید میں "پھل" کہا گیا ہے اور علم اخلاقیات کی

اصطلاحات میں حقیقی نیکی کے عمل اور مسیحی کردار کی خوبیوں میں بیان کیا گیا ہے۔
یہ نظریہ قائم کرنا بھی عین ممکن ہے کہ قدرتی ترقی میں مداخلت کرنا ایک غیردانشمندانہ قدم ہوگا۔ جیسے کہ ہر ایک باغبان جانتا ہے کہ اچھی اور تیار کی ہوئی زمین میں جب ایک دفعہ بیج بو دیا جاتا ہے تو پانی دینے اور گھاس نلائی کرنے کے علاوہ جتنی وہ کم مداخلت کرتا ہے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔ اُگتے ہوئے پودوں کو بار بار اس لئے اکھاڑنا کہ دیکھا جائے کہ وہ کس طرح بڑھ رہے ہیں۔ یقیناً ایک تباہ کُن باغبانی حکمتِ عملی ہوگی۔ وہ حضرات جو ہمیں نظری اخلاق کے خلاف درس دیتے ہیں۔ وہ اس میں کم از کم درست ہیں کہ وہ لوگ جن میں " مسیح صورت پکڑ چکا ہے " انہیں یہ اعتقاد ہونا چاہیئے کہ اُن میں اخلاقی نیکی کے لئے فطری ترقی ہوگی۔ اور انہیں چاہیئے کہ اپنی اخلاقی ترقی کے تجربہ اور بار بار محاسبۂ نفس کے لئے متفکر نہ ہوں۔

## ۲۔ دُنیا میں مسیح کی حضُوری

مسیح کے پیروکاروں میں ایک ایسی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ جسے ہم گمراہ شدہ روحانیت کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ روحانیت مختلف لوگوں کی مختلف طبیعتوں میں مختلف طرح سے صورت پکڑتی ہے۔ مثلاً ایک مسیحی خدا شناس ایک مسلمان صوفی کی طرح اپنی روحانی مشق سے۔ مسیح میں جذب ہو جانے کا آرزومند ہے۔

ایک ماہرینِ علم الٰہیات اپنی گہری سوچ و بچار اور عقلی دلائل سے کہ وہ مسیح میں قائم ہے اور ایک دیندار شخص اپنی رسومات میں مسیح کی حضوری کو محسوس کرتا ہے۔ اور اکثر جب وہ ساکرامنٹ میں روٹی اور



مے لیتا ہے۔ تو اُسے شدید احساس ہے کہ مسیح وہاں موجود ہے۔ یاد رہے کہ ہمیں روحانیت کی ایسی اقسام کی کبھی بھی حقارت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ ہمارے عظیم ترین مسیحی بزرگوں کی یہ خوبیاں رہی ہیں۔ تاہم بہت سے حقیقی مسیحی اشخاص یعنی نہ تو خدا شناس اور نہ ہی ماہرینِ علم الٰہیات اس ذُو معنی لفظ کے محدود معنوں میں مذہبی ہیں کیونکہ یقیناً ایسے لوگوں کی ہی مسیحی نیکی پہ اجارہ داری نہیں۔ پُر اسرار تجربات، یا علم الٰہی کی کم علمی یا ساکرامنٹوں کے عمل میں ہماری مجبوریوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری مسیح سے رفاقت نہیں ہے۔
اور اگر ہمارا یہ خیال ہو تو یقیناً یہ گمراہ شدہ روحانیت کے مترادف ہے۔ واقعی یہ خدا داد صلاحیتوں کے مالک لوگوں میں ایک نمایاں کمزوری بھی ہو سکتی ہے۔ اور بہت آسانی سے اُن کا مذہب مسیحی نیکی سے مختلف نظر آنے لگتا ہے یعنی اس عملی نیکی سے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ پولس رسول اپنے محبت کے گیت کی پہلی تین آیات میں واضح طور پہ اُس خاص خطرہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (۱۔ کرنتھیوں ۱۳ باب)۔

نہ تو مسیح خداوند کی پُر اسرار حضوری، نہ ہی اس کی فوق الفطرت ذات اور نہ ہی ساکرامنٹوں میں اس کا مکاشفہ بلکہ یہ کہ وہ مجسّم ہُوا، اُس نے خادم کی صورت اختیار کی اور وہ ہم آدمیوں اور ہماری نجات کے لئے صلیب پہ مؤا، اس کے متعلق ایک بنیادی حقیقت ہے۔ خود مسیح خداوند نے بھیڑوں اور بکریوں کی تمثیل میں اس دنیا میں اپنی حضوری کے لئے ایک دلیل پیش کی۔ (متی ۲۵ : ۳۱ - ۴۶) " میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے اِن سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔" یہ ممکن ہے کہ بنیادی طور پہ مذہبی تجربات میں نہیں بلکہ مہاجروں، بھوکوں، ننگوں، بیماروں اور قیدیوں سے اپنے

تعلقات سے مسیح ہم میں ہے اور ہم مسیح میں ہیں۔ لیکن اکثر ہم اس تمثیل کی یوں تشریح
کرتے ہیں کہ اگر ہم بہبودیوں کی سی دینداری مثلاً خیرات دینے اور بیمار پُرسی وغیرہ کو جاری
رکھیں گے تبھی ہم مسیح کو پا سکیں گے۔ گو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان چیزوں کو ایک اہم
مقام حاصل ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اس تمثیل کی گہرائی میں جائے تو وُہ یہ محسوس
کرے گا۔ کہ اُس کا تو یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ مسیح خداوند ایسی غیر مذہبی اور دنیاوی
تحریکوں مثلاً "وار آن وانٹ" دی پبلک ہیلتھ سروس، خاندانی منصوبہ بندی اور دوسری
ایسی انجمنوں میں بھی موجود ہے۔ جرمن مفکر بانہوئیفر نے یہ دلیل پیش کی کہ ایک مسیحی کو
دنیاوی معاملات میں بھی حصّہ لینا ہے نہ کہ وُہ بالکل مذہبی معاملات میں کھو کر رہ
جائے۔ ہاں البتہ اس کا دنیاداری کے لئے یہ مطلب نہیں۔ جیسے کہ مقدس یوحنا
اس دنیا کو بُرا قرار دیتا ہے۔ جس میں "جسم کی خواہش اور آنکھوں کی خواہش اور
زندگی کی شیخی" شامل ہیں (۱۔ یوحنا ۲: ۱۶)۔ دنیاوی بن جانا اس وقت بُرے
معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب انسان بغیر سوچے سمجھے، خوشی سے دنیا کے گھٹیا
معیاروں اور دستوروں کی پیروی کر لیتا ہے۔ لیکن مسیحیوں سے ایک اور
قسم کی دنیاداری کی توقع کی گئی ہے۔ بعینہٖ جیسے کہ تجسم کا یہ مطلب ہے کہ خدا
کا مسیح دنیا کی زندگی میں شریک ہوا، اُسی طرح جب مسیح ہم میں جنم لیتا ہے۔
تو ہمیں بھی دنیا کی زندگی میں شریک ہونا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل مسیح خداوند کس طرح دُنیا میں موجود ہے؟
گو اُس نے کبھی بھی اسے واضح طور پر ظاہر نہیں کیا۔ تاہم یوں محسوس ہوتا ہے کہ
بانہوئیفر کو دنیا کی ترقی اور روحانی دُکھ میں ضرور اس کی حضوری کا احساس تھا۔ ایک
وقت تھا۔ جب انسان نے تمام قسم کے واقعات مثلاً موسموں کے تغیر و تبدّل
متعدی امراض کے حملوں اور جنگ کے نتائج کو خدا کے براہ راست کاموں



سے منسوب کرتے تھے۔ لیکن آج کل انسان نے خدا کی پناہ جوئی کے بغیر
"ایسے اہم معاملات" سے نپٹنا سیکھ لیا ہے۔ تاہم موجودہ دَور میں بھی جن مسائل
کے لئے ہمارے پاس سائنسی حل نہیں" وہاں ہم کام چلانے کی خاطر خدا کو استعمال
کرتے ہیں۔ بانہوئیفر کا یہ خیال ہے کہ سائنس ایک نہ ایک دن جرم، دُکھ اور موت
جیسے مسائل کا ضروری حل تلاش کر لے گی۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اُس کے
اس خیال سے بالکل متفق نہ ہوں گے۔ بانہوئیفر کا نظریہ ہے کہ مذہبی لوگوں کا یہ
عقیدہ کہ خدا تو ایک آخری چارہ کار ہے بالکل غلط ہے۔ "ہمیں خدا کے وجود
کا وہاں احساس ہونا چاہیئے جسے ہم جانتے ہیں۔ ناقابلِ حل مسائل میں نہیں بلکہ
ان میں جنہیں ہم پہلے سے حل کر چکے ہیں۔ اور ہمیں اپنی بے بسی کی حد تک
انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسے تو ہم اپنی زندگی کے عین مرکز میں نہ
صرف موت میں بلکہ زندگی میں۔ نہ صرف دکھوں میں بلکہ قوت و صحت میں،
نہ صرف گناہ میں بلکہ نیکی کے کاموں میں پا سکتے ہیں۔ اِس عقیدہ کی بنیاد مسیح
میں خدا کے مکاشفہ میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ مسیح خداوند زندگی کا مرکز ہے۔"
مسیحی معلمین اخلاق کے لئے یقیناً اس کا یہ مطلب ہوگا کہ موجودہ دَور کی سائنسی
ترقی کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ زندہ مسیح نے ہمارے لئے نئے مواقع
پیدا کئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے نئے تقاضے بھی پیش کئے ہیں کہ ہم
کس طرح اپنے آپ کو دوسروں کی بہبودی کے لئے پیش کریں۔

بانہوئیفر اس نظریہ پر کہ مسیح زندگی کا مرکز ہے، اس صدی کے عظیم یسوعی
سائنسدان تائی لارڈ دی شارداں سے متفق نظر آتا ہے۔ "تائی لارڈ دی شارداں
مسیح میں وُہ کائناتی مقصد جس کا سائنس ارتقا کے نتیجہ سے تقاضا کرتی ہے اور
ساتھ ہی خدا کی تدبیر کی تکمیل کو محسوس کرتا ہے" تاکہ زمانوں کے پورا ہونے کا

ایسا انتظام ہو کہ مسیح میں سب چیزوں کا مجموعہ ہو جائے"۔ (افسیوں ۱ : ۱۰) ۔
مسیح کا یہ مطلب ہے کہ " ارتقائی مراحل، مذہبی اور شخصی معاشرہ کی تکمیل میں مسیحیت کا جوہر جیسے معلمین اخلاقیات مسیحی اگاپے کا مطمع نظر کہتے ہیں، اس عقیدہ سے کہ اس دُنیا کا تجسّم کے ذریعہ سے خُدا میں اتحاد ہے، نہ تو کم اور نہ ہی زیادہ ہے۔ دورِ وکٹوریہ کے بعض مفکروں نے سوچا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ ارتقا کے مراحل میں بعد میں آتا ہے وہ لازماً اخلاقی لحاظ سے بہتر ہے۔ تائی لاردوی شاردان جو مسیح کو ارتقا کے عین مرکز میں تصوّر کرتا ہے، اگر تاریخی یسُوع کو قریب سے دیکھتا تو یقیناً وہ غلط آراء سے احتراز کرتا۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ ارتقا کا صحیح طریقہ خواہ سائنسی نقطۂ نگاہ سے ہو خواہ مسیحی ایمان کے زاویہ سے اس کا نصب العین " مسیح کے قد کے انداز تک پہنچنے میں ہے" وہ یسُوع جس کا ذکر ہم اناجیل میں پاتے ہیں، خاص ارتقائی مراحل کو اُن غلط راستوں سے جنہیں فطرت پسند سائنسدانوں نے کائنات کی گذشتہ ترقی میں دریافت کیا ہے، سے امتیاز کرنے میں کسوٹی کی حیثیت سے ہے۔

آج کل جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے بیماروں کو شفا ملتی ہے، بھوکوں کو کھانا ملتا ہے اور ذہنی انتشار کے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ جو یسوع کے کام تھے، تو ہم ارتقائی ترقی کی صحیح راہ کو معلوم کرتے ہیں۔ اگر یہ ایک حقیقت ہے تو اسطرح تو ہم اپنے زندہ مسیح کو اپنی فیکٹریوں اور لیبارٹریوں میں بھی کام کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جب ہم سائنسی دریافتوں میں حصّہ لیتے ہیں تو یہ



بھی ایک حقیقی مسیحی کے روائتی کاموں یا عبادت کی مانند ہیں۔ ہم ایٹمی بم کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ارتقا کا ایک غلط راستہ ہے بعینہٖ اُن مہیب رینگنے والے جانوروں کی طرح جو اپنے آپ کو نئے حالات کے تقاضوں کے تحت نہ ڈھال سکے۔ اور اس وجہ سے وہ ختم ہو کر رہ گئے۔ یہ کچھ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک دواساز لوگوں کی شفا کے لئے دوائیاں تیار کرنے کی بجائے اپنی مہارت کو زہر تیار کر کے لوگوں کو مارنے کے لئے استعمال کرے۔ لیکن وُہ یسوع جسے اناجیل بیان کرتی ہیں، اسے ہم پہلی صدی کے سائنسدان کی طرح تصوّر نہیں کر سکتے۔ ہاں البتہ ہر ایک وہ شئے جو ارتقائی مراحل میں رونما ہوئی ہے اس نے خدا کی تدبیر کو پورا نہیں کیا ہے تاہم دونوں عظیم جنگوں کے بعد کے تاثرات اور ایٹمی مصیبت کے اندیشہ میں ہم اُسے فراموش ہی کیوں نہ کر دیں۔ لیکن ایک ایسی دنیاوی ترقی بھی ہے جس کیلئے ہمارا فرض ہے کہ اس میں شریک ہوں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ اس میں مسیح کی حضوری ہے۔ اسی نظریہ کے تحت مشرق اور افریقہ میں ابتدائی مشنریوں کا یہ درست تصور تھا کہ ہسپتال اور کالج مسیحی خدمت کا ایک اہم جزو ہیں۔

ماہر اراضیات اور خدا شناس تائی لارودی شاردان نے کائنات یعنی روشنی، زندگی اور تمام دُنیا کی محبّت میں ساکرامنٹ کی طرح مسیح کی حضوری کو محسوس کیا۔ اِسی تصوّر کے پیشِ نظر اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر اُس نے لکھا " یہ دُنیا رفتہ رفتہ میری زندگی میں میرے چاروں طرف فروزاں ہو چکی ہے۔ اور یہ میرے باطن میں کُلّی طور پر منوّر ہو چکی ہے"۔ لیکن اِس طرح تو وُہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ مسیح خُداوند نہ صرف ساکرامنٹ کی روٹی میں بلکہ تمام کائنات میں خدُا کے جلال سے زندہ ہے۔
مسیح کی حضوری کی یہ پُراسرار رویا ہماری روحانی جدوجہد کو اور

وحدت بخش سکتی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ ہم مسیحیوں سے اِس حقیقت کا یہ تعلق ہے کہ ہر کہیں اور ہر جگہ دُنیا کے تعلقات میں ہم زندہ مسیح کے اخلاقی تقاضوں سے دو چار ہوں۔ موسیٰ کے لئے جلتی ہوئی جھاڑی نہ محض قدرت کا ایک عجیب و غریب منظر تھا اور نہ ہی اُس کے لئے خُدا کی زندہ حضوری کا مکاشفہ تھا بلکہ یہ اُس سے تقاضا کر رہی تھی کہ وُہ اپنی قوم کو مصر کی غلامی سے چھڑا لائے۔ ۱۹۱۲ء میں بحرِ منجمد جنوبی میں برفانی طوفان نہ محض ایک برا شگون تھا بلکہ اس کے وسیلہ سے مسیح خداوند ایک سادہ لوح سپاہی لارنس اوٹس کو اپنے دوستوں کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے تقاضا کر رہا تھا۔ اگر مسیح خداوند حقیقتاً اس مادی دُنیا میں موجود ہے تو ہم اِس کے تباہ کُن نتائج اور المناک واقعات کو اُس کا کام خیال نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وُہ بدی کو ہماری اخلاقی جدوجہد کے لئے چیلنج کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے بھوکے بچے، انسانی دوستی کی خاطر خودکشی کرنے والوں کو آخری بلاہٹ، بلند پہاڑوں کی چوٹیاں جو نوجوانوں کو دعوت دیتی ہیں کہ انہیں سر کریں اور صبح کا تازہ اخبار جس میں المناک واقعات اور مزاحیہ کالم مندرج ہیں اور ہماری ہمدردی اور دُعا کے خواہاں ہیں، اُن سب میں اور ان سب کے وسیلہ سے مسیح خداوند ہم سے کسی چیز کا تقاضا کر رہا ہے۔

## ۳- دُنیا کے دُکھوں میں مسیح کی حضوری

ہماری صنعتی اور سائنسی ترقی میں مسیح کی حضوری ہی سب کچھ نہیں، کیونکہ بانہوئیفر لکھتا ہے کہ ہم اِس دُنیا میں رہتے ہوئے خدا کے دکھوں



میں شریک ہیں.... کیونکہ وُہ اپنے آپ کو زندہ اِن کی زمین سے کاٹے جانے اور صلیبی موت تک رد ہونے دیتا ہے۔ خُدا اس دنیا میں اپنے آپ کو کمزور و بیکس بنا دیتا ہے۔ اور یہی ایک واحد راستہ ہے۔ جس میں وُہ ہمارے ساتھ رہ کر ہماری مدد کر سکتا ہے۔ وُہ مسیح کے وسیلہ سے اپنی مطلق العنان قوت سے نہیں بلکہ اس کی کمزوری اور دُکھ سے ہماری مدد کرتا ہے۔ پس انسان سے بھی اس بات کا تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ اِس بیدین دُنیا کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھا کر خُدا کے دکھوں میں شریک ہو۔ اور مسیحیوں کا یہ فرض ہے کہ خُدا کے رنج کے لمحات میں اس کا ساتھ دیں۔" تائی لاردی شاردان نے یہ محسوس کیا کہ کائنات کی زندگی میں نہ صرف ساکرامنٹ روٹی کا ظہور ہماری جسمانی مخلوق کے نذرانہ میں ہے۔ بلکہ ہمارا دکھ اٹھانا ساکرامنٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کافی حد تک پولُس کے مسیح کے دکھوں سے متعلق بیانات سے ہم آہنگ ہے۔ ہمیں ضرور مسیح کے دکھوں میں شریک ہونا ہے اور اُس کی موت سے مشابہت پیدا کرنا ہے (رومیوں ۱۵:۱۶)۔ اور خود پولُس نے محسوس کیا کہ وُہ "مسیح کی مصیبتوں کی کمی اس کے بدن یعنی کلیسیا کی خاطر اپنے جسم میں پوری کئے دیتا ہے۔ (کلسیوں ۱:۲۴)۔

یاد رہے کہ اس میں بہت سی باتیں مسیحی اخلاق کے دائرہ سے باہر ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ہماری انسانی فہم و ادراک سے بالا ہیں ہمارے روزمرہ تجربہ سے، یہ بالکل واضح ہے کہ دنیا کی زندگی میں پورے طور پر حصہ لینے کا عمل کئی صورتوں میں مسیحیوں کے لئے تکلیف دہ ہے اور ہم اپنے معاشرہ کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں واجبی کردار ادا کرنے سے بھی اس لئے تامل کرتے ہیں، کیونکہ ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ اگر وہ ایسا کریں تو صرف وہ

انہیں دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہمیں دکھ ہوگا۔ کیونکہ لوگ ہمارے مسیحی اصولوں کے لئے ہم پر ہنسیں گے۔ ہمیں اُس وقت بھی کوفت ہوگی جب ہم زندگی کے بہت سے گندے اور فحش حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں دلی رنج ہوگا۔ کیونکہ اکثر اوقات نیکی کے لئے ہماری کوششوں کی خاطر ہمیں پریشان کیا جائے گا۔ ہمیں اُس وقت تکلیف برداشت کرنی پڑے گی جب کئی قسم کے غلط فیصلوں اور کارروائیوں میں چارو ناچار شامل ہونا پڑے گا۔ میونسپل کمیٹی کا ایک مسیحی ممبر اپنے عہدہ سے اس وقت بھی استعفےٰ دینے سے معذور ہے۔ جب کہ اکثریت نے ایک غلط فیصلہ دے دیا ہے اور اس کو یقین ہے کہ اس فیصلہ میں مسیحی معیار کے مطابق کمی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگریزی راج میں ہندوستان کے بہت سے مشنریوں نے اپنے یورپی دوستوں اور ہندوستانی معاشرہ کی زندگی میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ بعض اوقات مسیحی کے لئے اس دُنیا میں شمُول ایسی صورتِ حال پیدا کردے گا جو اخلاقی لحاظ سے بالکل غیر واضح اور تکلیف دہ ہوگی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضرور بانہوئیفر کو بھی سخت ذہنی کوفت اٹھانی پڑی ہوگی جب اُس نے ہٹلر کے قتل کی سازش میں حصّہ لیا تھا اور اس کو اس شمول کے لئے موت کی سزا برداشت کرنی پڑی۔

اِس دُنیا کی زندگی میں شمول سے تکلیف کسی حد تک خود انکاری کی تکلیف ہے۔ کیونکہ ہم نے ایک گذشتہ باب میں دیکھا کہ خود انکاری کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں یہ احساس ہو جیسے کہ ہماری کچھ بھی اہمیت نہیں اور خاص کر کہ ہماری مذہبی سرگرمیاں جو صرف ہماری اپنی ذات سے وابستہ ہیں، اُن کی کوئی وقعت نہیں



یعنی اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے غرور اور عزتِ نفس کو بالکل نظر انداز کردیں۔ وُہ مسیحی جو اپنی خودی سے انکار کئے بغیر دنیا کی زندگی میں شریک ہوتا ہے وہ جلد ہی خود غرضی اور کم ظرف سازشوں میں جنہوں نے دنیا کی تصویر کو بدنما کر دیا ہے پھنس جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ احساس کہ ہم خُدا کی مرضی کو پُورا کر رہے ہیں۔ اور خوشی کی وہ روبا جو ہمارے سامنے ہے۔ اس فطری خودی کے مرنے کے دکھ کو آسانی سے دُور نہیں کریگا۔ خود ہمارے خداوند نے نہ صرف اپنی ابتدائی خدمت کی آزمائشوں سے بلکہ گتسمنی کی آخری تکلیف سے دکھ اٹھا اٹھا کر فرمانبرداری سیکھی۔ بعینہٖ ہم مسیحوں کو کبھی بھی یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ ہمیں زندگی کے ہر قدم پر سکھ ہی سکھ نصیب ہوگا۔ بلکہ دُکھ بھی برداشت کرنا پڑے گا۔

## ۶۔ مسیح کی ماورائیت

ہم جو کچھ اس باب میں پیش کر رہے ہیں اُسے ماہرینِ علم الٰہیات مسیح کے محیطِ کل کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی کہ اُس کی حضوری ایمانداروں کے دلوں اور اُس کے بدن یعنی کلیسیا میں ہے۔ شاید راسخ الاعتقاد مسیحی اس بات سے ٹھوکر کھائیں کہ ہم نے بانہوئیفر اور تائل ہارڈی شارڈال کے ہمخیال ہیں کہ مسیح یسُوع اِس دنیا میں جو اس کے وسیلہ سے قائم ہوئی ہے، اور جو ایمان کی آنکھوں سے ابھی تک اُس کی ہے، موجود ہے۔ گو حقیقتِ مادہ کے قائل شخص کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا برائی میں گر چکی ہے۔ تاہم اگر ہم اپنے آپ کو مسیح کے محیطِ کل ہونے تک قناعت کریں۔ تو بھی ہم ہربرٹ سپنسر اور مسئلہ ارتقا کے ناشائستہ استادوں کے انداز میں تصور کر

سکتے ہیں۔ کہ مسیحی نیکی اپنے آپ میں تواریخی ارتقا کے مراحل میں بڑھتی جائیگی۔ لیکن اس نظریہ سے مسیحی ایمان کی تعلیم کے دو بنیادی امور نظرانداز ہو جائینگے اولاً یہ کہ انسان کی فطری ترقی میں عہدِ جدید کا یسوع ع اتحاد نہیں کرتا بلکہ دوم گرے ہوئے انسان کا جسے نجات دہندہ کی ضرورت ہے، ساتھ دیتا ہے "وہ راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو توبہ کے لئے بلانے آیا ہے" (لوقا ۵ : ۲۱)۔

ہم باہوشیفر کے اس نظریہ کے ہم خیال ہیں کہ ہم ایسے سرگرم مبشروں کے حق میں نہیں ہیں۔ جن کا اولین یہ نصب العین ہوتا ہے کہ وہ عقلی دلائل سے انسان کو بالکل مایوس کر دیں۔ لیکن ہم اس کے اس خیال سے متفق نہیں کہ صرف معدودے چند اشخاص کو جن میں ذی فہم اور کچھ خستہ حال لوگ شامل ہیں یا ایسے لوگوں کو جو اپنے آپ کو بہت اہم خیال کرتے ہیں۔ اور جو صرف اپنی ذات سے وابستہ ہیں، نجات کی ضرورت ہے۔ مقدس۔ اوگسطین کے ان الفاظ میں کہ ہمارے دل اس وقت تک بے چین رہتے ہیں جب تک انہیں تجھ میں چین نصیب نہیں ہوتا" میں پوشیدہ حقیقت کا ہم سب پر طلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ آجکل بہت لوگوں کی بے چینی کی حالت میں کوئی ایسی آرزو نہیں کہ وہ مسیح میں آرام پائیں۔ تاہم مسیح یسوع کا یہی شیوہ ہے۔ کہ وہ طوفان زدگان مہاجروں اور دنیا کے کمینوں کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے "جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا؛ (متی ۲۵ : ۴۰) یہ مشابہت اتنی حقیقی ہے کہ پولس نے اس کا یوں بیان کیا کہ وہ ہمارے لئے گناہ بن گیا (۲- کرنتھیوں ۵ : ۲۱) اور اس نے خود صلیب پر دنیا والوں کی ایک دوامی پکار کہ وہ خدا کی حضوری کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں، چلا کر کہا "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" یہ انجیل کی ایک متناقضانہ حقیقت ہے کہ جہاں پر لوگ مسیح کی



حضوری کی کم توقع ہے، وہاں پر ہی اس کی زیادہ حضوری ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ مسیح خداوند انسانی نشوونما کے فطری طریق سے نہ آیا۔ جیسے کہ ایک مشہور گیت کی روایتی اور مسلمہ افسانوی زبانوں میں کہا گیا ہے۔

"وہ جو خدا اور سب کا خداوند ہے
آسمان سے زمین پر آ گیا ہے"

اس کی زمینی زندگی میں ایک فوق الفطرت عنصر تھا۔ جو اس کے معجزات، آسمانی آواز اور اس کے اختیار میں ظاہر تھا۔ جس سے لوگ ڈر گئے۔ مقدس یوحنا نے مسیح خداوند کے صلیب پر چڑھائے جانے" میں اس کے جلال کا ایک نشان اور عہد دیکھا۔ جیسے کہ ہم ابھی ابھی کہہ چکے ہیں کہ مسیح ہم لوگوں میں اپنے آپ کو گنہگار کی مشابہت سے پیش کرتا ہے لیکن ہمیں کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ "مسیح ہم میں" ایک مغموم اور شکستہ سی شخصیت ہے جسے دنیا کے گناہ اور بوجھ نے کچل رکھا ہے۔ بعینہٖ جیسے کہ بعض اوقات مسیح مصلوب کے مجسمہ میں دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ہم ان فنکاروں کے تصور کو سراہتے ہیں جو یسوع کو تصویر میں صلیب کے پیچھے پس منظر کے طور پر اس کی جلالی صورت میں پیش کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ وہ آسمان سے بڑے جلال کے ساتھ آتا ہے تاکہ گری ہوئی دنیا کی حالت کو تبدیل کر دے۔ کیونکہ اس کا وعدہ ہے" دیکھ میں سب چیزوں کو نیا بنا دیتا ہوں"۔ (مکاشفہ ۲۱ : ۵)

جب ڈیوک آف ایڈنبرا نے یہ سکیم شروع کی کہ وہ نوجوانوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات دے تو اس وقت اس نے اپنی مثال پیش کرتے ہوئے نوجوانوں کو انسانی مہم کے لئے ایک رویا پیش کی۔ بیشک یہ ایک غیر تسلی بخش تمثیل ہے۔ لیکن

پھر بھی اس میں اس کام کا نمونہ ضرور موجود ہے جو یسوع نے انسانی اخلاقیات کے لئے سرانجام دیا۔ وہ نیک زندگی کو بے کیف روایات اور قانونی ممانعتوں سے جو قدیم زمانہ میں فریسیوں نے اپنے مذہب میں اپنائیں اور جنہیں آج کل کے ماہرین عمرانیات مذہب سے علیحدگی میں محسوس کرتے ہیں۔ اور جو گوگال کے الفاظ کے مطابق نیکی میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے" ایک الگ معیار دینا چاہتا ہے۔ اور وہ اپنے لوگوں کو ایک ایسی مسیحی زندگی کی رویا دیتا ہے۔ جو اس موقع سے بھرپور ہیں۔ جن میں بلند حوصلگی اور برداشت کا تقاضا کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ محبت ہیں دوسرے کے لئے خود نئے نئے مواقع ڈھونڈتی ہے۔ اس ساری مہم میں مسیح خداوند ہم میں نہ صرف ایک زندہ جذبہ یا ارتقائی کوشش کی حیثیت سے جو انسان کو اس دنیا میں موجودہ اعلےٰ معراج تک لے آئی ہے۔ بلکہ وہ ہم میں حقیقی خدا سے حقیقی خدا کی صورت میں موجود ہے۔ اور ہمیں حکم دیتا ہے۔ کہ ہم اپنی انسانی مجبوریوں کو بالکل فراموش کر دیں۔ اور ہمیں آسمانی زندگی کی خوبصورتی جلال اور عزت میں شریک ہونے کے لئے مدعو کر رہا ہے لیکن وہ نہ صرف ہمیں اس نشان کی رویا دیتا ہے۔ جس کی طرح طرف ہمارا اخلاقی سفر جاری ہے بلکہ اس نے خود اس شاہراہ کو اختیار کیا جو صلیب کے راستہ سے ہو کر الٰہی جلال تک جاتی ہے۔ گو یہ ایک ناقابل فہم راہ ہے۔ تاہم یہ حقیقی ہے اور وہ اب بھی انفرادی طور پر ہر ایک شاگرد اور کلیسیا کے ساتھ اس شاہراہ پر گامزن ہے۔

"عزیزو! ہم اس وقت خدا کے فرزند ہیں۔ اور ابھی تک یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ہم کیا کچھ ہونگے۔ اتنا جانتے ہیں کہ جب وہ ظاہر ہوگا۔ تو ہم بھی اس کی مانند ہونگے کیونکہ اس کو ویسا ہی دیکھیں گے۔ جیسا وہ ہے اور جو کوئی اس سے یہ امید رکھتا ہے اپنے آپ کو ویسا ہی پاک کرتا ہے۔" (۱۔یوحنا ۳: ۲ - ۱۳)۔



# امدادی سوالات

## پہلا باب

### قانونِ قدرت

۱- قانونِ قدرت کی تعریف کیجئے اور بتایئے کہ اس کا ماخذ کونسا ہے؟

۲- قانونِ قدرت سے متعلق سیسرو کونسی چار باتیں پیش کرتا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ درست ہے۔ اور اگر نہیں تو اس کی وجہ بتایئے۔

۳ اگر تو قانونِ قدرت کا وجود ہے تو کیا معاشرہ کی رسومات ہمیشہ درست ہیں؟

۴ ثانوی قانونِ قدرت سے کیا مراد ہے؟

۵ اخلاقی راہنمائی کے لحاظ سے قانونِ قدرت کہاں تک قابلِ اعتماد ہے؟

## دوسرا باب (انسانی اور الٰہی قانون)

۱- (ا) "قانون محض ایک حکم ہے جو اپنی تعمیل کے لئے دھمکی استعمال کرتا ہے" کیوں کہ یہ خدا کی شریعت کے لئے ایک تسلی بخش تعریف نہیں ہے۔ یہ خدا کی شریعت کے کون سے دو اہم پہلوؤں سے خالی ہے۔

(ب) انجیل میں مسیحی قانونی ضابطہ کے لئے کیوں کوئی گنجائش نہیں ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کلیسیا کے پاس کوئی اصول نہیں ہونے چاہئیں؟

۲- چار مقامات کا ذکر کریں جہاں کہ ہم خدا کی شریعت کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔

۳- اس کا کیا مطلب ہے جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کی شریعت ایک شخصی حکم ہے۔

۴ پولس رسول کے نظریہ کے مطابق موسوی شریعت مسیحی ایمانداروں کے لئے کونسی تین باتیں پیش کرتی ہے؟

۵ سزا کے بارے میں بائبل کا کیا نظریہ ہے اور وہ خدا کی شریعت سے متعلق

ہمیں کیا سکھاتی ہے؟

## تیسرا باب (ضمیر اور روح القدس کی راہنمائی)

۱۔ ضمیر کے اخلاقی شریعت سے تعلقات کے متعلق مقدس تھوماس اکوئیناس کی کیا تعلیم ہے؟

۲۔ بائبل ہمیں ضمیر کے متعلق کیا سکھاتی ہے؟ کیا یہ مقدس تھوماس اکوئیناس کے نظریہ سے متفق ہے؟

۳۔ کیا اگر ہمارے تکلیف دہ احساسات ہوں تو اس کا ہمیشہ ہی مطلب ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ کیا ہے؟ ضمیر کی تکلیف کی طرف ہمیں کیوں توجہ دینی چاہیئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دیں؟

۴۔ روح القدس ہماری ضمیر کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے؟

## چوتھا باب (اسرائیل کی اخلاقی وراثت)

۱۔ تین وجوہات پیش کریں کہ کیوں ہمیں عہدِ عتیق کی اخلاقی تعلیم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے؟ اور اگر ہم نہ کریں تو اس کے کونسے تین نتائج پیدا ہوں گے۔ بنیز وہ کونسی اخلاقی تعلیم ہے جسے ہم آج کل اصولوں کے طور پر اپنانے کے لئے قبول نہیں کر سکتے۔

۲۔ عہدِ عتیق کی اخلاقیات میں خدا کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے؟ اور وہ تین پہلو بیان کریں۔ جن کا ہمارے موجودہ حالات سے تعلق ہے۔

۳۔ عہدِ عتیق کی اخلاقیات اسرائیلی معاشرہ کے لئے انسانی ذمہ داریوں پر کیا تعلیم دیتی ہے؟ ہم اس کا اپنے آپ، اور مسیحی کلیسیا پر کیسے اطلاق کر سکتے ہیں؟

۴۔ عہدِ عتیق کی اخلاقیات میں انصاف، رحم اور سچائی سے کیا مراد ہے؟ ہمیں



کیوں ان خصوصیات کا مظاہرہ کرنا چاہیئے؟

## پانچواں باب (مسیح کا نمونہ)

۱۔ کتابِ مقدس میں سے تین ایسے حوالے پیش کریں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں یسوع کے نمونہ پہ چلنا چاہیئے۔

۲۔ کیا ایسے طریقے بھی ہیں جن میں مسیح کے نمونہ پہ چلنا غلط یا ناممکن ہے؟

۳۔ ہمیں کس طرح مسیح کے تجسم اور موت کے نمونہ پر چلنا چاہیئے؟

۴۔ مسیح کی طرزِ زندگی میں سادگی، حقیقت اور لوگوں میں دلچسپی اور شخصی تعلق جیسی خوبیوں کیلئے مثالیں دیں نیز بتائیں کہ علاوہ ازیں ہمیں ایسی اور کونسی خوبیاں تھیں

۵۔ انجیلوں میں سے ایک ایسا واقعہ پیش کریں جس کا اس حصہ میں تو تذکرہ نہ ہو لیکن یہ تجویز کریں کہ ہم اس میں تصوراتی طور پر مسیح کے نمونہ پر چل سکتے ہیں۔

## چھٹا باب (مسیح کی شریعت)

۱۔ مسیح کی شریعت کے بارے میں پولس کی کیا تعلیم ہے؟

۲۔ تین ایسے پہلوؤں کا ذکر کریں جن میں مسیح کی شریعت دوسرے قوانین سے مختلف ہے۔

۳۔ کیا مسیح کی شریعت میں ایک یا بہت سے قوانین ہیں؟ کیا آپ ڈاکٹر ڈی کے اس نظریہ سے جو اس حصہ کے آخری پارہ میں بیان کیا گیا ہے متفق ہیں؟

۴۔ مسیح کی شریعت کے بارے میں دو مختلف نظریات بیان کریں کیا مسیحی کردار کے لیے ہمیں اسے سنجیدگی سے اپنے عملی راہنما کی حیثیت سے اپنانا چاہیئے۔

۵۔ پانچ ایسے پہلوؤں کا ذکر کریں جن میں مسیحی شریعت سے آزاد ہیں۔

۶۔ کلیسیائی نظم و ضبط اور مسیح کی شریعت کے آپس میں کیا تعلقات ہیں اور ایسے دو پہلوؤں کا ذکر کریں جن میں بہت زیادہ سخت کلیسیائی نظم و ضبط خطرناک ثابت ہو

سکتا ہے ۔ نیز کلیسیائی نظم و ضبط کا کیا نصب العین ہونا چاہئیے ۔

## ساتواں باب (مسیحی اور اس کی خواہشات)

۱ ۔ کیا آپ متفق ہیں کہ ہماری جبلتوں میں سے کچھ تو بنیادی طور پر اچھی اور کچھ ان میں سے بری ہیں ؟

۲ ۔ ضبطِ نفس کے بارے میں دو نظریات بیان کیجئے ۔ ان میں سے کونسا مسیحی نظریہ ہے ۔ ہماری قدرتی ضروریات کو پورا کرنے کے بارے میں دو مختلف نظریات بتائیے ۔ نیز یہ بھی بیان کریں کہ ان میں سے کون سے نظریہ میں زیادہ مسیحی رنگ جھلکتا ہے ؟

۳ ۔ جنسی خواہش کے متعلق بائبل کا کیا نظریہ ہے ؟ کلیسیا میں گذشتہ دور میں شادی شدہ حالت پر کنوارپن کو ترجیح دینے کے پانچ دلائل پیش کیجئے کیا آپ اس نظریہ سے متفق ہیں ؟

۴ ۔ جنسیات کے متعلق پانچ موجودہ غلط فہمیوں کا ذکر کیجئے ۔

۵ ۔ آج کل ہم جنسی مسائل کے بارے میں نوجوانوں کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں ؟

## آٹھواں باب (مسیحی اور اس کا کام)

۱ ۔ کام کے بارے میں بائبل مقدس کا کیا نظریہ ہے ؟

۲ ۔ کیا ایک مسیحی صرف ایک خادم الدین کی حیثیت سے ہی خدا کی خدمت کر سکتا ہے ؟ موجودہ پاکستان میں پانچ ایسے پیشوں کی فہرست تیار کریں ۔ جنہیں آپ کے خیال کے مطابق کسی مسیحی کو اختیار نہیں کرنا چاہیئے ۔

۳ ۔ (ا) ”ایک مسیحی کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بہ نسبت پیشہ کے اس کا طریقِ کار کیا ہے ؟“ کیا آپ اس سے متفق ہیں ؟ مثالوں سے اپنے جواب کو واضح کیجئے (ب) کیا ہڑتال میں ایک مسیحی کو حصہ لینے سے انکار کر دینا چاہیئے ؟

۴ ۔ کام اور عبادت میں کونسا زیادہ اہم ہے ؟ کیا یہ کہنا کہ ”کام کرنا دعا کرنا ہے“ درست



ہے ؟

۵ ۔ کیا کسی صورت میں بھی انسان کا کام تخلیقی ہے ؟

## نواں باب (مسیحی اور اس کے اوقاتِ فرصت)

۱ ۔ بائبلی ادوار میں اوقاتِ فرصت میں انسان کو سب سے زیادہ ضرورت کس چیز کی تھی ؟ کیا بعض اوقات یہ ضروریات موجودہ دور میں مختلف ہیں ؟

۲ ۔ اوقاتِ فرصت کے دو خطرات کا ذکر کریں ۔

۳ ۔ اوقاتِ فرصت کے استعمال کے تین بڑے طریقوں کو بیان کریں ۔

۴ ۔ عہد عتیق میں سبت کی پابندی کے لئے تین وجوہات پیش کریں ۔ سبت کے بارے میں مسیح خداوند کا کیا نظریہ تھا ؟

۵ ۔ یہ ثابت کرنے کیلئے تین دلائل پیش کریں کہ ہفتہ کی بجائے مسیحیوں نے اتوار کے دن کو کیوں منانا شروع کیا ۔ آرام اور عبادت پر زور دینے میں مسیحی اتوار کا کیا فرق ہے ؟

۶ ۔ اتوار کی پابندی کے تین اصولوں کا بیان کریں اور اپنے بیان کو مثالوں سے واضح کیجئے کیا پاکستان کیسے وہ موزوں ہیں ؟ کیا ایک مسیحی ملک کو سبت کی پابندی کے متعلق قوانین بنانے چاہیئیں ؟

## دسواں باب (مسیحی اور اس کی دولت)

۱ ۔ دولت کے متعلق عہدِ عتیق کی عموماً کیا تعلیم تھی ؟ دولت کے کونسے دو بڑے خدشات تھے ؟

۲ ۔ مسیح خداوند نے دولت کے کون سے بدترین خطرہ کے خلاف تعلیم دی ۔ دولت کے فریب سے اس کا کیا مطلب تھا ؟ دولت کے سلسلہ میں خود انکاری سے کیا مراد ہے ؟

۳ ۔ جوئے بازی کیوں غلط ہے ؟ جوئے بازی کی حمایت میں چند موجودہ دلائل بیان کیجئے اور ان کے لئے جواب بھی پیش کریں ۔

۴ ۔کیا کفایت شعاری بذاتہ ایک مسیحی خوبی ہے؟ کفایت شعاری پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے کونسے خطرات ہیں؟ مختاری سے کیا مراد ہے؟ کیا خداوند کے کام کے لئے باقاعدگی سے اور تنظیم کے تحت دسواں حصہ دینا ہی کافی ہے یا ہمیں اس سے زیادہ دینے کی ضرورت ہے؟

۵ ۔ اشتمالیت کے لئے کونسا مسیحی نظریہ ہونا چاہیئے؟

## گیارہواں باب (مسیحی اور حیاتِ انسانی)

۱ ۔حیاتِ انسانی کے متعلق بائبل کی کیا تعلیم ہے؟

۲ ۔کسی کی جان لینے کے خلاف چار مسیحی دلائل بیان کریں۔

۳ ۔ سزائے موت کے خلاف ڈاکٹر ٹیلی کی کونسی دلائل ہیں؟ کیا آپ اس نظریہ کہ ہر ایک مہذب ملک اور پاکستان میں بھی سزائے موت کو موقوف کر دیا جائے، سے متفق ہیں؟

۴ ۔خودکشی اخلاقی طور پر کیوں غلط ہے؟

۵ ۔کیا بے ایذا موت جائز ہے؟

۶ ۔ اسقاطِ حمل کس حالت میں جائز ہے؟

۷ ۔ مسیحیوں کا جانوروں سے کیسا سلوک ہونا چاہیئے؟

## بارہواں باب (مسیحی اور اس کا خاندان)

۱ ۔(۱) تین ایسے پہلو بیان کیجئے جن میں شادی کا معاہدہ دوسرے معاہدوں سے مختلف ہے دوسری قسم کی شادیوں سے مسیحی شادی کیسے مختلف ہے؟ (ب) کیا یہ کہنا کہ شادی ایک ساکرامنٹ ہے چنانچہ یہ ناقابلِ تنسیخ ہے درست ہے؟

۲ ۔طلاق کے بارے میں ہمارے خداوند کی کیا تعلیم تھی؟ ایک مطلقہ کی دوبارہ شادی کے لئے ایک پاسبان کا کیا رویّہ ہونا چاہیئے؟

۳ ۔ ایک مسیحی بیوی اور شوہر کے کیسے تعلقات ہونے چاہییں؟

۴ ۔کیا خاندانی منصوبہ بندی پر ہر ایک مسیحی کیلئے عمل کرنا درست ہے؟



۵ ۔ ایک مسیحی گھر میں مسیحی کے ضبط اور ہدایات سے کیا مراد ہے؟

۶ ۔خاندانی زندگی کے کیا خطرات ہیں؟

## تیرہواں باب (مسیحی اور اس کا معاشرہ)

۱ ۔ کیا کلیسیا ایک قوم یا کہ ایک بقیہ ہے؟ کیا پاکستان میں کلیسیا سے مسیحی معاشرہ مراد ہے یا کہ صرف اس کا ایک حصہ ہے؟

۲ ۔ کیا ایک مسیحی ہم وطن یا دوسرے بنی نوع انسان کی نسبت اپنے مسیحی بھائیوں کے لئے زیادہ فرائض ہیں؟ اگر ہیں تو کون سے ہیں؟

۳ ۔کہاں تک کلیسیا کو دنیا سے علیحدہ رہنا ہے اور کہاں تک اسے اس دنیا میں رہنا ہے؟ ایک مسیحی کے دنیا میں "شمول" سے بالخصوص کیا مطلب ہے؟

۴ ۔ وہ کونسے طریقے ہیں جن سے کلیسیا خاندان سے اور خاندان کلیسیا سے سیکھ سکتی ہے؟

## چودہواں باب (مسیحی اور ریاست)

۱ ۔مسیح یسوع نے کیوں اس بات سے کہ انکار کر دیا کہ خدا کی بادشاہی ایک دنیاوی ریاست ہے؟

۲ ۔ کن معنوں میں ریاست موجودہ برائی کے نظام کا ایک حصہ ہے؟

۳ ۔ مقدس پولس ریاست کے کونسے مفید کاموں کے متعلق سکھاتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک مسیحی کو ضرور اپنے ملک کی منتظم حکومت کی ہمیشہ تابعداری کرنی چاہیئے؟

۴ ۔ مکاشفہ کی کتاب ہمیں ایک ایسی حکومت کے بارے میں جو صریحاً اپنے خداداد اختیارات سے تجاوز کرتی ہے کیا سکھاتی ہے؟

۵ ۔"جو قیصر کا ہے قیصر کو دو" سے مسیح خداوند کا کیا مطلب تھا؟

۶ ۔آپ کی رائے میں ملک پاکستان سے مسیحی رعایا کے کیسے تعلقات ہونے چاہیئں؟

## پندرہواں باب (مسیحی اور تمام بنی نوع انسان)

۱۔ کیا ایک مسیحی کے لئے حب الوطن ہونا درست ہے؟ عہد عتیق میں حب الوطنی سے متعلق کون سے تین خطرات بیان کئے گئے ہیں؟ جنوبی افریقہ کے مسئلہ اپر تھیت پر تین اعتراضات کا ذکر کیجئے۔ کیا ایک مسیحی کسی اسلامی مملکت میں حب الوطن ہو سکتا ہے؟

۲۔ مختلف قوموں کے لوگوں کے لئے مسیحی نظریہ کیا ہے؟ کیا ایک مسیحی کو کسی دوسری نسل کے کسی فرد سے شادی کے لئے تیار رہنا چاہیئے؟

۳۔ کیا دنیا میں جنگ کا ہونا لازمی ہے؟ لڑائی اور جنگ کا کیا سدّباب ہے اور ایک مسیحی اس کے لئے کیا کر سکتا ہے؟

۴۔ ایک "جائز جنگ" کی کیا تعریف ہے، کیا جائز جنگ آج کل بھی ممکن ہے؟ ایک مسیحی آج کل امن کے لئے کیسے کام کر سکتا ہے؟

۵۔ مذہب امن پسندی کی حمایت اور مخالفت میں دلائل کا خلاصہ بیان کیجئے۔ اس کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

## سولھواں باب (خود انکاری)

۱۔ عہد جدید میں مسیحی نیکی کے کو نسے دو پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے؟

۲۔ کیا خود پرستی کو مسیحیت میں کوئی مقام حاصل ہے؟ ایک مسیحی کے لئے اوّلیتوں کی کیا ترتیب ہے؟

۳۔ ایک مسیحی کے لئے خود انکاری سے کیا مراد ہے اور ہمیں کیوں اسے اپنانا چاہیئے؟

۴۔ "ہماری ذات کے لئے فروتنی ایک حقیقت ہے" کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ دو ایسے طریقے بیان کیجئے جن سے ایک مسیحی فروتنی سیکھ سکتا ہے؟

۵۔ ایک مسیحی کے لئے فرمانبرداری کیوں ضروری ہے؟



۶۔ خود فراموشی سے کیا مراد ہے؟ نیز یہ کیوں مشکل ہے؟

۷۔ "اپنی صلیب اٹھانے" اور "مسیح کے ساتھ مصلوب ہونے" سے کیا مراد ہے؟

## سترھواں باب (محبت)

۱۔ محبت کے لئے پانچ یونانی الفاظ کے معنی مختصراً بیان کریں۔ مسیحی محبت کے لئے کونسا لفظ استعمال کیا گیا ہے؟

۲۔ ہم خدا سے محبت کرنا کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ ایراس اور اگاپے میں کیا فرق ہے۔ اگاپے کس طرح اپنے محبوب میں اچھی خوبیاں پیدا کر سکتی ہے؟ نیز یہ بھی بیان کریں کہ مسیحی معافی کیا ہے؟

۳۔ کیا ہم پسندیدگی کے بغیر لوگوں سے محبت کر سکتے ہیں؟ کیا مسیحی محبت محض ایک جذبہ ہے یا اس سے کچھ بڑھ کر ہے؟

۴۔ خدا کی محبت یعنی اگاپے ہماری دوسری محبتوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟

## اٹھارہواں باب (مسیح میں قائم رہنا)

۱۔ خدا کے فضل سے کیا مراد ہے؟ کیا اخلاقی نیکی ایک قدرتی ارتقا ہے؟ یا کیا ہمیں ہمیشہ نیکی کے لئے کوشش کرتے رہنا چاہیئے؟

۲۔ آج کل دنیا میں مسیح کی کس طرح حضوری ہے؟ تائی لارڈ شاردان اور بانہو یفر کے نظریات کا مختصر بیان کریں۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ مسیح زندگی کا مرکز ہے؟

۳۔ کیا آپ بانہو یفر کے اس نظریہ کہ ہمیں اس دنیا میں بستے ہوئے خدا کے دکھوں میں شریک ہونا چاہیئے، سے متفق ہیں، نیز یہ بھی بیان کریں کہ اس سے اس کا کیا مطلب ہے؟

۴۔ مسیحی ایمان کی دو بنیادی تعلیمات کونسی ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسیحی نیکی بذات خود بڑھتی جائے گی؟ مسیحی زندگی کن معنوں میں ایک مہم ہے اور اس میں کون ہمارے ساتھ شریک ہے۔

# فرہنگ

**اجتناب:۔** گریز کرنا

**ادراک:۔** ذہن کی وہ قوت جس سے انسان نتیجہ اخذ کرتا اور نیک و بد میں تمیز کرتا ہے

**انسدادِ جبلّت:۔** جبلت کو روکنا

**اشتمالیت:۔** ایک طریقہ جس سے معاشرہ کی اصلاح کرنے کے لئے جائیداد برابر تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی بجائے اجتماعی طور پر کوئی کام کرنا۔

**اولیّت:۔** اوّل۔ فوقیّت

**جبلّت:۔** سرشت، اصلی طبیعت

**جبلّی:۔** پیدائشی۔ طبعی

**دینِ انسانی کا پیرو:۔** وہ عالم جس کا تعلق انسانی فطرت اور انسانی مفادات سے ہو۔

**سوفسطائیت:۔** علم اخلاقیات کی وہ شاخ جس سے ہم مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا مخصوص حالات پر اطلاق کرتا ہے

**شمول:۔** شامل ہونا

**علم غالبیت:۔** وہ عقیدہ جو اس حق میں ہے کہ کوئی علم بھی یقینی نہیں ہے۔

**کنایتہً:۔** اشارۃً۔ ضمناً

**متناقضانہ:۔** دو حقیقتیں جو ایک دوسری کے متضاد نظر آتی ہیں۔ تاہم دونوں میں سچائی کے پہلو موجود ہیں۔

**محرّک:۔** ابھارنے والا۔ تحریک دینے والا

**ماہرِ تحلیل نفسی:۔** وہ شخص جو انسانی ذہن کی خرابیوں کا تجزیہ کرتا ہے۔

**معقولیت:۔** جو عقلی طور پر ثابت ہو۔

**لاشعور:۔** ذہن کا وہ حصّہ جس میں کام کے انتخاب کا انسان کو احساس نہ ہو۔



**یسوعی فرقہ:۔** وہ فرقہ جو ۱۵۳۴ء میں اغناطیوس کیولا نے رومن کاتھولک نظام کے مطابق شروع کیا۔

# اغلاط نامہ

| صفحہ | سطر | غلط الفاظ | صحیح الفاظ |
|---|---|---|---|
| ۶۴ | ۲۲ | ضوممعنی | ذومعنی |
| ۱۲۱ | ۱۶ | پینکوست | پنتکوست |
| ۱۳۹ | ۲ | چاہئے | چاہیئے |
| ۱۴۸ | ۲۱ | فوتِ فیصلہ | قوتِ فیصلہ |
| ۱۵۵ | ۲۱ | اُن اُن | اُن |
| ۱۶۰ | ۹ | کا یہ | کا |
| ۱۶۳ | ۱۳ | کوئی یہودی | یہودی |
| ۱۷۰ | ۱۴ | پیبدل | بیدل |
| ۲۰۱ | ۷ | س | اُس |
| ۲۰۱ | ۱۶ | رُست | درست |
| ۲۱۲ | ۱۰ | پیس ماند | پس ماندہ |
| ۲۱۶ | ۱۲ | شای | شادی |
| ۲۲۴ | ۹ | بچلے | بچانے |